MAY 2011

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

مستقل سلسلے

مئی 2011

جلد 25 شمارہ 9

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: ۹۱-بی، بی ایچ ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسان دُنیا میں آتا ہے اور ایک مقررہ مدت دُنیا میں گزار کر چلا جاتا ہے۔

موت زندگی کی ایسی حقیقت جس سے نہ فرار حاصل کیا جا سکتا ہے نہ انکار ممکن ہے لیکن وہ لوگ جن کی شخصیت سے کئی زندگیوں کے چراغ جلتے ہیں ان کی زندگی ان سالوں پر محیط نہیں ہوتی جب تک وہ دُنیا میں سانس لیتے ہیں بلکہ اس کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ان کے روشن کیے چراغ روشنی پھیلاتے رہیں۔

ان کے کیے اچھے کام انہیں زندہ رکھتے ہیں۔ اور بہت سارے دل ان کے لیے دُعاگو رہتے ہیں۔

محمود ریاض صاحب ایسی ہی شخصیت تھے۔

آج بھی بے شمار لوگ جنہوں نے انہیں نہیں دیکھا، کبھی ان سے نہیں ملے، ان سے عزت و احترام کا تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں دُعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ اپنی نوعیت کا واحد پرچا تھا جس کا اجرا کرتے ہوئے ریاض صاحب کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ خواتین کے اخلاق و کردار کی تعمیر اور انہیں باہر کی دُنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنا۔ صحیح سمت میں ان کی رہنمائی۔ ایک صاف ستھرا پرچا جسے گھر کے ہر فرد کے سامنے پڑھا جا سکے۔

خواتین ڈائجسٹ کے بعد کرن اور پھر شعاع۔ ریاض صاحب اسی مقصد پر عمل پیرا رہے اور ان کے جانے کے بعد ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تینوں پرچے اسی مقصد کو سامنے رکھ کر ترتیب دیے جاتے ہیں۔

ایک ایسا انسان جس نے زندگی میں کڑی مشقت جھیلی ہو بہت سی ذمہ داریاں اٹھائی ہوں بہت کٹھن حالات کا سامنا کیا ہو۔ عموماً اس کے مزاج میں تلخی آ جاتی ہے لیکن ریاض صاحب نے اپنے دُکھوں کو خود تک محدود رکھا، ان کے مزاج کی شگفتگی اور حس مزاح ایسی تھی کہ جو ایک بار مل لیتا ان کا اسیر ہو جاتا۔

اپنے دوست احباب کے ساتھ ساتھ ادارہ خواتین ڈائجسٹ میں کام کرنے والے ہر فرد کے ساتھ ان کا رویہ اتنا اپنائیت بھرا اور مشفقانہ تھا کہ سب اپنے ذاتی مسائل بلا تکلف ان سے بیان کرتے اور وہ انہیں حل کرنے میں پوری دلچسپی لیتے۔

آج اُن کی وفات کو دس سال گزر چکے ہیں لیکن ان کی یادیں آج بھی اسی طرح مہک رہی ہیں۔

10 مئی کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- پہلی نظر کا انعام - آسیہ رزاقی کا مکمل ناول،
- دسترس میں ستارے - مریم عزیز کا مکمل ناول،
- دل کے رستے دشوار بہت تھے - سلویٰ علی بٹ کا مکمل ناول،
- سائرہ عارف کا ناولٹ - میری صبح کا ستارہ،
- ہما انور، ہما قریشی، مریم فردوس، عتیقہ محمد بیگ اور فیضیہ عامر کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- بیٹھ کر سر دو جہاں کرنا - بانو قدسیہ کے ناول حاصل گھاٹ پر تبصرہ،
- معروف مصنفہ قرۃ العین جہاں کی شادی کا احوال،
- ایف ایم 100 کے ڈی جے سرمد خان سے ملاقات،
- [illegible] سومرو کی یادیں باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں - احادیث کا سلسلہ،
- پیام محمود ریاض،
- شاعری سچ بولتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

دل کی روشن ہے ہر گلی سائیں
ذکر تیرا ہے روشنی سائیں

رنگ دیکھا ہے تیری قدرت کا
آنکھ جب بھی مری کھلی سائیں

فیض پاتی ہے حسن سے تیرے
موسم گل میں ہر کلی سائیں

تُو نے بخشی ہے تیرگی تُو نے
چاند کو دی ہے چاندنی سائیں

تیرے دم سے ہے معتبر دُنیا
تیرے دم سے ہے دلکشی سائیں

میں تیری حمد کے کہاں لائق
تُو نے توفیق مجھ کو دی سائیں

حکیم خان حکیم

نعت رسول مقبول

تمہارے در تک جو آ گئے وہ
مقامِ آدمیت پا گئے وہ

جگر کا خون دے کر سرزمیں کو
چمن توحید کا مہکا گئے وہ

بھٹکتے پھر رہے تھے ہم جہاں میں
رہِ منزل ہمیں دِکھلا گئے وہ

چلے جو آپؐ کے نقشِ قدم پر
شعورِ بندگی سب پا گئے وہ

بسی ہے یاد جن میں مصطفیٰؐ کی
حیاتِ جاوداں دل پا گئے وہ

چمکتے ہیں سبھی بن کر وہ موتی
سرِ مژگاں جو آنسو آ گئے وہ

حکیم خان حکیم

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

وصیت سے متعلق احکام و مسائل

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی؟

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ترکے میں) نہ کوئی دینار چھوڑا نہ درہم' نہ کوئی بکری' نہ اونٹ اور نہ آپ نے کسی چیز کے بارے میں وصیت کی۔"

فوائد و مسائل : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں یہ فرمایا تھا" میرے وارث' دینار اور درہم تقسیم نہیں کریں گے۔ میری بیویوں کے خرچ اور عامل کے اخراجات کے بعد جو بچے وہ صدقہ ہے۔"

حضرت طلحہ بن مصرف رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے کہا۔
"کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے بارے میں وصیت فرمائی تھی؟"
انہوں نے فرمایا۔ "نہیں۔"
میں نے کہا۔
"تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو وصیت کا حکم کیسے دیا؟"
انہوں نے فرمایا۔ "آپ نے اللہ کی کتاب (پر عمل کرنے) کی وصیت کی تھی۔"

وصیت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا" جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانس اٹک رہا تھا' اس وقت آپ نے سب سے زیادہ یہ وصیت کی۔
"نماز اور تمہارے مملوک۔"

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری کلام یہ تھا" نماز اور تمہارے مملوک۔"

فوائد و مسائل: اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت نماز کی ہے' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی نماز کی تاکید فرمائی۔

غلاموں کا طبقہ معاشرے کا ایک مظلوم طبقہ تھا جسے اسلام نے اتنی عزت دی کہ غلام بڑے بڑے عہدوں تک پہنچے۔ خاندانِ غلاماں کی بادشاہت برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے آخری الفاظ یہ تھے۔ اللھم الرفیق الاعلیٰ "اے اللہ! بلند مرتبہ ساتھیوں سے ملا دے۔"

جس طرح ہم خاندانی معاملات کے بارے میں وصیت کرتے ہیں اسی طرح دین کے احکام پر عمل

کرنے کی بھی وصیت کرنی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت دین اور دنیا دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام میں دونوں کو برابر اہمیت حاصل ہے۔

وصیت کی ترغیب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مسلمان کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے بارے میں لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔"

فوائد و مسائل : وصیت ایسی چیز ہے کہ اس کا فائدہ اور ثواب مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے' جب وصیت پر عمل کیا جاتا ہے۔

انسان کو اپنی موت کے وقت کا علم نہیں' ممکن ہے بندے کو اس حال میں موت آجائے کہ اسے وصیت کرنے کا موقع نہ ملے' اس لیے بہتر ہے کہ وصیت ہر وقت تیار رکھی جائے۔

پہلے سے وصیت لکھ رکھنے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان اس میں حسب خواہش تبدیلی کر سکتا ہے۔

قرض اور امانت وغیرہ کی تفصیل ہمیشہ لکھ کر رکھنی چاہیے۔

وصیت

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص وصیت کر کے فوت ہوا' وہ سیدھی راہ پر اور سنت طریقے پر (عمل کرتا ہوا) فوت ہوا۔ وہ تقویٰ اور شہادت کی موت مرا اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش ہو چکی تھی۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس مسلمان کے پاس کوئی قابل وصیت چیز ہو' اسے یہ حق نہیں کہ دو راتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔"

وصیت میں ناانصافی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص اپنے وارث کو ترکہ دینے سے بھاگے گا (ایسی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے یا اس کے اصل حصے سے کم ملے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرما دے گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے' پھر جب (مرتے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں ناانصافی کرتا ہے' اس طرح اس کا انجام برے کام پر ہوتا ہے' چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک آدمی ستر سال تک برے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے' پھر (مرتے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اس طرح اس کا انجام نیک کام پر ہوتا ہے' چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔"

بخشش

حضرت معاویہ بن قرۃ اپنے والد (حضرت قرۃ بن ایاس بن ہلال مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی اور اس کی وصیت اللہ کی کتاب کے مطابق تھی' اس کا یہ عمل اس کی زندگی میں ترک شدہ زکوٰۃ کا کفارہ بن جائے گا۔"

زندگی میں بخل اور مرتے وقت فضول خرچی کی ممانعت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔
"اللہ کے رسولؐ! مجھے بتایئے کہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں! قسم ہے رب کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ تیری ماں تیرے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔"
اس نے کہا۔ پھر کون؟
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تیرا باپ۔"
اس نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے میرے مال کے بارے میں بتایئے کہ میں اس میں سے کس طرح صدقہ کروں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ہاں! قسم ہے اللہ کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ (وہ اس طرح ہے کہ) تو اس وقت صدقہ کرے جب تو تندرست ہو اور مال سے محبت رکھتا ہو' تجھے زندہ رہنے کی امید ہو اور فقر کا اندیشہ ہو۔ (یہ صدقہ کا صحیح وقت ہے) اور مؤخر نہ کرنا حتیٰ کہ جب تیری جان یہاں (حلق تک) پہنچ جائے' پھر تو کہے۔ میرا مال فلاں کو دے دینا' میرا مال فلاں کو بھی دے دینا۔ وہ تو ان ہی کا ہو چکا' اگرچہ تجھے یہ (حقیقت) ناگوار محسوس ہو۔"
فوائد و مسائل : اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے۔
جواب دینے سے پہلے تمہید کے طور پر کوئی بات کہنے سے سائل جواب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے' جیسے آپ کا یہ فرمانا "میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔"
قسم صرف اللہ کی ذات کی کھانا جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے' پس جو شخص قسم کھائے' وہ اللہ کی قسم کھائے' یا خاموش رہے۔"
حسن سلوک میں ماں کا حق زیادہ ہے کیونکہ وہ باپ کی نسبت زیادہ نرم دل اور زیادہ حساس ہوتی ہے' تاہم اگر ماں کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً" ممنوع یا مکروہ ہو اور باپ اس غلط کام سے منع کرے تو باپ کا حکم ماننا ضروری ہے اور یہ ماں سے حسن سلوک کے منافی نہیں۔
صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے کیونکہ اس وقت دل میں مال کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسے خرچ کرنا اس لیے بھی مشکل محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں حالات خراب ہونے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ موت کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ اب میں اسے استعمال تو نہیں کر سکوں گا' لہٰذا صدقہ کر کے فائدہ حاصل کر لوں۔ اس وقت دل میں مال کی محبت نہیں رہتی۔
زندگی کے آخری ایام میں صدقہ کرنا یا وصیت کرنا شرعاً" درست ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صدقے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

صدقہ کا وقت

حضرت بسر بن جحاش قرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلی پر لعاب مبارک ڈالا' پھر اپنی سبابہ انگلی (اس کی طرف اشارے کے طور پر) رکھی اور فرمایا۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "آدم کے بیٹے! تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے' حالانکہ میں نے تجھے اس جیسی چیز سے پیدا فرمایا' پھر جب تیری جان یہاں پہنچ جاتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حلق کی طرف اشارہ فرمایا۔ "تب تو کہتا ہے میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب صدقے کا وقت کہاں ہے؟"
فوائد و مسائل : اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے' وہ ہر لحاظ سے بندے پر قدرت رکھتا ہے جب کہ بندہ ہر لحاظ سے اس کا محتاج ہے۔
یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انسان کو ایک ناقابل ذکر حقیر چیز سے پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات بنا دیا۔
بعض مقامات پر صراحت کے بجائے کنائے کے الفاظ بولنا بہتر ہوتا ہے۔

تہائی ترکے کی وصیت

حضرت عامر بن سعد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے والد (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کیا' انہوں نے فرمایا "فتح مکہ کے سال میں بیمار ہو گیا حتیٰ کہ موت کے کنارے پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسولؐ! میرا مال بہت زیادہ ہے اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔"
میں نے کہا "آدھا؟"
فرمایا "نہیں۔"
میں نے کہا۔ "تہائی؟"
فرمایا "تہائی (جائز ہے) اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا انہیں مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔"
فوائد و مسائل : بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بہت بڑا نیک عمل ہے۔
جب انسان محسوس کرے کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو اس وقت اسے ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ صدقے کی وصیت نہیں کرنی چاہیے۔
اگر کوئی شخص تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے تو اس کی وصیت پر صرف تہائی ترکے تک عمل کیا جائے گا۔
بہتر یہ ہے کہ تہائی مال سے کم وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی اجازت دینے کے باوجود اسے "زیادہ" فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے۔

دو چیزیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "اے آدم کے بیٹے! دو چیزیں (میں نے تجھے دی ہیں) ان میں سے ایک بھی تیرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ میں نے تیرے مال میں اس وقت تیرا حصہ مقرر کر دیا جب میں تیری سانس بند کرتا ہوں۔ (یہ اس لیے) تاکہ تجھے پاک صاف کر دوں اور (دوسری چیز) تیری زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد میرے بندوں کا تجھ پر نماز جنازہ ادا کرنا۔"

وارث جائز حق دار

حضرت ابو امامہ (صدی بن عجلان) باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا۔
"اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے' لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"
حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے (منہ کے) نیچے کھڑا تھا جبکہ مجھ پر اس کا لعاب گر رہا تھا۔ (اس وقت) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا۔
"اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے' لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"

وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے'

انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت پڑھتے ہو۔ "اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت کرے یا قرض کے بعد۔" (النساء: ۱۱) اور سگے بھائی، ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے، سوتیلے بھائی نہیں۔

فوائد و مسائل : قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ وصیت اگر تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے، زائد نہیں۔

میت کے مال میں سے سب سے پہلے کفن دفن پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر قرض ادا کیا جاتا ہے، پھر جو کچھ بچے اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو وہ پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے پھر قرض ادا کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دونوں چیزیں واجب ہیں، ان میں سے جو چیز پائی جائے وہ ادا کی جائے۔ اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر کے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے گو اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہی کیا جائے گا۔

میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن بھائیوں پر مقدم ہیں۔

جو شخص وصیت کیے بغیر فوت ہو جائے کیا اس کی طرف سے صدقہ کیا جا سکتا ہے؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

"میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا مجھے بھی ثواب ملے گا؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں۔"

فوائد و مسائل : انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا ثواب پہنچتا رہتا ہے جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے، اسی طرح اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے جو والدین کی وفات کے بعد اولاد ان کی طرف سے کرے۔

فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔

آج کل ایصالِ ثواب کے نام سے جو محفلیں برپا کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں ان کی حیثیت محض ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کسی مستحق کی مناسب امداد کر دی جائے۔

قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی میں جس طرح زندگی میں نیابت ممکن ہے، اسی طرح وفات کے بعد بھی کسی کا قرض دوسرا آدمی ادا کر دے تو فوت شدہ شخص بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

بیادِ محمود ریاض

وہ محفلِ شبانہ بدستور ہے مگر
طاہر وہ ہم جلیس ہمارے کدھر گئے

وہ کہ اک روشن چراغ

مہوش افتخار

زندگی کیا ہے؟ اک جہد مسلسل!
اور موت؟
کوشش کے اس سفر کا اچانک اختتام!

ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ پھر جب دنیا میں آنے والا ہر انسان ایک ہی راہ اور ایک ہی منزل کا مسافر ٹھہرا تو مقام انفرادیت کہاں؟ آخر وہ ایسی کون سی چیز ہے جو آپ کے اس سفر کو دوسروں سے الگ اور خود آپ کی ذات کو سب سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ یوں کہ لحد میں اتر جانے کے بعد بھی نا صرف آپ کو اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے بلکہ آپ کی کمی بھی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

"اعمال!" یہ انسان کے اعمال ہوتے ہیں جو اسے انفرادیت کے رنگوں سے آراستہ کرکے اس کی ذات کو دوام عطا کرتے ہیں اور عزت کے اس مقام تک اللہ تعالیٰ اپنے ان ہی بندوں کو پہنچاتا ہے جو اس کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ جنہوں نے زندگی کو کچھ ایسے باوقار انداز میں گزارا ہوتا ہے کہ ان کے جانے پر خود زندگی آنکھوں میں رشک بھری نمی لیے پوچھتی ہے "یہ کون گزر گیا یارو" ایسی شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ سو ان کے جانے سے جو اک خلا رہ جاتا ہے اسے پُر کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

محمود ریاض صاحب کا شمار بھی ایسی ہی نادر شخصیات میں ہوتا ہے۔ جو جب تک زندہ تھے، اک ایسے شجر سایہ دار کی مانند تھے جس کی ٹھنڈک بھری چھاؤں اپنے پرائے سب کے لیے یکساں طور پر باعث راحت و اطمینان تھی اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تب بھی اپنے حصے کے چراغ کچھ اس نیک نیتی سے روشن کر گئے کہ وہ آج بھی ایک جہاں میں اجالا کر رہے ہیں۔

اپنی ذات اور اس سے منسوب رشتوں کے لیے تو دنیا میں آنے والا ہر انسان تگ و دو کرتا ہے۔ لیکن خلق خدا کی بھلائی کے لیے قدم اٹھانے والے عزم دل اور حساس طبیعت افراد محض کچھ ہی ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ریاض صاحب بھی تھے۔ جنہوں نے کسی صلے یا ستائش کی تمنا کیے بنا، وطن عزیز کی بہنوں بیٹیوں کے لیے ایک ایسے پرچے کا اجرا کیا جس کا اولین مقصد گھر کی چار دیواری کے اندر، اپنے معاشرے کی خواتین اور نو عمر لڑکیوں کو ایسی صاف ستھری تفریح فراہم کرنا تھی جس سے نا صرف ان کے ادبی ذوق کی تربیت ہو بلکہ ان میں مطالعہ کا رجحان بھی پیدا ہو۔ جو نا صرف ان کے ذہنوں کو جلا بخشے بلکہ معاشرے کی اونچ نیچ سے آگاہ کرکے انہیں زندگی گزارنے کے بہترین اصولوں سے بھی روشناس کروائے۔

ان کے روشن کیے گئے ان چراغوں نے جہاں گھر گھر اجالا کیا وہیں ان گنت قلم کاروں کو اپنا ہنر آزمانے اور اسے نکھارنے کا بھی بہترین موقع فراہم کیا۔ خواتین، شعاع اور کرن کے ذریعے منظر عام پر آنے والے بہت سے نام آج شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ اس لحاظ سے "چاند نگر گروپ آف پبلی کیشنز"

نے گزشتہ اکتالیس سال سے دنیائے ادب کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ریاض صاحب اور ان کے ادارے سے منسلک دیگر ناموں سے میرا پہلا تعارف آج سے چند سال قبل اس وقت ہوا جب میں نے بی ایس سی کے امتحانات سے فراغت کے بعد رزلٹ کی منتظر تھی۔ چھٹیوں کے دنوں میں خواتین' شعاع اور کرن سے تقریباً" استوار ہونے والے اس تعلق نے مجھے اپنی ذات میں پنہاں ایک مخفی صلاحیت کو نا صرف سمجھنے بلکہ پرکھنے کا بھی موقع دیا۔ یوں ایک سال کے قلیل عرصے میں یہ تعلق ایک یکسر نئے اور مضبوط رشتے میں ڈھل گیا۔ جس کے ذریعے مجھے نا صرف نام ملا' پہچان ملی بلکہ اپنی صلاحیت کو آزمانے کے لیے ایک مضبوط پلیٹ فارم بھی ملا اور آج جب کہ میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر چکی ہوں تو اللہ تعالیٰ کے کرم اور ادارے کے توسط سے مہوش افتخار کو' چند ایک ہی سہی' لیکن لوگ پہچاننے لگے ہیں۔

یہ اس ادارے کا ہی کمال ہے کہ آج میں آپ سب کے سامنے ملک کی ایک مایۂ ناز شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہی ہوں۔ جو میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔

ہر سال ان کی برسی کے موقع پر اپنی سینئر مصنفین اور دیگر ادبی شخصیات کے لکھے گئے مضامین کے ذریعے میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکی ہوں مگر پھر بھی اس بات کا قلق ہمیشہ رہے گا کہ ریاض صاحب جیسی عہد ساز اور پیاری ہستی سے مجھے کبھی براہ راست ملنے یا بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کے ادارے کے تمام افراد' آج بھی ان کی قائم کردہ محبت اور مہمان نوازی کی روایات کو اسی خلوص اور اپنائیت سے نباہ رہے ہیں۔ یہ بات میں اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ لفظوں کی اس طلسماتی دنیا کے پیچھے کارفرما دن رات انتھک محنت کرنے والی' کچھ ہستیوں سے میں نا صرف مل چکی ہوں بلکہ ان کی محبتوں کی بھی قائل ہو چکی ہوں۔

ریاض صاحب کے جانے کے بعد جس بہادری اور عزم سے ان تمام لوگوں نے ـــــ مرحوم ریاض صاحب کے وضع کردہ اصولوں پر چل کر کامیابیوں کی نئی منزلیں طے کی ہیں وہ واقعی قابل ستائش ہیں۔

اللہ تعالیٰ ریاض صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے روشن کیے گئے چراغوں کی لو کبھی مدھم نہ پڑنے دے۔ جو آج تک نہ جانے کتنے بھٹکے ہوؤں کو منزل تک پہنچانے کا ذریعہ بن چکے ہیں۔

رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کر آنے والے
کتنی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

☼

دستک دستک دستک

شاہین رشید

عبدالماجد بھٹی (صحافی اسپورٹس جنگ/ جیو)

"کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کرکٹ ورلڈ کپ کے ٹورنامنٹ میں آپ پاکستانی ٹیم کے ساتھ رہے۔ سیمی فائنل ہارنے کے بعد آپ کے کیا احساسات تھے؟"

"بحیثیت پاکستانی میرے احساسات وہ ہی تھے جو سب کے تھے۔ ایک تو میچ ہارنا' وہ بھی انڈیا سے تو ایسی فیلنگز تھیں کہ جن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور اس ٹیم کو بارہ' پندرہ سال سے میں بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے خوشیاں بھی دیں اور غم بھی۔ مگر غموں کی تعداد زیادہ ہے۔ 2007ء میں آئرلینڈ سے ہار گئے۔ بے شک بھارت کی ٹیم اچھی ہے لیکن پاکستان بھی اس پوزیشن میں تھا کہ میچ جیت سکتا تھا۔ بیٹنگ نے بہت مایوس کیا۔ فیلڈنگ نے بہت مایوس کیا۔ ٹنڈولکر جیسے بیٹسمین کے چار کیچ چھوڑ دینا۔ اس سے تو یہ ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی تیاری اچھی نہیں ہے۔ یا پھر ان میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اتنے بڑے مقابلے کا سامنا کر سکیں۔ پھر سچی بات تو یہ ہے کہ بھارت کا رویہ بھی بہت خراب تھا۔ پاکستان کے بارے میں جس طرح کی کمپین (مہم) انہوں نے چلائی ہوئی تھی وہ بہت تکلیف دہ تھی۔ اور ہارنے کے بعد تو انہوں نے حد کر دی' تو بحیثیت پاکستانی کے ان باتوں کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس بار تو جذبات کچھ اور ہی تھے۔"

"جب انڈیا کے وزیراعظم نے پاکستان کے وزیراعظم کو میچ دیکھنے کی دعوت دی تو بالکل عام لوگ جو صرف کھیل سے لگاؤ رکھتے ہیں' انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب پاکستان نہیں جیتے گا۔ کیونکہ دو حکومتیں انوالو ہو گئی ہیں' اور پھر ایسا ہی ہوا۔ آپ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

"میں اس بات کو نہیں مانتا کہ حکومتی سطح پر کچھ ہوا ہو گا۔ یہ ہمیشہ کی بات ہے کہ جب ٹیم ہارتی ہے تو نئی نئی باتیں گشت کرنے لگتی ہیں اور میں جب سے انڈیا سے واپس آیا ہوں لوگوں کی باتیں سن کر ہمیں حیرت ہو رہی ہے کہ لوگ حقائق نہیں دیکھ رہے۔ کرکٹ میں سٹے بازی ہوتی ہے' لیکن میرا نہیں خیال کہ پاکستان نے بھارت سے ہارنے کے لیے سٹے بازی کی ہو گی اور حکومتی سطح پر اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہم کب چاہیں گے کہ ہم بھارت سے ہار جائیں۔ ماضی میں جب پاکستان' بنگلہ دیش سے ہارا تھا تب بھی یہ ہی کہا گیا کہ حکومت نے کہا ہو گا۔

"میچ سے ایک دن پہلے علم نجوم' ستارہ شناس اور دیگر لوگوں نے کہا کہ پاکستان یہ میچ سو فیصد جیت جائے گا اور جب ٹیم ہار گئی تو ایک صاحب (منجم) نے کہا کہ چند دنوں میں آپ کو پتا چل جائے گا کہ ہم میچ کیوں ہارے تھے؟! اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"علم نجوم کو میں چیلنج نہیں کرتا۔ لیکن میرے نزدیک اللہ کی ذات ہی سب سے اعلا ہے اور اس طرح

منجم سب کچھ بتانے لگ جائیں تو پھر آگے کی کسی کو فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور بھارت میں بھی یہ ہی کچھ ہو رہا تھا اور جو لوگ دوسروں کی قسمت کا حال بتا رہے ہوتے ہیں انہیں خود اپنی قسمت کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"سیمی فائنل ہارنے کے بعد کھلاڑیوں کا کیا ردِ عمل تھا' ریلیکس تھے یا اپ سیٹ؟"

"افسردہ تو سب ہی تھے' کیونکہ ہم بھارت سے ہارے تھے' جس کے لیے اتنے دن سے میڈیا بھی لگا ہوا تھا اور کھلاڑی بھی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور جب ہارے تو یہ بھی سوچ رہے تھے کہ پاکستان جائیں گے تو کس طرح لوگوں کو فیس کریں گے۔ پتا نہیں لوگوں کا کیا رویّہ ہوگا؟ لیکن بڑی بات ہے کہ میڈیا نے بہت پوزیٹو رول پلے کیا اور کھلاڑیوں کو بڑے اچھے انداز میں ویلکم کیا۔ کھلاڑی تو یہ ہی چاہتے تھے کہ میچ جیت کر "ہیرو" بن جائیں' تاکہ لوگ برسوں یاد رکھیں۔ تو جتنے افسردہ عوام تھے ان سے کہیں زیادہ افسردہ کھلاڑی تھے۔ سب ہی اپنی غلطیاں مان رہے تھے اور اب تو کرکٹ اتنی ایڈوانس ہو گئی ہے کہ بچے بھی بتا سکتے ہیں کہ کس نے کہاں غلطی کی تھی اور میں داد دوں گا شاہد خان آفریدی کو کہ جس نے اپنے آپ کو عوامی عدالت میں کھڑا کر دیا اور قوم سے معافی مانگی۔ بہت بڑے پن کا ثبوت دیا اس نے۔ تو میں تو یہ ہی کہوں گا کہ یہ کھیل ہے' اسے کھیل کے انداز میں ہی لینا چاہیے۔ ہم سب بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر بھارت کے معاملے میں۔ ساری باتوں کی ایک ہی بات ہے کہ بس وہ دن ہمارا نہیں تھا۔"

"جوں جوں ہم شکست کے قریب جا رہے تھے کھلاڑیوں کی اور آپ کی کیا کیفیت تھی؟"

"جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں پاکستان کے ہارنے پر بہت کم افسردہ ہوتا ہوں۔ کیونکہ مجھے کام بھی کرنا ہوتا ہے اور اپنے اعصاب کو کنٹرول بھی رکھنا ہوتا ہے' لیکن اس میچ کے ہارنے پر میں بہت زیادہ دل برداشتہ تھا اور اس وقت میری جو کیفیت تھی اس کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ بہت ہائی پروفائل میچ تھا۔ ایک موقع پر جب ہماری پوزیشن کنٹرول میں تھی تو وہاں کے صحافی دوستوں سے میں نے کہا کہ (ازراہِ مذاق) فائنل میں ہماری ٹیم پہنچنے والی ہے تو اب ہم فیصلہ کریں گے کہ "ونکھیڈے" اسٹیڈیم کے پریس بکس میں جگہ ملے گی یا نہیں۔ کیونکہ پہلا حق اس کا ہوتا ہے جو فائنل کھیل رہی ہوتی ہے۔ یعنی اس حد تک ہم نے سوچ لیا تھا تو پھر آپ خود ہی سوچیے کہ ہار ہمارے لیے کتنا بڑا دھچکا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس میچ کے ہارنے کا غم کافی سال رہے گا۔ کیونکہ انہوں نے جس انداز میں جشن منایا ہے' ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا ہے اور پاکستان کو کچل کے رکھ دیا ہے۔"

"انڈیا کے میڈیا کے رویّے کے بارے میں آپ نے بھی اپنے مضمون میں لکھا' پھر آفریدی نے بھی کہا تو آپ کا دل چاہتا تھا کہ آپ احتجاج کریں۔ یا اپنی صفائی میں کچھ کہیں؟"

"بالکل۔ ایک' دو چینلز پہ مجھے بلایا گیا' میں نے اپنا احتجاج' اپنا موقف بیان کیا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اتنی زیادہ بکواس ہو رہی ہے تو پھر دیگر چینلز میں شرکت سے میں نے معذرت کر لی۔ شاہد آفریدی کے خلاف بہت کیچڑ اچھالا گیا' کہا گیا کہ یہ بہت بڑا بے ایمان ہے' ماضی میں ہر کھلاڑی سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں تو جب ہم نے سیمی فائنل کے لیے کوالیفائی کیا۔ بھارتی میڈیا کی یہ پوری کوشش تھی کہ پاکستانی کھلاڑیوں کو بدنام کریں۔ ایک سابق کرکٹر نے تو یہ تک کہہ دیا کہ اچھا ہے پاکستان ہار جائے اور یہاں سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی فلائٹ ہے وہ لاہور پہنچ جائیں گے اور کھلاڑیوں کا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کی گئی تو پاکستانی ٹیم کو صرف گراؤنڈ میں آ کر نہیں لڑنا تھا' بلکہ انہیں کئی محاذوں پر لڑنا تھا اور لڑ رہے تھے' میڈیا کو بھی فیس کر رہے تھے۔ عوام کو بھی فیس کر رہے تھے۔ پاکستان کے خلاف اور اپنے خلاف پروپیگنڈے کو بھی فیس کر رہے تھے۔ اس قسم کے رویّے پر کم سے کم بھارتی حکومت کو ضرور ایکشن لینا چاہیے تھا ایک طرف تو آپ پاک بھارت دوستی کی باتیں کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ کا یہ رویّہ بہت افسوس ناک تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اتنی آسان نہیں ہے۔ کیونکہ بہت زیادہ پاکستان مخالف جذبات ہیں۔"

"لوگ بھی مخالف ہیں' حکومتی سطح پر بھی ہمارے تعلقات اچھے نہیں ہیں' لیکن اس کے باوجود ہمارے کیبلز پہ ان کے چینلز چلانے کی اجازت ہے۔ ان کی موویز ہمارے سینماؤں میں لگتی ہیں۔ ان کے گانے ہمارے پروگراموں کا حصہ اور حد تو یہ ہے کہ نیوز چینلز پہ انٹرٹینمنٹ کی خبریں بھی ان ہی کی ہوتی ہیں۔ تو کیا آپ چاہیں گے کہ ان پر پابندی لگنی چاہیے۔ جس طرح کا سلوک آپ دیکھ کر آئے ہیں؟"

"نیوز کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ تو برا ہوا ہی۔ خود میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ ممبئی میں میرے ہوٹل کے کمرے میں سی آئی ڈی کے لوگ آ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کیوں آئے ہیں؟ کیا کرنے آئے ہیں؟ میرا سامان چیک کر رہے ہیں۔ عجیب جنگ آمیز انداز تھا ان کا' اور مجھے بھی یہ بات بہت عجیب لگتی ہے کہ ایک طرف تو ہم ان کو برا کہتے ہیں اور دوسری طرف اسٹار پلس' گانے' فلمیں' رسم و رواج سب کچھ ان ہی کا اپنایا ہوا ہے۔ ہم نے دوغلی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے اور حکومت کیا پابندی لگائے' اگر ہم خود اپنا احتساب کریں تو ہمیں خود پر ہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ہم ان کی پروڈکٹ اور ہر چیز کا بائیکاٹ کریں تب ہی بات بن سکتی ہے۔ میچ کے بعد تھوڑے دن

کے جذبات ہوتے ہیں اور پھر سب نارمل ہو جاتے ہیں۔ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ جو پاکستان کی نئی ٹیم کا اعلان ہوا ہے جو ویسٹ انڈیز کے دورے پر ہے' اس کے لیے آپ مطمئن ہیں؟"

"جن کو ڈراپ کیا ہے ان کے لیے تو میں مطمئن ہوں۔ لیکن ان کی جگہ پر جو کھلاڑی لیے ہیں ان سے میں مطمئن نہیں ہوں اور بہت سے سوالیہ نشان سامنے آتے ہیں۔ وکٹ کیپر محمد سلمان کو لیا ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ اچھا پرفارم کرے' لیکن ٹیم کو سلیکٹ کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ ڈومیسٹک کرکٹ سے کھلاڑی لینا ہوتے ہیں اور ڈومیسٹک کرکٹ میں ٹاپ پرفارمر وکٹ کیپر سرفراز احمد اور گل ریز صدف ہے ان کو چانس نہیں دیا۔ پھر 28 سے 30 سال کے لڑکے لے لیے ہیں جو 2015ء تک کتنے بڑے ہو چکے ہوں گے' کیونکہ ہمارے یہاں تو پہلے ہی لڑکے اپنی عمر 2 سے 3 سال کم لکھواتے ہیں۔ تو خود سوچیے کہ ٹیم کیسے تیار ہوگی اگلے ورلڈ کپ کے لیے۔"

"تمام اخراجات آپ کے ادارے نے برداشت کیے یا جیب پر بھاری پڑا اور فیوچر میں اس ورلڈ کپ کی "لمحہ بہ لمحہ" روداد لکھنے کا ارادہ ہے؟"

"میرے ادارے نے ہی میرے سارے اخراجات برداشت کیے اور جہاں تک لمحہ بہ لمحہ روداد لکھنے کی بات ہے تو اتنا ٹائم ہی نہیں ہے اور میں وہاں سے پختہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ "ورلڈ کپ کی یادداشتیں" کے عنوان سے کتاب لکھوں گا اور ان شاء اللہ جیسے ہی مجھے فرصت ملی' ضرور لکھوں گا۔"

عفت عمر

"جی کیسی ہیں آپ؟"

"کرم ہے رب تعالیٰ کا۔"

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں۔ ابھی حال ہی میں کیمسٹری ختم ہوا ہے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے "تھوڑی سی وفا چاہیے" آن ایر تھا۔ اب ایک دو نئے پروجیکٹ کر رہی ہوں۔"

"کافی عرصے سے آپ اس فیلڈ میں ہیں۔ بہت سے کردار کر چکی ہیں۔ کچھ تشنگی باقی ہے یا مطمئن ہیں؟"

"دیکھیں... میں ایک آرٹسٹ ہوں اور آرٹسٹ کبھی بھی اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتا۔ جہاں تک تشنگی کی بات ہے تو وہ بھی برقرار ہے' کیونکہ ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے۔"

"کوئی کردار جو خاص طور پر کرنا چاہ رہی ہوں؟"

"نہیں۔ ایسا کوئی کردار نہیں ہے جس کے لیے میں چاہوں کہ کرلوں' جو کردار ملتا ہے اس کا مطالعہ کرتی ہوں۔ پسند آجائے تو کرلیتی ہوں اور نہ آئے تو انکار کر دیتی ہوں۔"

"کچھ مشاہدہ بھی کرتی ہیں؟"

"جو بھی کردار ہوتے ہیں وہ ہمارے اردگرد کے ہی ہوتے ہیں' جنھیں ہم روزانہ ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ایسا کوئی کردار ابھی تک نہیں سامنے آیا کہ جس کے لیے بہت زیادہ مشاہدے کی ضرورت پیش آئی ہو۔"

"کام کے معیار سے مطمئن ہیں؟"

"مطمئن کی بات تو چھوڑیے' انسان بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا ہے' اور میں سمجھتی ہوں کہ اب معیار بہت بہتر ہو گیا ہے۔ بہت سارے چینلز آنے سے مقابلے کی فضا پیدا ہوئی ہے اور بہت اچھے اچھے ڈرامے بننے لگے ہیں' بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔"

"کب سے ہیں اس فیلڈ میں؟"

"اب یہ تو یاد نہیں کہ کتنے سال ہو گئے۔ ہاں جب بہت چھوٹی تھی اس فیلڈ میں آئی تھی... میں اسکول کی طالبہ تھی تو مجھے ماڈلنگ کی آفر ہوئی' جس کو ظاہر ہے ماں باپ نے قبول کیا اور یوں ابتدا ماڈلنگ سے ہوئی۔"

"پھر اداکاری کی طرف آئیں؟"

"جی۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ماڈلنگ کو جاری رکھا۔ میری خود اعتمادی کو دیکھتے ہوئے حیدر امام رضوی نے ڈرامے میں کام کرنے کی پیش کش کی اور یوں اداکارہ بھی بن گئی۔"

"کوئی مشکل ہوئی؟"

"نہیں بالکل نہیں' جب چھوٹی تھی تو خود اعتمادی کے ساتھ ماڈلنگ کر لی تھی' جب اس وقت مشکل پیش نہیں آئی تو پھر اداکاری میں بھی نہیں آئی۔"

"آپ کی پہلی ترجیح؟"

"اب پہلی ترجیح اداکاری ہے۔ ماڈلنگ تو کافی کر لی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ بحیثیت اداکار کے لوگ آپ کو زیادہ جانتے ہیں' کیونکہ جو کردار ہم کرتے ہیں وہ ہمارے اسی معاشرے کے ہوتے ہیں' تو کئی لوگوں کو ہمارے کیے گئے کرداروں میں اپنا عکس نظر آرہا ہوتا ہے' اس لیے کردار اور فنکار دونوں ہی لوگوں کو یاد رہ جاتے ہیں۔"

"گھریلو لائف شوبز کی وجہ سے ڈسٹرب ہوتی ہے؟"

"نہیں... بالکل نہیں' کیونکہ میں اتنا کام ہی نہیں کرتی کہ میری گھریلو لائف ڈسٹرب ہو' مجھے اپنا گھر' اپنا شوہر اور اپنی بیٹی بہت عزیز ہے۔"

"آپ کے میاں صاحب کا تعلق بھی شوبز سے ہے کیا؟"

"نہیں... ان کا اپنا بزنس ہے۔"

"اپنے مسائل اور اپنی اداکاری کے حوالے سے اپنے میاں صاحب سے ڈسکس کرتی ہیں؟"

"مسائل تو ظاہر ہے ڈسکس کرتی ہوں' لیکن شوبز کے حوالے سے کوئی بات ڈسکس نہیں کرتی اور اس لیے نہیں کرتی کہ پھر گھر کی دنیا میں اور باہر کی دنیا میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

"لڑکیوں کے لیے تعلیم کیوں ضروری ہے؟ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ انہیں زیادہ پڑھ کر کیا کرنا ہے' انہیں تو شادی کے بعد گھرداری ہی کرنی ہے؟"

"یہ بات بالکل غلط ہے' لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنی لڑکوں کے لیے۔ ضروری نہیں کہ نوکری کی جائے' اچھی گھرداری کے لیے بھی تعلیم بہت ضروری ہے اور پھر خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہو تب بھی تعلیم کام آتی ہے اور تعلیم یافتہ انسان کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔"

"فارغ اوقات کے کیا مشاغل ہیں؟"

"مجھے مطالعہ کرنے کا بہت شوق ہے اور فارغ وقت کا بہترین مشغلہ بھی مطالعہ کرنا ہے۔ اخبارات پڑھنا' کتابیں پڑھنا' مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"بازار جاتی ہیں تو کن چیزوں کی خریداری زیادہ کرتی ہیں؟"

"کم سے کم ایک کتاب تو ضرور ہی خریدتی ہوں۔ باقی زیادہ تر ضروریات زندگی کی ہی خریداری ہوتی ہے۔"

"کام کے حوالے سے کن ڈائریکٹرز کو پسند کرتی ہیں؟"

"مجھے احمد کامران کے ساتھ کام کر کے زیادہ مزہ آتا ہے' باقی سب بھی اچھے ہیں۔"

★

حاصل گھاٹ

مصنف: بانو قدسیہ

تبصرہ: آمنہ زرین

مطالعہ ذہن کو وسعت عطا کرتا ہے اور ذہن کو نئی جہت میں پرواز کرنے کے لیے سوچ کے پر عطا کرتا ہے ...... لیکن یہ سب مثبت طرزِ فکر سے مشروط نتائج ہیں۔ مطالعے سے منسوب مقصد کو پانے کے لیے ہمارے ذہن کی مطابقت، توجہ، یکسوئی اور تخیل کی مدد سے لفظوں کی تصویر کشی ضروری ہے۔

ہم جو سوچتے ہیں ...... وہی ہماری گفتگو ہے ...... اور ہم کچھ زیادہ سوچ لیتے ہیں تو پھر وہی ہماری تحریر ہے۔

تحریر اپنے لکھنے والے کی تصویر ہوتی ہے ...... اور کسی بھی تحریر سے ہمیں روحانی خوشی تب ہی حاصل ہوتی ہے جب ہمیں لکھنے والے کی سوچ تک رسائی اور خیال آرائی سے اتفاق ہو۔

بانو کو یوں تو بانو آپا کہا جاتا ہے ...... یہی ان کے نام کے ساتھ معروف ہے ...... مگر ان کی تحریر سے کتاب کے پیچھے چھپی ان کی تصویر سے ماں چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے ...... دیکھیں میں نے جھلک کا لفظ استعمال نہیں کیا کیونکہ جھلک تو عکس نظر آنے والا ایک پہلو ہوتا ہے اور جو چھلکتا ہے وہ سارے کا سارا ہوتا ہے!

تو بانو قدسیہ کا قلم ان کی طرح شفیق، مہربان لہجہ رکھتا ہے ...... وہاں نہ علم کا تکبر ...... نہ تلخی کی کاٹ ...... نہ جھنجلاہٹ بھرے تھپیڑے ...... نہ الجھنوں سے الجھی خفگی ...... ان میں سے کچھ بھی نہیں ......!

اس مناسبت سے مجم کی کتاب میں بانو کے قلم، تجربے اور فلسفے کا نچوڑ ہے اور میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ اس قدر رواں، سبک، مربوط اور مکمل خیال کی ترسیل شاید میں نے پہلی مرتبہ محسوس کی ہے ......

"بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا" جب آپ کتاب پڑھتے ہوئے ...... موجود ہوتے ہوئے خود کو فضا میں ذرا سا اٹھا ہوا محسوس کرتے ہیں تو آپ پر اس مصرعے کی معنویت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔

ٹھیک ہے آئیں چلیں میرے ساتھ آپ بھی دو جہاں کی سیر کریں۔

"حاصل گھاٹ"

ایک گزری ہوئی ...... اور ایک گزرتی ہوئی زندگی کی کہانی ہے، ایک سفر ... نظر آنے والے اسباب [illegible] ہو رہا ہے اور خیال کی [illegible] سے [illegible]

اس ناول کا مرکزی کردار ایسا ہی ہے ...... لیکن کیا کوئی کردار ایسا ہو سکتا ہے؟ ہم میں سے کوئی بھی تو ایک کردار نہیں ہوتا، ہم نے گزرتے ہوئے [illegible] کے ساتھ کئی طرح سے کردار ادا کرنے ہوتے ہیں۔

تو یہ بھی ایک ایسا ہی کردار ہے "ہمایوں فرید"۔

ہمایوں فرید صاحب آپ کو اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں ...... ہر جگہ ہر آن ہر گھڑی۔

بقول ان کے، وہ ہم سے اپنی کہانی کہہ رہے ہیں۔ امریکہ میں اس وقت وہ اپنی بیٹی کے گھر میں مقیم ہیں جہاں کی بالکونی میں بیٹھنا ان کے لیے ٹائم مشین میں بیٹھنا ثابت ہوتا ہے۔

وہ وہاں بیٹھے بیٹھے کہاں کہاں کا سفر کر لیتے ہیں اور پھر جیسے ہی خارجی سطح پر ان کی طلبی ہوتی ہے ...... "ابو" بالکونی میں ارجمند کی آواز پھر آتی ہے "آ جائیے ...... مجھے ہسپتال جانا ہے دیر ہو رہی ہے ابو!"

سفر سے واپسی پر وہ آپ کو بھی حال میں موجود صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگتے ہیں یہ بالکل ایک ایسا

...... جیسے آپ کے پاس کسی کی ڈائری ہو جو آپ [illegible] ......!

[illegible] ...... امریکہ کو ...... مختلف زاویئے سے ......

امریکہ کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ مبہم سا بھی [illegible] انداز اختیار نہیں کرتے کہ آپ کو یہ محسوس ہو کہ وہ اینٹی امریکہ سوچ کے حامل ہیں، بلکہ وہ مکمل غیر جانبداری سے آپ کے سامنے امریکہ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں ...... اب آپ کی مرضی، جو چاہے اختیار کریں ...... اور یہ بے پناہ متوازن طرزِ فکر کی بدولت ہے۔

اور یہ بانو کے قلم کی وہ سیدھا اور مہربان انداز بیان ہے کہ نفرت کے زہر کا قطرہ بھی نہیں ملے گا!

"بہت غور سے سوچنے کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ امریکہ کو ڈاکوؤں نے بسایا تھا۔ ڈاکو جو کچھ بنیادی [illegible] بہادری اور زبردستی ہیں۔ [illegible] ان کے لیے [illegible] مشکل نہیں ہوتا ...... امریکہ کو [illegible] بنانے کی ضرورت تھی اس نے جال ڈال کر [illegible] کو [illegible] کر جہازوں میں لاد کر امریکہ کی سرگرداں چھینک دیا، جب امریکی [illegible] کو [illegible] ہونے کی خواہش نے ستایا تو ریڈ انڈین امریکی [illegible] نے چن چن کر ختم کیا۔ جب انہیں انگریزی زبان لوٹنے کی ضرورت پیش آئی تو [illegible] علم یوں اپنایا کہ اس کا لب و لہجہ [illegible] Slang کا اضافہ کر کے ایک نئی زبان ایجاد کی [illegible] انگریزی ششدر رہ گئے۔ [illegible] کہلاتا ہے۔ اگر [illegible] لڑنے والا دہشت گرد کہا [illegible] کہلاتا ہے۔ اسے آپ جرثومہ کا کرشمہ کہیں یا رکھوں کے رسم و رواج کی پیروی یا امریکی مزاج کی خوبی لیکن یہ بات واضح ہے کہ کسی خطے کے بسنے والوں کی عام [illegible] ایک سی ہوتی ہے۔"

اتنا مختصر اور جامع تعارف پہلے کبھی سنا آپ نے؟

ویسے امریکہ سے تعارف حاصل کرنا ازبس ضروری ہے چاہے نہیں وہاں جا کر رہنا ہو یا نہیں آپ سمجھتے ہیں نا اس کی وجہ؟

"1991ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں ایک ہی سپر پاور رہ گئی تو ایک اور آدرشی تحریک فیل ہو گئی ...... حالات کچھ اور ہو گئے۔ اب امریکہ اور بھی بہادر، بولڈ اور دہشت پسند ہو گیا ...... وہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر سے دنیا کے ممالک کو دھمکانے، ڈرانے اور پچکارنے میں کامیاب ہونے لگا۔

امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لیے الگ پلان بنایا ...... ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا۔ ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کو دھچکا لگانے والا ہے۔ اس کے لیے کویت کی حکومت کو ایکشن پر اکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی وسائل لے کر بیٹھ رہا کہ بلا ناغہ مشکل سوڈان کو دہشت گرد بنا کر [illegible] اس پر مسلط کر کے اس کو تباہ کر دیا۔ الجزائر میں ڈیموکریسی کا پتہ پھینکا اور جب دیکھا فنڈامنٹلسٹ کامیاب ہو گئے تو وہاں فوجی راج قائم کر دیا۔"

دیکھا آپ نے؟ پھر مختصر ترین اور جامع نقش ہمارے دوست کے؟ سرکاری ہی سہی ...... یہ تو تھے حقائق ...... اب دیکھیے ان حقائق کی روشنی میں تفکر اور تدبر پر مبنی ایک حساس رائے۔

"بہادر امریکہ کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے۔ پھر ہر مظلوم اسی اسلحے کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بن جاتا ہے۔ پھر اسی اسلحے کی برکت سے شہروں میں وارداتیں ہونے لگتی ہیں۔ گروہی اجتماعی جھگڑے فروغ پاتے ہیں۔ ڈاکو، اٹھائی گیرے، دہشت گرد اسی اسلحہ کی بنا پر زیادہ جی داری کے مظاہرے کرتے ہیں۔ ٹرینوں میں بم پھٹتے

ہیں۔ کاریں چرائی جاتی ہیں۔ ڈکیتیاں، ... ان تمام وارداتوں کی تفاصیل سپرپاور کے نمائندے ... کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں۔ ایسے ملکوں میں میر جعفر جیسے شخص تلاش کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا ... خوف سے لرزاں شہریوں کو دو نظریوں، پارٹیوں میں تقسیم کرنا بھی کچھ مشکل نہیں ... مسلمان ملکوں کو کسی وقت بھی کوئی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔"

شاعری کو الہام کہا جاتا ہے ... اس کو آپ کیا کہیں گے؟

اس ناول کی اشاعت کو تقریباً" آٹھ سال ہونے کو ہیں ... اور حالات جس نہج پر آج ہیں نہ کسی سے چھپا ہوا ہے اور نہ ہی کچھ بتائے ہوئے سے مختلف! حالات کو آنے والے حالات کے تناظر میں دیکھ سکنے کی خوبی، لکھنے والے کے فہم، تدبر اور حساس ادراک کی بدولت ہوتی ہے ... ادیب کی آنکھیں ... نیلے آسمان کو ایسے نہیں دیکھتیں جیسے کہ عام آدمی ... کیونکہ اگر عام آدمی بھی وہ بصیرت رکھتا ہے ... تو!

انکل جب ماضی میں جاتے ہیں تو وہاں ان کے بہن بھائیوں، اماں، ابا دادا، دادی اور چاچا صمد سے نہ صرف ہماری ملاقات ہوتی ہے بلکہ ان کے متعلق انکل کے جذبات سے آگہی بھی۔

سب سے پہلے وہ ہمیں چاچا صمد سے ملواتے ہیں۔

"گھر کا دروازہ کھلتے ہی وہ برسات کی ٹھنڈی ہوا کی طرح خوشی کے جھونکے ساتھ لاتا ... چاچا صمد کا موآگت سبھی کرتے۔"

چاچے کے بعد ابا سے ملیے۔

"سارا گھرانہ چاچے کی آمد پر خوش ہوتا ... صرف ابا کے ماتھے پر بل سیدھے نہ ہوتے۔ ابا اتنا سنجیدہ مزاج آدمی تھا کہ اس کے سامنے کوئی ہنس بول نہیں سکتا تھا ... خوشی کا یہ قاتل نہ خود خوش رہتا نہ ہی کسی اور کو خوش رہنے کی اجازت دیتا۔"

کرداروں اور واقعات کو ہم پر کھول کر واضح کرنے کے لیے انکل ہمیں بہت دلچسپ، حیرت انگیز، رنگ رنگ دیسوں کی کہانیاں بھی سناتے ہیں ... چاچا صمد کا کردار واضح کرنے کے لیے وہ ہمیں خراسان کے بادشاہوں کی کہانی سناتے ہیں ... جس کے تین بیٹے تھے ...!

انکل بڑھاپے کے مرحلے میں موجود ہیں ... مگر بشاشت کا عالم دیکھیے۔

"لیکن خود مجھے اپنے مرنے کا احساس تو در کنار بوڑھے ہونے کی بھی اطلاع نہ ہوئی۔ میں ہمیشہ اندر کے موسم سے باہر کی رت کا اندازہ لگاتا آیا ہوں اور قلندر کی رت نے مجھے زیادہ تر بہار کا ہی سندیسہ دیا۔"

اس کہانی میں کچھ قدم کے سفر کے بعد آپ کا تعارف ایک ایسے کردار کے ساتھ ہوگا جو کہانی میں اس طرح ساتھ چلے گا ... جس طرح گاڑی میں بیٹھے ... کے ساتھ چاند ستارہ ... جس سے تعلق ... ہیں۔

"میں ... یہ کیسا تعلق ہے ... ایک جگنو کی طرح میرے ساتھ ہی چلتا چلا آیا ... اس ... نے میری روزمرہ کی زندگی میں کوئی مداخلت نہ کی، میری ... کو برباد نہ کیا اور پھر بھی ... کار سے نظر آنے والے منظر کی طرح ... ساتھ ہی رہا۔"

اس تعلق کے بننے ... کھو جانے اور دوبارہ پانے کی تگ و دو کے دوران ہی آپ کو مشرق کی فلاح اور مغرب کی ترقی کے تصورات میں موجود فکری تضادات ... مغربی بود و باش کے مسائل، عورت اور مرد کی متضاد خواہشات، اقدار سے وابستگی اور ان کی پامالی، اقلیت کا اکثریت میں ضم ہو جانے والا رویہ اور پھر اپنی گم ہوتی شناخت کی بحالی کے لیے واپسی کا ارادہ ... محبت کے قدیم زمانے کے حالات اور جدید زمانے کی توجیہات ... غرض یہ کہ ایک جہان آباد رہے گا ... جب تک کہ انکل پاکستان کا ٹکٹ نہ کٹوالیں ...!

"حاصل گھاٹ" ایک ایسے جہاں دیدہ تدبر اور تفکر کا امتزاج ہے جس نے اس عجب دنیا میں احساس اور

مشاہدے کی دولت خرچ کی۔۔۔ اور اپنا جمع جتھا ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

تجربے کی اس گٹھری میں خیال کے انمول نگینے ہیں، جن کی چمک آنکھوں کو روشنی کا احساس دلاتی ہے۔ نرم ملائم سے احساس ہیں جن کو چھو کر زندگی کی سختیوں کا گلہ جاتا رہتا ہے۔ کچھ خوب صورت تصویریں جن کی رنگینی، ان کے جاندار رنگوں کی بدولت قائم و دائم ہے۔

دیکھیے۔۔۔ تعلق کی رمز بیان کرتا ہوا یہ اقتباس۔

"تعلق کیا چیز ہے۔۔۔؟

یہ بھی حسیات سے تعلق رکھنے والی غیر مرئی خوبیوں میں سے ایک کیفیت ہے۔۔۔ جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سمجھانے پر آئیں تو سمجھا نہیں سکتے تعلق زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر کی مانند ایک ڈھال ہے، جب کبھی جہاں بھی کوئی سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے وہاں قناعت، راحت اور وسعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کو اندر ہی اندر یہ یقین محکم رہتا ہے کہ آپ کی آگ میں سلگنے [illegible] کوئی دوسرا بھی موجود ہے۔ دوہرا وزن آدھا رہ جاتا ہے۔"

اب اس پر کیا بحث کی جا سکتی ہے؟ یہی۔۔۔ کہ یہ سچ ہے!

دیکھیے۔۔۔ نسلی تعصب کو بیان کرتے ہوئے ان کی رائے۔

"ضرورت اس بات کی نہیں کہ انسان بے رنگ ہو بلکہ یہ سمجھنا پڑے گا کہ ہر رنگ کی اپنی شان ہے۔ یہاں تک شاید اسی وقت پہنچا جا سکتا ہے جب لوگ آخری خطبہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سمجھ پائیں گے۔ کسی کو حیلے بہانے سے، بری نیت سے برابر نہیں کرنا، اس کے اور اپنے باہمی فرق کے آگے صرف اس لیے سر جھکانا ہے کہ یہ نبی کا فرمان ہے۔"

کتنی سیدھی سی بات ہے نا؟ مگر بعض اوقات لوگ سیدھ میں دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں!

"پتہ نہیں کیا بات ہے۔۔۔ جب ہم کسی میں کیڑے نکالنے کے مسلسل عمل میں ہوتے ہیں تو کہیں ہوا میں سے ان کیڑوں کا پولن ہماری اپنی ذات پر بھی جھڑنے لگتا ہے۔ اس بات کو لے کر آج معاشرے کی فضا دیکھیں۔۔۔ کس قدر کثیف ہے! دھواں صرف گاڑیوں ہی کا تو نہیں ہوتا۔۔۔ کچھ شعلے زبان سے بھی بھڑک جاتے ہیں۔۔۔!

گلہ، شکایت، رنج، سب سچ بھی ہو۔۔۔ تو ہوتی تو ہر وقت عیب جوئی ہی ہے نا۔۔۔؟"

دیکھیے مشرق اور مغرب کی جاری بحث۔۔۔

"مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں۔۔۔ استواری کا دلدادہ ہے۔"

"مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے مغرب میں ابھارنے کا۔"

"یہاں عقیدہ اہم ہے وہاں قاعدہ۔۔۔"

"دونوں میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے۔"

دیکھیے امریکی مزاج۔۔۔ اور ان کی پہچان۔

"جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔۔۔ لیکن [illegible] جذبات کے تابع نہیں رہ سکتے۔ جہاں [illegible] میں تواتر آیا، یکسانیت پیدا ہوئی، امریکی باشندہ بور ہو کر راستہ بدل جاتا ہے اسے یا تو بریک درکار ہوتی ہے یا تبدیلی!"

بھی وہ ہمیں کہانی سنا کر زندگی سے متعلق کوئی حقیقت بتاتے ہیں۔۔۔ تو کبھی حقیقت بتانے کے لیے کہانی سناتے ہیں۔۔۔ دلچسپ دکانیں۔۔۔ مسٹر ڈل بھجکڑ کی کہانی کو انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی پر منطبق کیا۔

"غم بھی تو انسان کا استاد مکرم ہے ہماری روح دکھ کے بغیر بالیدہ نہیں ہو سکتی اور اٹھ نہیں سکتی۔"

"خوف میں تو ہر زمانے کے والدین لرزتے ہی ہیں لیکن اب خوف ترقی کا ہے۔ اب والدین بڑے بزرگ، اولاد کی مالی حیثیت کے لیے متفکر ہوتے ہیں، کردار کے لیے نہیں۔"

ایک دن چاچاجی کو شاپنگ سینٹر میں ایک ناراض پاکستانی نوجوان مل گیا۔۔۔ وہ شدید ترین ڈپریشن کی حالت میں ان سے باتیں کرنے لگا، وہ بھی کیا دلچسپ [illegible] ہے!

"چاچاجی جانتے ہیں روز ازل اللہ اور ابلیس کے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا۔۔۔ اللہ نے ابلیس کو قیامت تک کس چیز کی مہلت دی تھی۔۔۔ مجھے اس نوجوان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ بڑا ذہین، جان دار اور سوچنے والا جوان تھا جو اپنے متعدد سوالوں کے بدلے صرف ایک شافی جواب کی تلاش میں تھا۔

"میں وہاں موجود نہیں تھا میرے بیٹے۔۔۔ بائی دی وے تمہارا نام کیا ہے۔۔۔؟"

چاچاجی نے پوچھا بھی۔۔۔ مگر وہ اپنی کہتا رہا۔۔۔

اس طرح کے اور بھی کئی دلچسپ کرداروں سے آپ کی ملاقات ہو گی، جو سر راہ چاچاجی سے ٹکرائے۔۔۔ اور بے وطنی کی مساوات نے انہیں باہم تعلق اور ہمدردی کا احساس دلایا۔

پھر گیارہ ستمبر ہو گیا۔۔۔ اور دنیا بدل گئی۔

دودھ کی بوتلوں کی خریداری سے واپسی پر انہیں ایک خوب صورت افغانی نوجوان ملا۔۔۔

بے وطنی۔۔۔ تنہائی شاید ہم زبان کی تلاش میں رہتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔

"میں گیارہ ستمبر سے پہلے بہت لبرل تھا بابا جان!"

"آپ نہیں جانتے بابا جان۔۔۔ لبرل صرف وہ [illegible] ہو سکتا ہے جو کسی بھی کھونٹی سے نہ بندھا ہو۔۔۔ [illegible] کسی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نہ ہو۔۔۔ [illegible] خاص مذہب، مسلک، رسم و رواج کا پابند نہ ہو [illegible] اس قدر خالی ہو کہ ہر وقت دوسروں کے سانچے [illegible] ڈھل نہ سکے تو کم از کم اپنی ذات میں دوسروں کا مذہب، کلچر، رسم و رواج بھر سکے۔"

[illegible]۔۔۔ لبرل ہونے کی وجوہات۔۔۔! آپ کو پہلے [illegible] تھا!

[illegible] کے والد نے بھی زندگی کے اہم [illegible] ایک کہانی سنائی۔

[illegible] نے چھلکتی مٹی سے بابا آدم کو بنایا۔"

اور کہانی سنانے کے بعد نصیحت کی۔

"یاد رکھنا صاحب اختیار کی ذمہ داری بہت زیادہ ہو جاتی ہے اسے اپنے فیصلے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔"

اتنا سب لکھنے کے باوجود اگر مجھے تشنگی کا احساس رہے۔۔۔ تو ایسا لگنے میں کوئی تعجب نہیں۔۔۔!

"وہ لوگ جنہیں فلاح درکار ہوتی ہے اور جو ترقی کے بجائے فلاح کا انتخاب کرتے ہیں۔۔۔ وہ پہلے سر جھکا کر مضبوطی سے ایمان کی ڈوری تھام لیتے ہیں، پھر بے کار تجسس سے ان کی وابستگی نہیں رہتی۔"

ترقی؟ آپ کو معلوم ہے نا کہ زمانہ قدیم سے ترقی کا خناس لوگوں کے ذہن و دل کو مطیع کرتا آیا ہے۔۔۔ قوم عاد کا ذکر تو آپ نے سنا ہو گا؟ انہیں ترقی کا ہی تو زعم تھا۔۔۔ اور ترقی تو فرعون کے دور میں مصر نے بھی بہت کی تھی۔۔۔ کہ آج تک اس ترقی کے نشان ابو الہول کی صورت لوگوں کو حیران کرتے ہیں۔۔۔!

"وہ [illegible] جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں نہ [illegible] میں پڑتے ہیں نہ تاویلوں میں [illegible] نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ نہ حکم ماننے کے لیے کسی انعام کا لالچ درکار ہوتا ہے۔۔۔ نہ جنت کی خواہش۔۔۔ نہ دوزخ کا عذاب۔۔۔ ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں۔

فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی یہی مان لینا ہے۔"

یہی "حاصل گھاٹ" کا حاصل بحث ہے۔۔۔ جو ایک پیغام بھی ہے ازلی حقیقت بھی اور کامل بھی۔۔۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن کا پیغام ہے نا۔۔۔ کہ

"نہ انہیں خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

جی۔۔۔ کیسی لگی آپ کو "حاصل گھاٹ" پڑھ کر بتائیں گی نا؟

☆

شادی مبارک ہو

قرۃ العین چنا ہمراہ فیصل رحمن چنا

اقراء چنا

سب سے پہلے شعاع کی تمام قارئین بہنوں کو میرا اسلام! ماہدولت کا نام اقرا ہے۔ اور میں آپ کی پیاری رائٹر قرۃ العین چنا کی چھوٹی بہن ہوں۔

ہم پانچ بھائی، بہن ہیں۔ آپی کا نمبر دوسرا ہے۔ انہوں نے اردو لٹریچر میں ایم اے کیا ہے۔ آج میں آپ کے لیے ان کی شادی کا دلچسپ روداد لے کر آئی ہوں۔

احوال کچھ یوں ہے کہ ہم کراچی میں رہتے ہیں۔ جبکہ آپی کی سسرال سکھر میں ہے۔ سو اکتوبر کی بارہویں صبح جب آپی کے سسرال والے شادی کی تاریخ لینے آئے تو طے یہ پایا کہ شادی سکھر میں ہی ہوگی۔ میں تو خوشی سے جھوم اٹھی کہ مجھے ہمیشہ ہی سکھر جانے میں بہت مزہ آتا ہے۔ میری تمام کزنز وہی ہیں جن کی گیدر رنگ ہمیشہ ہی ہونٹوں پہ مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہے۔

شادی کی تاریخ 19 نومبر 2010ء طے پائی [illegible] سو ہم بارہ نومبر کو یہاں سے روانہ ہوئے۔

اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے مینی آپی ایک آخری نظر کراچی کی سڑکوں پہ ڈال رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ رخصتی سے پہلے ہی اپنے شہر سے وداع لینے کا غم ان کے چہرے سے بھی مترشح تھا۔

اگلی صبح جب ہم سکھر پہنچے تو بھرپور طریقے سے ہمارا استقبال ہوا۔ ہمارے تمام کزنز ہمیں ریسیو کرنے کے لیے اسٹیشن پہ موجود تھے۔ ہم سب گاڑیوں میں سوار ہو کر اس چھوٹے سے گھر میں پہنچے جس کا انتظام بطور خاص ہمارے دس روزہ قیام کے لیے آپی کے سسر یعنی ہمارے خالو جان نے کیا تھا۔ ہم نے خوشی خوشی تینوں کمروں میں اپنا سامان سیٹ کیا۔ اگلے روز آپی کا مایوں تھا۔

پیلے جوڑے اور موتیے کے پھولوں کا زیور پہن کر بہت پیاری، معصوم اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھیں۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ آپی ہمارے گھر میں بہت اہم تھیں۔ گھر میں ان کو سب سے زیادہ سنجیدہ اور دانا تسلیم کیا جاتا تھا۔ کسی بھی قسم کے صلاح و مشورے میں ان کی رائے کو اہم سمجھا جاتا تھا۔ ان کی کمی محسوس ہونا تو لازمی بات تھی پر آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی وجہ خوشی بھی تھی کہ بالآخر وہ اپنے گھر کی ہونے جا رہی تھیں۔

ابٹن کی رسم بخیر و عافیت ہو گئی۔ سب نے آپی کو خوب ابٹن لگایا اور ہلا گلا کیا۔ اس کے بعد ہر روز ہماری [illegible] کا آنا جانا لگا رہا۔ جن میں بطور خاص خالدہ، راشدہ [illegible] اور نبیلہ ہیں۔ آپی کو پورے چار دن مایوں بٹھایا گیا تھا اس لیے شادی والے دن انہوں نے خوب روپ نکالا۔ ہمارے ایک کزن کی بیگم فلک بھابھی نے آپی کا میک اپ کیا۔ وہ خود ایک اچھی بیوٹیشن ہیں۔ کیا خوب میک اپ کیا، سب نے ہی بہت تعریف کی۔ اناری کلر کے لہنگے میں آپی دلہن بن کر بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ انیس نومبر یعنی جمعۃ المبارک کے دن رات نو بجے نکاح کے رجسٹر پہ سائن کر کے آپی قرۃ العین چنا سے قرۃ العین فیصل چنا بن گئیں۔

فیصل رحمان بھائی ہمارے سب سے چھوٹی خالہ کے بیٹے ہیں۔ آپی کے ساتھ ان کی جوڑی چندے آفتاب چندے مہتاب لگ رہی تھی۔ اور پھر سندھی روایتی رسموں کے بعد رات کے تقریباً بارہ بجے کے قریب آپی کی رخصتی ہوئی۔ رخصتی کیا ہونی تھی ان کا تو بس ہاتھ پکڑ کر لے کر گئے۔ بقول ہماری خالہ جانی کے۔

"یہ رونے دھونے کا سین ہر شادی میں ہوتا ہے۔ لیکن اس بار اس سین کو ہم نے ڈراپ کر دیا ہے۔"

مینی آپی بچپن سے خالہ جانی کی فیورٹ بھانجی رہی ہیں اور اب تو ان کی بہو بن گئی تھیں۔ اس لیے وہ انہیں آنسوؤں کے سائے میں نہیں، بلکہ مسکراہٹوں کی روشنی میں اپنے گھر لے جانا چاہتی تھیں۔

اگلے دن کوئنز روڈ پر سپنا ہوٹل میں ان کے ولیمہ کی تقریب تھی۔ آپی کو جامنی اور کاپر کلر کا کنٹراسٹ شرارہ پہنایا گیا۔ یہ رنگ بھی ان پر خوب جچ رہا تھا۔ مجھے صبح ہی صبح خالہ جان نے فون کر کے کہا کہ جلد از جلد ہمارے ہاں پہنچو کیونکہ شادی ہال پہنچنے سے پہلے دولہا اور دلہن کا فریش لک میں ایک فوٹو سیشن ہونا تھا۔ جس کے لیے ہمیں مہک اسٹوڈیو پہنچنا تھا۔ لہٰذا ماہدولت جلدی جلدی تیار ہو کر خالہ جی کے گھر پہنچے پھر آپی اور فیصل بھائی کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچے۔ ہمارے ساتھ زینت خالہ اور فیصل بھائی کے دوست تنویر بھی تھے۔

بہرحال ولیمہ کی تقریب بھی خوب رہی۔ بہت مزہ آیا، خوب انجوائے کیا۔ خدا تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ میری بہن کی خوشیوں کو نظر بد سے بچائے اور ان کی جائز خواہشات کو پورا کرے۔ (آمین)

☆

شبیہہ العباس طبیعتاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے۔ جسے صنفِ نازک کا عزیز عزیزی بننا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پھوپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیرہ اور نمرہ، تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ، تنوی کا منگیتر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً ماوی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا سر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ [illegible] وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر کا بے دردی سے قتل ہوا تھا۔ اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جب جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبہ دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی، انیبہ کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو یہ بات جنت بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رونے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

11
گیارہویں قسط

گاڑی سے کچھ دیر پہلے ہی عبیر اور تنوی بیت کے قریب نصب فوارے کے پاس آ کر گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں کوک کے ٹن اور چپس کے پیکٹ تھے۔ آج کا سارا دن ہی بے حد تھکا دینے والا تھا۔ تین چار کلاسز اٹینڈ کر کے اس وقت تک ایسا لگنے لگا تھا جیسے سر پھٹ رہا ہو لیکن آفرین تھی عبیر پر جس کی مزاج اتنی تھکان میں بھی ماند نہ پڑی تھی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ کسی انسان کو کیا حق ہے کہ وہ اتنا خوبصورت لگے۔"

فوارے کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی وہ پرسوچ انداز میں کہہ رہی تھی۔ تنوی دیوار پر چڑھی بیٹھی تھی اس نے کس قدر چونک کر عبیر کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے گیٹ کیپر جلیل کو دیکھ رہی تھی جس کی رنگت اتنی کالی تھی کہ کبھی سیاہ لباس پہنتا تو چہرہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

"بھائی کالو کی بات کر رہی ہو؟" تنوی کو عبیر کے ذوق پر اچھا خاصا تعجب ہوا تھا۔

"مجھے کیا پاگل سمجھ لیا ہے۔" عبیر بری طرح بدکی۔ "میں اپنی بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" تنوی نے فوراً سمجھ داری سے سر ہلایا۔ "میں آج تک سمجھتی تھی تمہاری دور کی نظر کمزور ہے آج پتا چلا تمہاری تو قریب کی نظر بھی کمزور ہے۔"

"تو نو انخواہ۔" عبیر برا مان گئی۔ "دراصل میرے حسن سے جل کر تم ایسی فضول باتیں کر رہی ہو۔ توبہ کس قدر جل ککڑی سہیلی ملی ہے مجھے۔ بات اصل میں کچھ یوں ہے کہ تمہاری اپنی قریب کی نظر کمزور ہے۔"

"پروف پیش کیا جائے۔" تنوی نے شاہانہ انداز میں کہا تھا۔

"اس سے بڑا پروف اور کیا ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے منگیتر میں انٹرسٹ فیل (دلچسپی محسوس) نہیں ہوتا۔"

"عجیب منطق ہے۔ اور تمہیں کس نے کہہ دیا مجھے اپنے منگیتر میں انٹرسٹ فیل نہیں ہوتا۔"

"تو کیا ہوتا ہے؟" عبیر نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

تنوی نے چند لمحے سوچا پھر کندھے اچکا دیے۔ "پتا نہیں۔"

"ایک تو تمہارے اس "پتا نہیں" سے میں بہت عاجز ہوں بھئی انٹرسٹ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے۔ کوئی باہر سے آ کر تھوڑا ہی بتائے گا تمہیں اس میں دلچسپی ہے یا نہیں۔" عبیر نے اس کے آڑے ہاتھوں لیا پھر اسے خاموش دیکھ کر بولی۔

"میری بات مانو، اپنے گھر والوں سے کہو یہ منگنی ختم کر دیں۔ اگر اب ایک دوسرے میں دلچسپی نہیں ہے تو شادی کے بعد کیا خاک دلچسپی لیں گے۔ منگنی میں تو اچھے اچھوں کو رومینس سوجھنے لگتا ہے۔"

"شادی بہت دور کی بات ہے عبیر! جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

"نہیں تنوی، مجھے نہیں لگتا تم اس منگنی سے خوش ہو۔" عبیر نے پریقین لہجے میں کہا تھا۔

"اس میں خوشی کی کیا بات ہے؟ بھئی ہماری بچپن کی منگنی ہے اب بندہ کب تک خوشی مناتا رہے؟" تنوی نے بیزار ہو کر کہا۔

"کب تک نہ سہی لیکن کبھی کبھی تو منائے۔ لڑکیوں کے اوٹ پٹانگ سے منگیتر ہوتے ہیں پر اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ تمہارے پاس تو ایسا شان دار منگیتر ہے کہ کوئی لڑکی بڑے آرام سے تم سے حسد میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ تم نے تو کبھی بھولے سے بھی شبیہہ کا ذکر نہیں کیا۔" "پتا ہے تمہاری جگہ میں ہوتی تو سارا وقت اپنے منگیتر کی باتیں کرتی رہتی۔"

"اچھا ناں۔ چھوڑو کوئی اور بات کرو۔" تنوی نے قدرے بیزاری سے کہا عبیر نے ایک نظر اسے دیکھا وہ ابھی اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن فی الوقت اس بحث کو کسی اور وقت پر ٹال دیا۔

"آڈیٹوریم میں اینول ڈرامے کے سلسلے میں آڈیشن ہو رہے ہیں۔"

اس نے جوق در جوق لڑکیوں کو آڈیٹوریم کی طرف جاتے دیکھ کر کہا۔

"سنا ہے مس عائشہ نے پھر اپنا ارادہ بدل دیا ہے اب شیکسپیئر کے کسی ڈرامے کے بجائے کسی ہندی افسانے کو اسٹیج کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"بس پھر اس بار تو اینول فیسٹیول میں ڈرامے کا خیال ہی ذہن سے نکال دینا چاہیے۔" وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔

"تمہارا آڈیشن دینے کا ارادہ نہیں ہے؟ میں تو ماڈلنگ کے لیے ٹرائی کروں گی گھر میں تین چار بار کیٹ واک کی پریکٹس بھی کر کے دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے میں اتنی پرفیکٹ ہوں کہ اریج منصور اور عفت رحیم جیسی ٹاپ ماڈلز بھی میرے آگے پانی بھرتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے تنوی؟"

"سچ بولوں گی تو تم برا مان جاؤ گی۔ اس لیے میرا خیال نہ پوچھو۔" تنوی نے ہنس کر کہا۔ اس سے پہلے کہ عبیر کوئی جواب دیتی عروش نے تیز قدموں سے اس کی طرف آکر جارحانہ انداز میں اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

عبیر اپنی جھونک میں تھی اس طرح بازو کھینچے جانے پر بری طرح ہل گئی اور کوک ٹن اس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔

کیا بدتمیزی ہے عروش؟ کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی تمہیں۔ اگلی بار دس قدم دور رہ کر بات کرنا مجھ سے۔" عبیر نے غصے سے کہا۔ عروش ایک بار پھر ہنسی۔

"میں یہی سمجھانے آئی تھی اگلی بار تم کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ مجھے تم سے بات کرنے کی ضرورت پڑے۔ شوق تو مجھے بھی نہیں ہے تم سے بات کرنے کا۔"

"پھر میرا دماغ کیوں چاٹ رہی ہو؟" عبیر نے ناگواری سے کہا۔

"یہ جو دماغ ہے ناں۔ تمہارے پاس ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ اس کا استعمال ذرا کم کیا کرو ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔"

عبیر کا تو پتا نہیں البتہ [illegible] عروش نے تنوی کو ضرور ہراساں کر دیا تھا۔ اس نے بے اختیار عبیر کا بازو دبوچا۔ ایک تو یہ کہ وہ فطرتاً بزدل سی لڑکی تھی دوسرے۔ عروش سے دل ہی دل میں خائف بھی رہتی تھی۔ سٹپٹاتی نہیں تو کیا کرتی؟

"عروش! مائنڈ یور لینگویج۔"

"تمہیں بولنے کی اجازت نہیں ہے فی الحال صرف میری سنو۔ اگلی بار تم نے نمرہ کے یا کسی اور کے کان میرے خلاف بھرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں دیکھ لوں گی۔" عروش نے انگلی اٹھا کر خاصے خطرناک انداز سے کہا تھا۔

"مجھے دھمکا رہی ہو؟" عبیر کی تیوری چڑھ گئی۔

"جو بھی سمجھ لو۔" عروش نے بے نیازی سے کہا۔ "اور ہاں نمرہ کے سامنے جو بکواس تم نے کرنا تھی کر لی لیکن کالج کی کسی اور لڑکی تک اس قصے کی بھنک بھی پہنچی تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گی۔"

"اپنی اوقات میں رہو عروش! ابھی جا کر پرنسپل سے تمہاری شکایت کروں گی تو پتا چل جائے گا تمہیں۔"

"بھول کر بھی ایسی غلطی مت کرنا عبیر! بلند حوصلہ ہونا اچھی بات ہے لیکن اریوچ فل بندوں سے پنگا نہیں لینا چاہیے۔ میرا کام تھا تمہیں وارن کرنا۔ آگے تم اپنے اچھے برے کی خود ذمہ دار ہوگی۔ اب تک میں نے تمہیں نمرہ اور تنوی کی وجہ سے ڈھیل دی ہوئی تھی لیکن اگلی بار تم نے میرے خلاف کچھ بھی کہا تو میں بہت بری طرح سے

[illegible] ہی ڈول لے۔"

وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح اچانک چلی بھی گئی۔ عبیر غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔

"اس کا تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہو چکا ہے اس کا۔" اس نے غصے سے دانت کچکچائے اور [illegible] بھینچیں۔

"تم۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عبیر! تم نے عروش کی شکل نہیں دیکھی وہ جو کہہ رہی تھی ضرور کرے گی۔" اس نے خوف و سراسیمگی سے کہا تھا۔ عبیر کا پارہ اور بھی چڑھ گیا تھا۔

"تمہارا دماغ تو درست ہے تنوی! دھمکا کر وہ مجھے گئی ہے۔ مرنے والی تم ہو گئی ہو۔ میں نے کہا ناں وہ کچھ بھی نہیں کرے گی بس ہمیں ڈرانا چاہ رہی تھی۔ یہ جو عروش جیسے لوگ ہوتے ہیں ناں۔ ان کا زیادہ تر کام دھمکیوں کے سہارے ہی چلتا ہے۔ یعنی گیدڑ بھبکیوں کے سہارے۔ مگر کرتے کراتے یہ کچھ نہیں ہیں۔ مجھ سے لکھوا لو اس عروش میں بھی ہمت نہیں ہے۔ پوز زیادہ کرتی ہے اوپر سے نمرہ جیسی لڑکیوں نے اس کا دماغ ساتویں آسمان تک پہنچایا ہوا ہے۔ دفع کرو اسے۔ بیچاری کے تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں کالج میں۔ سکون سے نکال لینے دیتی ہوں۔ ورنہ تمہیں تو پتا ہے۔ میں خود بڑی خطرناک ہوں۔"

وہ اپنی جون میں واپس آچکی تھی اترا کر بولی۔

"گیٹ کھلنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ چلو تم بھی فٹافٹ آڈیشن دے لو۔"

اس پر تو جیسے عروش کی باتوں کا کوئی بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں نہیں دے رہی آڈیشن پچھلی بار بھی مجھے "دی" بنا کے اسٹیج پر چڑھا دیا تھا۔ اب پتا نہیں کیا لطیفہ سنائیں [illegible] میں نہیں جاتی۔" تنوی نے ہاتھ جھٹک کر کہا اسے سچ مچ عبیر کی حوصلہ مندی و بہادری پر رشک آرہا تھا۔ ورنہ خود اس کا [illegible] تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"تم کتنی بہادر ہو عبیر! مجھے تو عروش سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم تو پھر کل تو تمہاری زندگی اسی طرح دوسروں سے ڈر ڈر کے گزارتی رہنا۔ کبھی عروش جیسے بے کار لوگوں سے تو کبھی شبیہہ الطاف سے۔" عبیر نے ناک سکیڑ کر کہا تھا۔ تنوی اس نام پر چپ سی ہو گئی پھر بولی۔

"میں شبیہہ بھائی سے نہیں ڈرتی۔" کمزور سے لہجے میں اس نے کہا۔ "البتہ عروش سے واقعی ڈر لگ رہا ہے۔"

عبیر نے ایسے مکھی اڑائی جیسے تنوی کی بات اڑا رہی ہو۔

"گیٹ کھل گیا ہے۔ تم بھی دیکھو اگر وین آگئی ہے تو چلو ورنہ جتنی دیر کالج میں انتظار کرنا پڑے عروش سے پلیز [illegible] نہ کرنا۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔ شبیہہ بھائی مجھے لینے آگئے ہوں گے۔"

"عروش سے ڈرو۔ شبیہہ سے بھی ڈرتی رہو چاہو تو آس پاس کے دس اور لوگوں سے خائف رہو لیکن خدارا۔ اپنے منگیتر کو بھائی کہنا چھوڑ دو۔ کس قدر نان رومینٹک لڑکی ہو تم۔ تمہارا منگیتر بھی تمہیں بھائی کہنے سے منع نہیں کرتا؟"

عبیر اس کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی ہی ہانکے جا رہی تھی جبکہ تنوی کی جان عروش کی دھمکیوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

[illegible] عربی کہاوت ہے۔ "بہت زیادہ خاموشی کے پردے میں انسان اپنی عقل مندی چھپا رہا ہوتا ہے یا بے

وقوفی۔ "میرا سوال ہے کہ تمہاری اس آدھ گھنٹے کی مستقل خاموشی کو کیا سمجھا جائے۔ عقل مندی کو چھپانے کی کوشش یا بےوقوفی کی پردہ پوشی۔"

ماوی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو واپس بک ریک میں رکھتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں انیبہ سے پوچھا۔ وہ دونوں جناح لائبریری آئی ہوئی تھیں۔ ماوی اسے اصرار کر کے ساتھ لائی تھی اور انیبہ سارا راستہ یہ دیکھ کر حیران ہوتی رہی کہ ماوی بہت بہترین ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی پاکستان کی ہنگامی ٹریفک کو نہیں کوسا تھا نہ ہی لوگوں کی افراتفری پر اظہار رائے کیا تھا۔ مختلف لوکیشنز اور روٹس حیرت انگیز طور پر اسے ازبر ہو چکے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی شہر میں رہتی آئی ہو۔

ماوی نے جب اس سے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو انیبہ کو زیادہ تامل نہیں ہوا۔ صبح سے وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ ممی اور ڈیڈی کی سرد جنگ" اس کے لیے اکتاہٹ و بیزاری کا سبب تھی تو دوسری جانب ولید کی سرد مہری اور ولی کی حساسیت بھی پریشانی کی وجہ بنی ہوئی تھی اور تیسری طرف اس کا دل تھا جو ہر معاملہ کو توڑ مروڑ کر ایک ہی نقطے پر لا کر ٹھہرا دیتا تھا۔

کالج کی چھٹیاں تھیں۔ کوئی تفریح اسے میسر نہ تھی یہی سوچ کر اپنی بوریت کا تدارک کرنے ماوی کے ساتھ چلی آئی ویسے بھی ماوی بڑی دلچسپ شخصیت کی مالک تھی ہر دم ہنسنے ہنسانے والی اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشی کا پہلو تلاش کر لینے والی۔ انیبہ کو ایسا لگتا تھا کہ ماوی کے ساتھ زیادہ دیر تک کوئی اداس یا پریشان نہیں رہ سکتا اور یہ سچ بھی تھا۔ ابھی راستہ بھر وہ اسے دلچسپ قصے سنا سنا کر ہنساتی رہی تھی پھر اس نے انیبہ کو ٹھیلے سے گول گپے بھی کھلائے تھے۔ آئرلینڈ سے آئی ہوئی اس لڑکی کے لیے سڑک کنارے کھڑے ہو کر ٹھیلے سے گول گپے کھانا ایک زبردست ایڈونچر تھا انیبہ کو البتہ شرم آتی رہی۔

"کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ ڈیڈی نے دیکھ لیا تو بہت ڈانٹ پڑے گی تمہیں گول گپے کھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہیں گاڑی میں بیٹھ کر کھالو۔" اس نے بہت پس و پیش سے کام لیا لیکن ماوی بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی اسے باہر نکال کر ہی دم لیا۔

"اوہو۔ کچھ نہیں ہوگا بھئی۔ دانیال انکل نے کچھ کہا تو میں سنبھال لوں گی۔" اور اب وہ دونوں یہاں تھیں اور ماوی نے اس کی چند منٹ کی خاموشی کو آدھ گھنٹے پر محیط کر دیا تھا۔

"میں کچھ سوچ رہی تھی۔" انیبہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ماوی کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے ہنسنے لگی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"کچھ روز پہلے میں نے فیضان ماما سے یہی بات کہی کہ میں کچھ سوچ رہی ہوں تو وہ کہنے لگے۔ "اللہ کی شان ہے، اب آپ بھی سوچا کریں گی۔ میرا دل چاہ رہا ہے 'تمہاری بات پر میں بھی فیضان ماما کا ہی جملہ بولوں۔ ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی ہے کہ یہ سن کر تمہارا ری ایکشن کیا ہوگا۔"

"دوسروں کے جملے چرا کر بولتے تمہیں شرم نہیں آتی۔" انیبہ نے مسکرا کر اسے دیکھا 'وہ دونوں بے حد دھیمی آواز میں بات کر رہی تھیں۔

"اسے جملہ چرانا نہیں جملہ مستعار لینا کہتے ہیں ویسے بھی فیضان ماما کوئی غیر تو نہیں ہیں 'میرے اپنے ہیں' اُدھار لینے میں کیسی شرم؟" ماوی نے ڈھٹائی سے کہا۔

"اگر میں ماما سے کہتی۔ تو وہ ویسے ہی مجھے دے دیتے۔ آئی تھنک وہ دنیا کے بیسٹ ماموں ہیں۔ تم ان سے کبھی کچھ مانگو گی تو تمہیں بھی انکار نہیں کریں گے۔

"تمہیں ان سے کچھ کیوں مانگنا پڑے گی۔" انیبہ نے چڑ کر کہا۔ "ویسے بھی وہ تمہارے ماموں ہیں میرے نہیں۔"

"ہاں تو۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" ماوی نے معصومیت سے سر پر ہاتھ مارا۔ "تم کبھی ادھار مت مانگنا۔ میں نے ایک ٹرک پر پڑھا تھا۔ ادھار محبت کی قینچی ہے۔"

اس نے جتنی سادگی سے کہا تھا اتنی ہی بری طرح انیبہ نے سٹپٹا کر اسے دیکھا تھا۔ ماوی شریر سے انداز میں مسکرائی دوسرے ریک کی طرف چلی گئی۔

"یہ ماوی تو بھی بہت خطرناک لڑکی ہے۔ جس بات کا اعتراف میں خود سے بھی نہیں کر پا رہی 'وہ اس کو کیسے پتا چل گئی۔" انیبہ نے دل ہی دل میں سوچا پھر یوں بن گئی جیسے ماوی کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"میرا نہیں 'خیال تمہاری ضرورت کی کتابیں تمہیں یہاں ملیں گی چلو برٹش کونسل میں دیکھ لیتے ہیں وہاں بھی نہ ملیں تو فیروز سنز پر آرڈر بک کروا دیں گے۔"

"ہاں۔ وہیں چلتے ہیں۔" ماوی نے سابقہ انداز میں کہا تھا اس کے پاس جناح لائبریری اور برٹش کونسل کے علاوہ امریکن سینٹر کی ممبر شپ بھی موجود تھی۔

☼ ☼ ☼

"آگے ویگن خراب ہوئی ہے روڈ کلیئر ہونے اور ٹریفک جام کھلنے میں اچھا خاصا ٹائم لگ جائے گا۔"

شبیہہ نے واپس گاڑی میں آ کر بیٹھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ تنوی کو اس سے بھی زیادہ بیزاری محسوس ہوئی۔ ایک تو کالج کی دن بھر کی تھکن اوپر سے یہ ٹریفک جام اور اس سے بھی بڑی مصیبت کہ شبیہہ کے سامنے زبان بھی نہیں کھولی جا سکتی تھی۔ اتنی خوفناک سنجیدگی چہرے پر سجا کر رکھتا تھا ڈانٹنے میں تو ایک منٹ بھی نہ لگاتا۔

تنوی دل مسوس کر رہ گئی اور گاڑی سے باہر کوئی دلچسپی تلاش کرنے لگی۔

تب ہی اس کی نظر عروش پر پڑی اور وہ چونک سی گئی کچھ آگے فٹ پاتھ کے قریب عروش کھڑی تھی اور اپنے ساتھ کھڑے ہوئے لڑکے کو تنوی کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ رہی تھی۔ ہاں تنوی نے واضح طور پر دیکھا۔ عروش نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ خوف کی تیز سی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

"شبیہہ بھائی 'پلیز گاڑی چلائیں۔" اس نے سٹپٹاتے ہوتے شبیہہ سے کہا۔ شبیہہ اپنے موبائل کے ساتھ الجھا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر سرسری سا اسے دیکھا۔

"راستہ تو کھلنے دو۔"

"مم۔ مجھے گھر جانا ہے۔" تنوی نے اپنے خوف اور گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔" شبیہہ نے کال ملا کر موبائل فون کان سے لگالیا۔

تنوی کا دل جیسے کانوں میں دھڑکنے لگا تھا عروش اور وہ لڑکا اگلی گاڑیوں کے درمیان سے رستہ بناتے اسی طرف آ رہے تھے۔

تنوی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔ رنگت زرد پڑ گئی رونگٹے کھڑے۔

درمیان میں محض ایک گاڑی کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

تنوی نے بے ساختہ شبیہہ کا بازو دبوچا۔

"پلیز شبیہہ بھائی گاڑی جلدی چلائیں۔ مم مجھے گھر۔ جانا ہے۔"

"اتنی لمبی ٹریفک کی لائن لگی ہوئی ہے میں کیا کندھوں پر گاڑی اٹھا کر چلنا شروع کر دوں؟" شبیہہ نے جھنجلا [illegible]۔ تنوی نے اتنے وحشیانہ انداز میں اس کا بازو دبوچا تھا کہ ناخنوں سے بری طرح خراشیں لگی تھیں۔

"ناخن دیکھے ہیں اپنے؟ پتا نہیں لڑکیوں کو اوٹ پٹانگ فیشن کرنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔" وہ اس کی طرف دھیان دیے بنا بول رہا تھا، جبکہ تنوی کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ عروش اور اس لڑکے کا ہر اٹھتا قدم جیسے اس کے دل پر پڑ رہا تھا۔

"آج ہی جا کر ناخن نہ کاٹے تو میں تمہارے ہاتھ ہی کاٹ دوں گا۔" شبیہہ حسب عادت پتھر پھوڑ رہا تھا۔

تنوی کی خوف و سراسیمگی سے حالت بری تھی۔ اس وقت تو اور بھی مصیبت ہوئی جب عروش بالکل اس کے دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔ اسے لگ رہا تھا، ابھی وہ ہاتھ اٹھا کر شیشے پر دستک دے گی اور شبیہہ سے اس کی شکایت لگا دے گی۔ یہ حماقت کی حد تھی کہ یہ خیال آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تم لڑکیاں اتنے الٹے دماغ کی کیوں ہوتی ہو۔ اب ناخن کاٹنا ایسی بات ہے کہ اس پر رویا جائے۔" اس نے غصے کے ساتھ جھنجلا کر کہا تھا پھر اس پر نظر پڑتے ہی کھٹکا۔ وہ صرف رو نہیں رہی تھی اس کی رنگت بھی خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی۔

شبیہہ اپنے آپ میں گم رہنے والا انسان تھا۔ اس نے آج تک نہ کسی مزاج کے رنگ سے آشنائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ چہرے کی رنگت سے دل کا کوئی تار جوڑا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا' یہ لڑکی جو اس سے منسوب ہے جب اداس ہوتی ہے تو اس کا چہرہ کیسا لگتا ہے۔ خوش ہوتی ہے تو کتنی کلیاں چپکے سے اس کی رنگت میں کھل جاتی ہیں۔ آنکھوں کی جھکی ہوئی جھالر تلے کتنے ستارے چمکتے ہیں۔ ان آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہیں تو دل کے کس گوشے پر ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس کے خواب کیا ہیں۔ خواہشیں کیسی ہیں۔ وہ کیا سوچتی ہے۔ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے کبھی کوئی خواب دیکھا بھی نہیں۔ ہاں وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی البتہ وہ یہ ضرور جانتا تھا، جب بی پی لو ہوتا ہے تو اچھے اچھوں کی رنگت زرد ہو جاتی ہے۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" اس نے پوچھا تو بھی چلو بھلا کیوں روتی رہی۔ شبیہہ نے دوسری بار قدرے نرمی سے یہی سوال پوچھا لیکن تیسری بار یہ خود ساختہ نرمی جواب دے گئی۔

"سنائی نہیں دیتا تمہیں؟" تنوی نے ڈر کر جھٹ اثبات میں گردن ہلا دی۔

"پھر بتاتی کیوں نہیں ہو۔ یا سیکریٹری آکر بتائے گا۔" انداز ہنوز۔ اس نے پھر سر ہلا دیا۔

"سیکریٹری آکر بتائے گا؟" اس کا غصہ بڑھا۔ سر مشرق مغرب گھوما۔

"او خدا کی بندی! منہ میں جو ایک عدد زبان ہے' اس کو تھوڑی زحمت دے لو۔ یہ اشاروں کی زبان مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آتی۔" بیزاری سی بیزاری تھی۔

"طبیعت ٹھیک ہے۔" جواب تو دے دیا۔ حسیات البتہ بند شیشے کے باہر ہی لگی ہوئی تھیں۔

"فرینڈ سے جھگڑا ہوا ہے؟"

"بھوک لگی ہے؟"

"ٹیچر نے ڈانٹا ہے؟"

عموماً لڑکیاں ایسی ہی احمقانہ باتوں پر رویا کرتی ہیں تب ہی وہ پوچھتا چلا گیا۔

"تو پھر رو کس خوشی میں رہی ہو؟" مسلسل نفی میں ہلتے سر کو دیکھ کر وہ اور بھی چڑ گیا۔ تنوی کیا بتاتی اسے کون سی خوشی لاحق ہے عروش کسی عفریت کی طرح اس کے سر پر کھڑی تھی اور کسی بھی لمحہ ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف کا شیشہ بجانے ہی والی تھی۔

لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ ایسا کچھ بھی نہ ہوا' جیسا وہ سوچ رہی تھی۔ عروش چند لمحے ان کی کار کے پار رستے کے بعد دوسری طرف نکل گئی تھی۔ تنوی کے سارے وجود میں سکون و اطمینان کی لہر اتر گئی۔

"تم پاگل ہو گیا! ابھی رو رہی تھیں۔ ابھی ہنس رہی ہو' وہ بھی بلاوجہ۔" اسے مسکراتا دیکھ کر شبیہہ کو جیسے پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

"دراصل مجھے لمبے لمبے ناخن پسند ہیں شبیہہ بھائی۔" اسے بروقت بہانا سوجھ گیا اور شبیہہ کا دل چاہا اس کو اٹھا کر باہر ہی پھینک دے۔

"اتنی دیر سے تم اس لیے رو رہی تھیں کہ میں نے ناخن کاٹنے کو کہہ دیا۔" ایک چیز ہوتی ہے جسے عقل کہتے ہیں۔ اگر تم لڑکیاں کبھی کبھار اس چیز کا استعمال کر لیا کرو تو سامنے والا بیزار ہونے سے بچ جائے۔"

"کس قدر احمقانہ باتوں پر تم لڑکیاں ری ایکٹ کرتی ہو۔ بتاؤ ناخن ایسی چیز ہے کہ اس کا غم منایا جائے۔ کل کو کوئی منہ دھونے کا کہہ دے تو اس پر بھی رونے بیٹھ جانا۔ ناخن پسند ہیں۔ تم کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں پسند کر سکتیں۔" وہ دیر تک اسے لتاڑتا رہا۔ تنوی نے سب کچھ سر جھکا کر سنا۔

"آپ کو لڑکیوں کے بارے میں اتنی ساری باتیں کیسے پتا ہیں شبیہہ بھائی؟" بڑی دیر سے زبان پر رکا سوال اس نے سادگی سے پوچھا۔

جواباً شبیہہ نے اسے اتنی کڑی نظروں سے گھورا کہ تنوی نے گھبرا کر سر اتنا جھکا لیا جیسے سجدہ ریز ہونے والی ہو۔

"جنگل میں نہیں بستا میں۔ بڑی سوشل سرکل ہے میرا۔ بہت سی فرینڈز ہیں میری۔ بہنیں بھی ہیں پھر لڑکیوں کو سمجھنا کون سا مشکل کام ہے۔ انیس بیس کے فرق سے ساری ایک سے مزاج کی ہوتی ہیں۔ تم ہرگز اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ تم جیسا کارٹون میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔" ٹریفک بحال ہو گئی تھی۔ شبیہہ نے اتنی اچانک گاڑی آگے بڑھائی کہ تنوی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

وہ چپکی بیٹھی رہی۔ کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں البتہ ہلکی سی اداسی اس کے دل پر چھانے لگی تھی۔

"نہ میں آپ کی بہن۔ نہ فرینڈ۔ پھر آپ کی زندگی میں میری جگہ کہاں ہے؟" اس نے کڑھتے ہوئے سوچا۔ "آپ نے ٹھیک کہا' مجھے کوئی ڈھنگ کی چیز پسند نہیں آتی۔ آپ پسند ہیں' میری بدذوقی کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

اسے پھر سے رونا آنے لگا۔ لیکن ان آنسوؤں کو اس نے فوراً روک لیا۔ مزید کسی سوال جواب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

جلال کی ہادی سے اگلی ملاقات برٹش کونسل کی پارکنگ میں ہوئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ ہادی اور انعمہ اس وقت واپس جا رہی تھیں۔ ہادی کو اپنی ضرورت کی کتابیں مل گئی تھیں۔ کار کا لاک کھولتے ہوئے اس کی نظر جلال پر پڑی اور حسب عادت مسکرا کر اور پرجوش طریقے سے ہاتھ ہلا کر اس نے جلال کو وش کیا۔ جلال بھی حسب عادت دل ہی دل میں سٹپٹایا اور چہرے پر مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف آ گیا۔ ممکن ہے وہ اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتا۔ (جس کی توقع اس کی مروت کی ماری ہوئی فطرت سے تقریباً ناممکن ہی تھا۔) اگر انعمہ کو اس کی بات نہ دیکھ چکا ہوتا۔

کی مالک سلیک کر کے بے حد اصرار کے باوجود گھر نہ آنے پر اچھی طرح لتاڑ لینے کے بعد ہادی یکایک اس کی

بڑی اماں بن گئی۔ "تمہارے یہ دوست تو شکل سے اچھے بچے لگ رہے ہیں۔ اچھی بات ہے کہ تمہیں اچھے دوست مل گئے۔ آئی ایم ہیپی فار یو۔ لیکن اس روز پارک میں، میں نے دیکھا تھا اپنے اسی سڑیل دوست کے ساتھ تھے۔ بڑے افسوس کی بات ہے، تمہیں اپنے فائدے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے تمہیں۔ اچھے لوگوں کے دوست بھی اچھے ہونے چاہئیں۔ اس لڑکے جیسے مغرور اور سڑیل۔۔۔ اور۔۔۔ بدتمیز نہیں۔"

جوشِ جذبات میں وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی۔ شبیہہ العباس کی شکل اور بدتمیز لہجہ یاد آتے ہی اسے غصہ آنے لگتا تھا۔

"وہ میرا دوست نہیں ہے۔۔۔ بھائی ہے۔"

جلال کو اس کی نصیحتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک ہی راہ دکھائی دی تھی، سو بتا دیا، لیکن مادی کو اتنا صدمہ پہنچا کہ حد نہیں۔

"اوہ۔۔۔ اس کا مطلب یہ ظلم تمہارے ساتھ تقدیر نے کیا ہے۔ چہ چہ۔ بڑا افسوس ہوا، لیکن خراب کیا ہو سکتا ہے، انسان دوست کو چھوڑ سکتا ہے بھائی کو تو نہیں۔۔۔ چاہے بھائی کتنا ہی سڑیل، بدتمیز، مغرور کیوں نہ ہو، مجھے تم سے ہمدردی ہے جلال! گلے پڑے ڈھول کو تو بجانا ہی پڑے گا۔" اس نے گہری، متاسف و ہمدردی میں ڈوبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ شبیہہ ہرگز بھی ایسا نہیں ہے جیسا آپ سمجھتی ہیں، وہ تو بہت اچھا ہے۔" اس نے شبیہہ کا دفاع کیا۔

"دیکھا۔" مادی نے فوراً چہک کر کہا۔ "اچھے انسان کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی برائی برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ وہ تو پھر تمہارا بھائی ہے اسے Defend (دفاع) نہیں کرو گے تو کیا مجھے کرو گے۔"

جلال سے کوئی جواب نہ بن پڑا، ویسے بھی لگتا۔ نہیں تھا کہ مادی قائل ہوگی۔

"میرے دوست انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ میں چلتا ہوں۔" وہ انہیں خدا حافظ کہتا اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا۔

مادی ہونٹوں کے کنارے کانوں تک پھیلائے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ انیہ نے ٹوک ہی دیا۔

"اتنا کیوں مسکرا رہی ہو۔" مادی نے چونک اسے دیکھا، پھر متبسم لہجے میں بولی۔

"جلال کو دیکھ کر پتا نہیں مجھے اتنی خوشی کیوں ہوتی ہے؟"

"ہیں۔۔۔!" انیہ نے ٹھٹک کر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ تو کسی اور ہی بات کی علامت لگ رہی ہے۔" اس پر مادی نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا اور اسے چڑاتے ہوئے بولی۔

"تمہاری غلطی نہیں ہے۔ سیانے کہتے ہیں جو اپنے دل کی حالت ہو، انسان کو ویسی ہی علامات دوسروں میں نظر آتی ہیں۔" اور حسبِ توقع انیہ چڑ بھی گئی۔

"مادی کی بچی! بخشو مجھے۔"

"اچھا بابا! چھوڑ دیا، کیا یاد کرو گی۔" اس نے چند لمحے سوچا، پھر احسان کرنے والے انداز میں بولی۔

"تم نے ابھی تک شہوز کو دیکھا نہیں ہے۔ دیکھا ہوتا تو جلال کے بارے میں کبھی شک کا شکار نہ ہوتیں۔ جلال ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اسے شہوز پر ترجیح دی جائے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم جلال کو کیسے جانتی ہو؟" اس نے کچھ خیال آنے پر پوچھا۔ انیہ گڑبڑا سی گئی۔

"ہم ایک ہی ٹاؤن میں تو رہتے ہیں، ولید سے اچھی سلام دعا ہے ان کی۔" اس نے فوراً بات سنبھالی۔ جلال

۔۔۔ اپنی تعلق داری واضح کرنے کے لیے اسے شبیہہ کا تعارف بھی کروانا پڑتا اور یہ ایک لمبی چوڑی بلکہ الجھی ہوئی داستان تھی جسے وہ مادی کو سنانا نہیں چاہ رہی تھی۔

"ایک بات ہے مادی! اگر جلال بھائی کو شہوز پر فوقیت نہیں دی جا سکتی تو پھر تمہیں ان کو دیکھ کر خوشی کیوں نہیں ہوتی؟" اس نے بڑی سہولت سے زیر بحث موضوع سے توجہ ہٹا ہی دی تھی۔

"بڑا اچھا سوال پوچھا ہے تم نے۔" گاڑی کو مین روڈ پر لاتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے سراہا۔ "اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جلال نے میری ممی کی مدد کی تھی۔ محسن ہے وہ ہمارا۔ اس لیے میں اسے بہت Appreciate (قدر کرتی ہوں۔) کرتی ہوں اور دوسرا جواب یہ ہے کہ مکی ماؤس اور پنک پینتھر کو دیکھ کر میں خوش ہوتی ہوں۔"

"بہت ہی بدتمیز ہو تم تو مادی۔" انیہ جو توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ پنک پینتھر اور مکی ماؤس کے نام سن کر بولی، جبکہ مادی بہ خوش دلی سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ارسل اور واثق سینے پر بازو باندھے بالکل خاموشی و سنجیدگی کے ساتھ بے حد کڑی نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

جلال نے فوراً دفاعی انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

"اتفاقاً مل گئی تھی۔ اب کیا اگنور کر کے تم لوگوں کے ساتھ آجاتا؟ یہ تو بڑی بدتہذیبی کی بات ہوتی۔"

"لائبریری جانا ہے، لائبریری جانا ہے، صبح سے شور مچا رکھا تھا جناب نے۔ پتا چل گیا ہمیں اتنی بے چینی کیوں تھی لائبریری آنے کی۔"

"اور کیا۔۔۔ پڑھائی کا بہانہ کر کے ملاقاتوں کا اہتمام کرنا کہاں کی تہذیب ہے؟" واثق نے بھی ناراضی سے کہا۔

"اور اگر ملاقات ہی کرنا تھی تو ہمیں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی میرے بھائی! ڈیٹ کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں، لیکن خیر تیرا پہلا پہلا چانس ہے۔ لیکن ہم ہیں نا، یاروں کے یار، سب سکھا دیں گے تمہیں۔" ارسل نے جلدی سے احسان کرنے والے انداز میں کہا۔

"خدا کو مانو ارسل!" جلال نے بدک کر دہائی دی۔ "وہ کوئی میری ڈیٹ ویٹ نہیں ہے۔ اپنے کسی کام سے آئی ہوئی یہاں۔۔۔ بتا تو رہا ہوں اتفاقاً ملاقات ہوئی ہے ہماری۔"

"پکی بات ہے؟" ارسل نے آنکھیں سکوڑ کر پوچھا۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا ارسل!" جلدی نے بیزاری سے کہا۔

"اچھی بات ہے، جب تم سیریس ہی نہیں ہو تو فکرمندی کیسی؟ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا اس لڑکی کی بے تکلفی سے متاثر نہ ہو جانا۔ یہ جو باہر سے آئی ہوئی لڑکیاں ہوتی ہیں نا، ان کی اخلاقیات کا معیار کچھ اور طرح کا ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ لوز کریکٹر یا کرپٹ ہوتی ہیں، لیکن ہماری دیسی بچیوں کے لیے جو بے تکلفی کی انتہا ہوتی ہے، یہ وہاں سے اسٹارٹ پکڑتی ہیں۔ آیا کچھ عقل شریف میں؟"

"مجھے سمجھا رہے ہو یہ ساری باتیں؟ بچہ ہوں میں، نہ ہی ناسمجھ ہوں اور میں نے کون سا اس سے رشتے داری نبھانی ہے کہ ان باتوں کا خیال کروں۔ راہ چلتے کبھی ملاقات ہو گئی تو ٹھیک، ورنہ۔۔۔ نہ سہی۔" جلال نے شانے اچکا کر کہا۔

"ہوں۔" دونوں سر ہلانے لگے۔ "یہاں سعدی ہوتا تو صحیح لطف آتا۔ وہ اس لڑکی کے لیے بہت سنجیدہ ہے۔"

واثق نے کہا۔

"او خدارا۔ اب سعدی کو نہ بتا دینا۔ میں لائبریری میں ہادی سے ملا تھا۔ جان کو آ بنائے گا وہ میری۔" جلال نے منت بھرے انداز میں کہا۔

"تو کیا ہوا۔" واثق شریر انداز میں بولا۔ "ساری Explanation (وضاحت) اسے بھی دے دینا۔"

"اگر کسی لڑکی سے میں سر راہ ملتا تو مجھے یقین ہے اتنی وضاحتیں اپنی بیوی کو بھی نہ دینا پڑتیں۔ جتنی تم دوستوں کو مطمئن کرنے کے لیے دینا پڑتی ہیں۔" جلال نے جل کر کہا تھا واثق اور ارسل قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

☼ ☼ ☼

انیبہ کالج سے واپس آئی تو بے حد بیزار تھی۔ لیکن برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب سفید پتھر کے بے حد خوب صورت گملے رکھے دیکھ کر اس کی ساری بے زاری اڑنچھو ہو گئی۔

"بونسائی۔" دبے دبے سے جوش کے ساتھ وہ گملوں کی طرف لپکی، وہ ہمیشہ سے یہ پلانٹ خریدنا چاہتی تھی، لیکن ہر بار ہی کسی نہ کسی وجہ سے اس کا شوق پورا ہونے سے رہ جاتا تھا۔ پھر کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ باغبانی سے اچھی خاصی دلچسپی ہونے کے باوجود اس کا شوق ابھی بہت ابتدائی مراحل میں تھا۔ اس بات کا اندازہ اسے فیضان سے مل کر ہوا تھا۔ وہ جو چار پودے لگا کر یہ سمجھتی تھی کہ باغبانی پر عبور حاصل کر چکی ہے اور اسے کوئی مات نہیں دے سکتا فیضان سے دو چار بار کی تفصیلی گفتگو کے بعد اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔

اس نے اپنا شولڈر بیگ اور فولڈر سیڑھیوں پر رکھ دیا اور اشتیاق سے پودوں کا جائزہ لینے لگی۔

"انو باجی! آج آپ جلدی نہیں آ گئیں۔" شازیہ انیکسی کی طرف سے چلی آ رہی تھی۔

"تم کہو تو واپس چلی جاتی ہوں۔" انو نے مصروفیت سے جواب دیا۔

"ہائے نا باجی! واپس کیوں جانا ہے۔" شازیہ نے ہنس کر ایسے جواب دیا جیسے انیبہ اپنے نہیں اس کے گھر آئی بیٹھی ہو۔

"ایک بات تو بتائیں انو باجی! ان پودوں کی خدمتیں کر کے آپ کو ملتا کیا ہے، نرے سبز پتے ہی پتے۔ پھول لگیں تو وہ بھی کبھار کوئی پھل لگتا ہو تو بندہ ہی کھا کر خوش ہو لے۔ ہک ہا ہمارے گاؤں میں تو ایک سے ایک پھل ملتا تھا۔ کبھی لنگڑا تو کبھی چونسا آم کھانے کو ملتا تھا، ہر ایسے یا ئینو موسمی۔ شہتوت اتنے میٹھے۔"

شازیہ جھومتی جا رہی تھی اور چٹخارے لیتی جا رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے آنکھیں بند کیے تصور ہی تصور میں اپنے گاؤں پہنچی ہوئی ہو ذرا دیر کو آنکھیں کھولیں تو پتا چلا انیبہ گملوں کے قریب پنجوں کے بل بیٹھی بری طرح اسے گھور رہی ہے۔

"تمہاری لن ترانی ختم ہو گئی ہو تو یہ بیگ اندر لے جاؤ اور میرے لیے جوس لے آؤ۔"

"کیا ختم ہو گئی؟" شازیہ نے الجھ کر پوچھا انیبہ نے سر پیٹ لیا، پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

"کچھ نہیں، تم اپنے ننھے دماغ پر زور نہ ڈالو۔ بیگ اٹھاؤ اور جوس لے کر آؤ۔"

شازیہ ننھے دماغ والی بات پر خفا ہو گئی اور چپ چاپ بیگ اور فولڈر اٹھا کر اندر جانے لگی۔

"ارے ہاں۔ سنو شازیہ! یہ پودے کون لے کر آیا ہے؟"

"آپ کے کالج جانے کے بعد فیضان صاحب لے کر آئے تھے۔ کہہ رہے تھے، انیبہ سے کہنا اپنی مرضی سے رکھوا لیں اور تین کتابیں بھی دے کر گئے ہیں آپ کے لیے۔" شازیہ نے اسی خفگی بھرے انداز میں بتایا اور اندر چلی گئی۔ انیبہ کا دل یک بیک مسرت اور صدمے سے دھڑکا اور پھر ذہن ہر سوچ سے خالی ہو گیا۔ یوں جیسے کچھ دیر کے لیے وہ کچھ بھی نہ سوچ رہی ہو۔

پتا نہیں فیضان کا یہ عمل اسے اچھا لگا تھا یا برا؟

"انہوں نے تو مجھے Yellow goddess دینے کا وعدہ کیا تھا۔" جس وقت وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر کی طرف جا رہی تھی اسے خیال آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اتنی سی مدد چاہیے تمہاری۔ دوست کی اتنی سی مدد نہیں کر سکتے۔"

سعدی نے جذبات سے چور آواز میں کہا۔ جلال اس وقت اپنے آئس کریم کپ پر جھکا ہوا تھا اور ہمہ تن گوش اسے سن رہا تھا۔ لیکن جملہ مکمل ہونے تک حیرانی و بے یقینی کا ایسا زبردست جھٹکا لگا کہ منہ کی طرف چمچہ لے جاتا ہاتھ منہ کے راستے میں ہی رک گیا۔ چند لمحے سر جھکائے اس بات پر غور کرنے کے بعد اس نے اسی انداز میں سعدی کو دیکھا جو بہت سنجیدہ لگ رہا تھا اور جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آر یو ان یور سینسز!" (تم ہوش میں تو ہو؟) اس کے لبوں سے بس اتنا نکلا۔

"اس میں آؤٹ آف سینس ہونے والی کیا بات ہے؟" سعدی نے کندھے اچکا کر پوچھا۔

"اچھی لگتی ہے وہ مجھے، اگر میں اس سے شادی کرنے کا سوچ رہا ہوں تو اس میں غلط بات کیا ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ جلال کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ سعدی درست کہہ رہا تھا، کسی لڑکی سے شادی کا سوچنا غلط نہیں تھا۔ غلط وہ میں [illegible] تھا جو سعدی اس سے کر رہا تھا۔

وہ اس سے ملنے اسپتال آیا تھا، اس وقت سعدی کسی بات پر جلا بیٹھا تھا اس نے اپنے ساتھ جلال کو باہر چلنے کے لیے کہا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

سعدی ان دنوں [illegible] رہا تھا اور ایک پرائیویٹ اسپتال میں مقیم تھا۔ جلال کو کہیں باہر جا کر بیٹھنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں اسپتال سے نکل کر ایک آئس کریم پارلر آ کر بیٹھ گئے۔

"ارسل بتا رہا تھا، تم لائبریری گئے تھے، ہادی سے ملنے؟" جلال کا دماغ بھک سے اڑا۔ ارسل نے بالآخر اپنا کام دکھا دیا تھا اس قدر تاکید کے باوجود۔

"میں نے اسے بتایا تھا، اتفاقاً ملاقات ہو گئی تھی، لیکن پتا نہیں اس میں یہ عورتوں کی طرح لگائی بجھائی کی عادت کہاں سے آ گئی ہے۔" جلال نے جھنجلاتے ہوئے مگر وضاحتی لہجے میں کہا تھا۔

"یار جیلی! تمہاری تھوڑی سی فیور چاہیے۔ میں چاہتا ہوں تم ہادی کی ممی کے پاس جاؤ اور ان سے میری اور ہادی کی شادی کی بات کرو۔" اس نے جتنے اطمینان و سکون سے کہا تھا اتنا ہی جلال ہکا بکا رہ گیا اور اس کے تاثرات دیکھ کر سعدی نے کہا۔

"اچھی لگتی ہے وہ مجھے۔ اگر میں اس سے شادی کرنے کا سوچ رہا ہوں تو اس میں غلط بات کیا ہے۔"

"غلط بات کیا ہونی ہے، میری طرف سے تم ہادی کو چھوڑ جس سے مرضی شادی کا سوچو، لیکن مجھ سے یہ کیوں چاہتے ہو کہ ان کی بیٹی کی قربانی کے لیے چھری میرے ہاتھوں ثمینہ آنٹی کے گھر تک پہنچے۔" جلال نے جھنجلا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" سعدی برا مان گیا۔ "ان کی بیٹی مجھ سے شادی کر کے قربان ہو گی؟ یار! حد ہے کیسے سنگ دل دوست ہو تم جو میری فیلنگز ہی نہیں سمجھ رہے؟" سعدی نے روٹھے پن سے کہا۔

"میرے کہنے کا مطلب تھا شادی ہی کرنی ہے تو گھر کے کسی بزرگ کو بھیجو' میں اچھا گڈول ہو تمہارا رشتہ لے کر جاتا۔ دوست ہوں تمہارا ابا تو نہیں۔" جلال نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پہلے تم جا کر میرے لیے راہ تو ہموار کرو' تب ہی تو ابا سے بات کروں گا۔ ان کو کیا خبر سعدی کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کس خاندان کا ہے۔" سعدی نے کہا۔

"کسی کے لیے راہ کیسے ہموار کرتے ہیں؟" جلال کی معلومات اس معاملے میں صفر تھیں۔

"اوہو... اب پورا اسکرپٹ لکھ کر دوں کیا؟" سعدی سلگا۔

"جا کر ان کو میرے بارے میں بتانا۔ میری تعریفیں کرنا اور یہ کہ میں ان کی بیٹی کے عشق میں پہلی نظر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی شادی مجھ سے کروا دیں' ان کی بیٹی ساری زندگی خوش رہے گی۔ میں اس کے لیے آسمان سے ستارے بھی توڑ کر لا سکتا ہوں۔ اگر وہ کہے گی' کے ٹو کی چوٹی پر جمی ہوئی برف کا گولا گنڈا بنا کر کھانا ہے تو میں اسے کے ٹو سے برف بھی لا دوں گا' حتی کہ اگر وہ کہے گی' افریقہ کے جنگلات سے وہ نایاب جڑی بوٹی ڈھونڈ کر لا دو جسے کھا کر عورتیں زیادہ سے زیادہ عرصہ حسین اور خوب صورت رہ سکتی ہیں تو یقین مانو' میں وہ جڑی بوٹی تلاش کرنے بھی..."

"بس۔" جلال نے یک دم ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ "اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہو' تمہارا خیال ہے اتنی illogical (غیر منطقی) باتیں سن کر وہ اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرنے پر راضی ہو جائیں گی؟ ہرگز نہیں۔"

"یہ ہی تو تمہارا اصل کام ہے۔" سعدی نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں ان کو قائل کرنا ہو گا' میں بتا رہا ہوں جیدی! وہ مجھے نہ ملی تو میں... میں مر جاؤں گا۔" سعدی نے قطعیت سے کہا تھا۔

جلال سر پکڑ کر بیٹھ گیا' اس کے دوست ہر بار اسے مشکل میں ڈال دیتے تھے۔

"اور وہ تمہاری منگیتر؟" اس کو اچانک یاد آیا۔ "مجھے یاد آیا' تمہاری منگنی تو بچپن میں ہو چکی تھی۔"

"پہلی نظر کی محبت کے مقابلے میں بچپن کی منگنی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔" سعدی نے کہا۔ "اگر ایک بار مجھے تم ان سے ملوا دو تو میں اس منگنی کا پتا ہی صاف کر دوں گا۔" "میرے ماں' باپ نے بچپن میں منگنی کر کے ظلم کیا تھا' میں اس ظلم کے خلاف بغاوت کروں گا۔" اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے انقلابی انداز میں کہا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا سعدی! ثمینہ آنٹی مانیں گی۔ دیکھو' میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا' لیکن اس پہلو کو بھی تمہیں مد نظر رکھنا چاہیے کہ ان میں اور تم میں بہت فرق لگتا ہے' ان کا وے آف لیونگ (زندگی گزارنے کا طریقہ) تمہارے خاندان سے بہت مختلف ہے' پھر تم لوگ گاؤں کے رہنے والے ہو' وہ مغربی آزادانہ ماحول کی پلی بڑھی ہے۔" جلال نے عقل مندی کے ساتھ اسے آئینہ دکھانا مناسب سمجھا تھا۔

"میں اسے پاکستان سے باہر لے جاؤں گا۔" سعدی نے تیزی سے کہا تھا۔ "وہ جیسا لائف اسٹائل چاہے گی میں اسے فراہم کروں گا۔ بس مجھے وہ مل جائے جیدی! مجھے لگتا ہے اس کے بغیر زندگی بہت مشکل ہو گی' پلیز میری مدد کرو۔"

اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا' جلال سخت مشکل میں پھنس گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" بالآخر جلال نے اس کے سامنے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "میں صرف ان سے بات کر کے دیکھوں گا' وہ راضی ہو گئیں تو ٹھیک' ورنہ دوسری بار میں ان سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" سعدی خوش ہو گیا۔ "وہ انکار کریں گی ہی نہیں۔ تم خود بتاؤ' کیا میں ایسا ہوں کہ کوئی لڑکی میرے لیے انکار کر سکے۔" سعدی نے گردن اکڑا کر اور اترا کر کہا تھا۔

جلال نے بغور اسے دیکھا۔ سچ بول کر وہ سعدی کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا' اس لیے خاموشی سے اپنے کپ پر

☼ ☼ ☼

"[illegible] کے لیے آپ کو تھینکس بولنا چاہ رہی تھی۔"

انیبہ نے فیضان سے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں یہاں کھڑا ہوں' آپ کو جو بولنا ہے اطمینان سے بول لیجیے۔" فیضان نے کلائی میں ریسٹ واچ دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور اپنی نرم مسکراہٹ سمیت اس کی طرف دیکھنے لگے۔ انیبہ بری طرح پچھتائی' وہ [illegible] سے تیار کہیں جانے کے اہتمام میں تھے' لگ بھی اچھے رہے تھے۔ (برے کبھی لگے ہی نہیں) اس پر شریر سی چمک آنکھوں میں سموئے اس پر نظریں ٹکائے کھڑے تھے۔

[illegible] شان دار ہو اس پر سے خوش مزاج و خوش اخلاق بھی ہو تو کم عمری کے لیے بڑا مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ انیبہ کے اعتماد کے پردے میں سلوٹیں پڑنے لگیں۔

"آپ نے بہت خرچا کر دیا۔ اتنا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اپنے بکھرتے ہوئے اعتماد کو جمع کرنے کی کوشش میں اس کے لبوں سے یہی جملہ نکلا۔

"یہ شکریہ تو نہیں ہے' میرا خیال ہے اسے جملۂ اعتراض کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔" فیضان نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"آپ بہت مشکل اردو بولتے ہیں۔" انیبہ نے بے ساختہ کہا' فیضان ہنس دیے۔

"[illegible] اردو دان نے تو اس بات پر ہنسے۔"

"کاش! میں بھی ہنس سکتی۔" انیبہ نے روہانسی ہو کر دل ہی دل میں سوچا۔

فیضان نے اس کے جھکے سر کو بغور دیکھا' پھر مزید ستانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"تمہیں بونسائی پسند نہیں ہے کیا؟"

"پسند ہے' لیکن آپ نے تو کہا تھا مجھے Yellow goddes دیں گے؟"

فیضان پل بھر کے لیے خاموش ہو گئے' پھر بات پلٹتے ہوئے کہنے لگے۔

"ہاں Yellow goddes بھی دوں گا' گملے ابھی تک وہیں پڑے ہیں جہاں میں نے رکھوائے تھے۔ مجھے لگا تمہیں پسند نہیں آئے۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے' پسند تو بہت آئے ہیں' تب ہی تو شکریہ کہنے آئی ہوں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے بونسائی کے بارے میں زیادہ نہیں پتا' یہ بھی نہیں کہ اسے زیادہ دھوپ میں رکھتے ہیں یا کم' اسی لیے میں نے انہیں وہیں پڑا رہنے دیا کہ آپ خود ہی ٹھیک جگہ پر رکھوا دیں۔"

"ہاں ضرور۔ یہ تو میں کر دوں گا۔" فیضان نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا تھا۔ "اور تمہیں شکریہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے' دوستوں میں شکریہ جیسی کوئی فارمیلیٹی نہیں ہوتی۔"

"میں آپ کی دوست تو نہیں ہوں۔" اس نے بے ساختگی سے کہا۔ فیضان ٹھٹک سے گئے' عام سا جملہ' لیکن خاص' یا شاید انہیں ہی لگا' یہ چھوٹی سی لڑکی انہیں کیوں بار بار چونکا دیتی تھی؟

انہوں نے فوراً سر جھٹک کر اس خیال کو جھٹکا جو فوراً سے پیشتر ان کے ذہن میں جگہ بنا رہا تھا۔

"ہاں... تم دوست تو نہیں ہو' تم تو سہیلی ہو' لڑکیوں کے لیے یہ ہی لفظ استعمال کرتے ہیں نا۔" انہوں نے یوں [illegible] جیسے بچوں کو بہلاتے ہیں۔

"مجھے تمہارے لان میں بونسائی کی کمی تو لگی تھی اس لیے آیا۔ چھ بلب اور ٹیوبز بھی آرڈر کیے ہیں میں نے تمہارے لیے کیا وہ بھی لے کر تم شکریہ کہو گی؟ ایسی فارمیلٹیز میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اچھا لگے گا اگلی بار تم شکریہ نہ کہو ویسے بھی میری دانیال صاحب سے بات ہوئی تھی انہوں نے ہی مجھے کہا تھا اگر میں کچھ پودے تمہیں یہاں لگوانا چاہوں تو لگوا دوں۔ میں پودوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ اچھا ہے جب تک پاکستان میں ہوں، میری دلچسپی کا سامان بھی رہے گا۔"

انہوں نے اوک بھر پانی اس کے دل کی خوشی پر ڈالا اور اسی طرح مسکراتے ہوئے یہ جا وہ جا۔

انیبہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی، اتنی سی دیر میں خدا جانے کیا کیا سوچ چکی تھی۔ "ہونہہ۔ دل خوش فہم تیرا بیڑا غرق۔" وہ گہری سانس بھرتی جالی کا دروازہ دھکیلتی اندر آگئی۔

مادی صاحبہ حسب معمول صوفے پر نیم دراز پیٹ پر کشن رکھے، کشن پر لیپ ٹاپ آن کر کے کھٹا کھٹ کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہی تھیں۔ ٹی وی پر کوئی بور قسم کا سیاسی ٹاک شو چل رہا تھا تو تیسری جانب میوزک سسٹم پر ایک سو فٹ سی دھن لگا رکھی تھی۔

"آیئے۔ آیئے انیبہ صاحبہ! آج آپ کو ہماری یاد کیسے ستائی؟" لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے اس نے مسکرا کر چڑایا تھا۔

"پہلے تم بتاؤ ٹائپنگ کر رہی ہو، ٹاک شو دیکھ رہی ہو یا میوزک سن رہی ہو۔"

"جب سارے کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں تو کوئی ایک کام کیوں کیا جائے، آؤ بیٹھو۔" اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا پھر دوسرا ریموٹ اٹھا کر میوزک سسٹم بھی آف کر دیا۔

"چائے پلاتی ہو تو بیٹھتی ہوں۔"

"نہیں پینی تو تمہیں خود پڑے گی البتہ چائے بنانے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔" مادی نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

"اب بیٹھ کیوں رہی ہو جاؤ چائے بناؤ۔" انیبہ کو بیٹھتے دیکھ کر اس نے کہا۔

"میں مہمان ہوں؟" انیبہ نے گھور کر کہا۔

"کیسی تکلف والی باتیں کر رہی ہو انیبہ! میں تمہیں مہمان نہیں سمجھتی، جاؤ شاباش چائے بنا لاؤ۔" مادی نے بے تکلفی سے کہا۔

"اور ہاں۔ فریزر میں چکن نگٹس ہوں گے، ذرا وہ بھی فرائی کر لینا۔"

"اگر تم کہو تو دوپہر کے کھانے کے برتن بھی دھو دوں اور کچن کی ہفتہ وار صفائی بھی کر دوں۔" انیبہ نے جل کر پوچھا، مادی جلدی سے بولی۔

"ارے نہیں اتنا کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

انیبہ گہری سانس بھرتی کچن میں آگئی اور کچھ دیر بعد جب پوری ٹرے سجا کر واپس آئی تو مادی صوفے پر پیر اوپر رکھ کر بیٹھی اس کی منتظر تھی۔

"شاباش۔ تم نے تو سارا کام بہت جلدی ختم کر لیا۔" مادی نے مسرور ہو کر کہا۔ ساتھ ہی ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر میز پر رکھ دی اور ایک نگٹ کھاتے ہوئے بولی۔

"ثمینہ آنٹی کہاں ہیں؟"

"سو رہی ہیں، اور تم اتنا سوچ سوچ کر کیوں کھا رہی ہو، اس اسپیڈ سے کھاؤ گی تو دو نگٹس کھانے تک میں پوری پلیٹ صاف کر دوں گی۔"

”تم کھاؤ، مجھے بھوک نہیں ہے۔“ انیبہ نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا تو ہادی کسی قدر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
”کیا بات ہے، پریشان لگ رہی ہو؟“
”نہیں... پریشانی کیسی؟“ وہ سادگی سے ہنس دی، پھر پُرسوچ انداز میں پوچھنے لگی۔
”ہادی! تمہیں پتا ہے، جب محبت ہوتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟“
”تم بتاؤ، کیسا محسوس ہو رہا ہے آج کل۔“ ہادی کو تو موقع چاہیے تھا، فوراً شرارتی انداز میں پوچھنے لگی۔ انیبہ گڑبڑا گئی۔
”کیا مطلب؟“
”ارے مطلب وطلب چھوڑو، جو دل میں چل رہا ہے وہ بتاؤ۔“ وہ چہکی اور انیبہ سچ مچ اس کشمکش سے گھبرا چکی تھی۔ ایک آن میں اس نے فیصلہ کیا اور ہادی کے سامنے دل کا دامن خالی کر دیا۔
”یہ طے ہے کہ وہ مجھے اچھے لگتے ہیں، لیکن محبت۔“ اس نے تذبذب سے کہا اور ہیر کا ناخن کھرچنے لگی۔
”اس میں اتنا سوچنے کی کیا بات ہے بھئی۔ یہ محبت ہی ہے۔“ ہادی نے اصرار سے بلکہ پُروثوق انداز میں کہا تھا۔
”تمہیں کیسے پتا؟“
”مجھے سب پتا ہوتا ہے یار!“ ہادی نے اترا کر کہا۔ ”جیسے مجھے یہ پتا تھا کہ تم فیضان ماما میں انٹرسٹ لے رہی ہو، ہادی نام ہے میرا۔ ممی کہتی ہیں، یہ تو اڑتی چڑیا کے پر بھی گن سکتی ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا انیبہ میڈم! آپ کے دل کی داستان تک نہ پہنچوں۔“
”ثمینہ آنٹی طنز میں کہتی ہوں گی۔“ انیبہ نے کہا۔
”میں تو تعریف میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ اطمینان سے کندھے اچکا کر بولی۔
”اچھا اپنی تعریفیں کرنا بند کرو اور یہ بتاؤ، اب میں کیا کروں؟“
”کرنا کیا ہے؟ سیدھے سیدھے جا کر فیضان ماما کو بتا دو کہ تم انہیں پسند کرتی ہو۔“ اس نے باسہولت حل بتایا، انیبہ فوراً نفی میں سر ہلانے لگی۔
”میں نہیں کہہ سکتی۔“
”وجہ؟“
”مجھے ڈر لگے گا۔“ انیبہ نے سر جھکا کر خفت سے کہا۔
”میرے ماما سے آئی لو یو بولنا ہے یا ہٹلر سے۔ جو ڈر لگے گا۔“ ہادی سلگی۔
”پہلے کنفرم تو ہونے دو، یہ محبت ہے یا محض پسندیدگی۔“ اس نے لاچاری سے کہا تھا۔
”میری بات مان لو، یہ محبت ہی ہے۔“ ہادی تحمل سے بولی۔
”تمہیں کیسے پتا، جبکہ ابھی تک مجھے بھی نہیں پتا۔“ انیبہ نے سرعت سے پوچھا تھا۔
”میرے ہی جیسے کسی ذہین فلاسفر نے کہا ہے محبت اور یرقان کو آنکھوں سے ظاہر ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ تو تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں، تمہیں ان سے محبت ہو چکی ہے۔ جس طرح یرقان انتہا پر پہنچ کر ہیپاٹائٹس میں بدل جاتا ہے ٹھیک اسی طرح محبت شدت اختیار کرے تو عشق بن جاتا ہے، پھر انسان دیوانہ ہو جاتا ہے اسے راتوں کو نیند نہیں آتی، چاند کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتا ہے اور اس کا دل چاہنے لگتا ہے اپنے بال بکھیر کر جنگلوں میں نکل جائے۔“ بے حد سنجیدگی بھرے انداز میں وہ رتی بھر بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

”... ... عاشق کا ... ... پاگل جیسے کا؟“
”پاگل جیسے کا۔“ سنجیدگی سے جواب آیا۔
... سر پیٹ لیا۔
”اس سر نے کیا قصور کیا ہے، مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے انیبہ محبت کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیتیں ... ضرور تمہیں بتاتی، کسی پتھر سے سر پھوڑ لو، پنکھے سے پھندا لگا کر خودکشی کر لو، مگر فیضان ماما سے محبت نہ کرو۔“
”مرو تم۔“ انیبہ جھٹکے سے اٹھ کر جانے لگی، ہادی نے اسی تیزی سے اس کا راستہ روک لیا۔
”خبردار، بات کو بیچ میں چھوڑ کر جاؤ گی تو مجھ جیسی بہترین دوست سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ ویسے بھی میں تمہیں دل سے اپنی ممانی جان مان چکی ہوں اور جب تک اپنی ممانی جان کی پریشانی دور نہیں کر دیتی، مجھے چین نہیں آئے گا۔“ اس نے دھونس بھرے انداز میں کہا۔
”سبحان اللہ، کیا بات ہے آپ کی۔“ انیبہ نے جل کر کہا۔
”یہ تک تو پتا نہیں آپ کے ماموں جان کے دل میں کیا ہے۔ محترمہ مجھے ممانی جان بنائے بیٹھی ہیں۔“
”دیکھو... ایک بہت بہترین فلاسفر نے کہا ہے جب کسی مسئلے کا حل نہ مل رہا ہو تو کرکٹ کھیلنا چاہیے اور اس کے بعد مسئلے کا حل ڈھونڈنا چاہیے۔“ ہادی نے سابقہ سنجیدگی سے کہا۔
”اور یہ فلاسفر کون ہے؟“ انیبہ نے گھور کر پوچھا۔
”تمہیں میں نظر نہیں آ رہی۔“ ہادی کھکھلائی، انیبہ اسے گھور کر بولی۔
”محبت ... ہوئی ... لیکن لگتا ہے دماغ تمہارا چل گیا ہے۔ اتنی دوپہر میں کرکٹ کھیلیں گے۔“
”اب آئی نا صحیح بات زبان پر۔“ ہادی نے خوش و پرجوش ہو کر تالی بجائی، انیبہ سٹپٹائی۔
”نہیں... وہ...“
”ارے چھوڑو یہ وہ۔ بس اتنا کافی ہے کہ تم فیضان ماما پسند ہیں۔ میں ان کو سمجھا نہیں سکتی، لیکن ان کو قائل کرنے کے لیے تم کو بڑے اچھے آئیڈیاز دے سکتی ہوں۔ کیا بتاؤں کہ فیضان ماما کی روکھی پھیکی زندگی میں رنگ بھرنے کا خیال ہی کتنا خوش کن ہے۔ چلو آؤ پہلے چائے پیتے ہیں، پھر کرکٹ کھیلیں گے اور اس کے بعد بیٹھ کر سوچیں گے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔“
وہ جیسے سارا کچھ طے کیے بیٹھی تھی، انیبہ کسی سوچ کے تحت دوبارہ بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد ہنگامی بنیادوں پر میچ ارینج کیا گیا۔ ہادی اور انیبہ کی ایک ٹیم تھی۔ ولی نے لڑکیوں کی ٹیم میں شامل ہونے کو سراسر اپنی مردانگی کی توہین تصور کیا اور ولید سے سخت چپقلش کے باوجود اس کے ساتھ ٹیم بنانے کو ترجیح دی۔ ثازیہ فیلڈر تھی، جبکہ چوکیدار جس کی دور کی نظر کمزور تھی اور اللہ کے فضل و کرم سے آج وہ اپنا نظر کا چشمہ بھول آیا تھا کو امپائر بنا دیا گیا۔ اب کچھ اس قابل امپائر کی مہربانی اور کچھ ہادی کی ڈھٹائی کا نتیجہ تھا کہ ... بھر سے فرضی وکٹ اور ڈرائیو وے کی پچ پر جمی کھڑی تھیں اور لڑکے بری طرح پیچ و تاب کھا رہے ... خر ولید کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے پی کیپ اتار کر زمین پر پٹخی اور وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔
”کیا ہوا ہے ولید؟“
”جب تک ہمیں بیٹنگ نہیں دی جائے گی ہم نہیں کھیلیں گے۔“
”... واہ۔“ انیبہ نے تنک کر کہا۔ ”ہمیں آؤٹ کرو پہلے، پھر بیٹنگ لے لو۔“

"بالکل ٹھیک۔" ہادی نے بھی بیٹ لہرا کر کہا۔
"اب تمہاری بالنگ زیرو ہے تو کوئی کیا کرے' ورنہ میں تو اتنی بہترین پلیئر ہوں کہ ٹوئنٹی ٹو میں عمران خان نے ہر میچ کا اسٹریٹیجی پلان مجھ سے ہی بنوایا تھا۔" اس نے اکڑ کر کہا۔
"اچھا" ولید نے پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھا۔ "اب تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔ ویسے بھی تم اتنی عمر رسیدہ لگتی ہو ضرور نائنٹی میں مشورے دیتی ہوگی۔"
ہادی کے تلووں میں لگی سر پر بجھی وہ بری طرح سلگی تھی۔
"عمر رسیدہ کسے کہا ہے تم نے؟"
"میرا خیال ہے دونوں ٹیمز کے کیپٹن میں تلخ کلامی ہونے کی بنا پر میچ درمیان میں ہی ختم کرنا پڑے گا۔" انیبہ نے شرارتی انداز میں کہا۔
"جی نہیں۔ جو میدان چھوڑ کر بھاگے گا' وہ بزدل ہوگا" ہادی ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔ "یہ ولید ہمیں آؤٹ نہیں کرپا رہا۔ اسی لیے الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔"
"تم بغیر دھاندلی کے کھیلتیں تو پہلی بال پر ہی آؤٹ ہو چکی ہوتیں۔" ولید نے دوبدو کہا۔
"اب آؤٹ کر کے دکھاؤ تو مان جاؤں۔" ہادی نے چیلنج کیا۔
"ایسی بات!" ولید اٹھ کھڑا ہوا' پیچھے ہٹنے والوں میں سے تو وہ بھی نہیں تھا۔
"میں نے بھی اس بال پر سکس نہ لگایا تو میرا نام ہادی نہیں" ہادی نے پوزیشن سنبھالی۔
"ٹھیک ہے پھر کل سے ہم تمہیں "بڈھکو" بلایا کریں گے" ولید نے پوزیشن لے کر بال پھینکی ہادی ایک دم ہی الرٹ تھی اس نے سرعت سے بیٹ گھمایا۔ گیند بیٹ سے ٹکرا کر تیزی سے آسمان کی طرف بلند ہوئی۔ سب کی نظریں گیند پر تھیں گیند کچھ دیر ہوا میں تیرتی رہی پھر مہارت سے نوے کا زاویہ بناتی بنگلے کی باؤنڈری وال کے اس پار غروب ہوگئی۔ ساتھ ہی ایک زوردار چیخ ان سب کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔
ہادی کے ہاتھ سے بیٹ چھوٹ گیا۔
"یہ۔ یہ کیا تھا۔" اس نے ہراساں ہو کر پوچھا۔
ولی' ولید اور چوکیدار تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگے' ہادی' انیبہ اور شازیہ میں تو ہمت نہیں تھی کہ جا کر دیکھتیں اس سکس نے کیا کمال کیا ہے۔
چند منٹ بعد وہ تینوں بوکھلائے ہوئے واپس آگئے۔
"باہر سڑک پر ایک لڑکا اوندھا پڑا ہے۔ پتا نہیں بے ہوش ہے یا مر گیا۔ بال اس کے سر پر لگی ہے۔"
"اب کیا کریں؟" لڑکیاں گھبرا گئیں۔
"کرنا کیا ہے۔ اندر چلو۔ شاٹ ہادی نے لگایا تھا پولیس کے حوالے بھی اسی کو کریں گے۔" ولید نے سنگ دلی سے کہا تھا۔
"کھیل تو سب رہے تھے۔" ہادی نے پریشانی سے کہا۔
"جی نہیں۔ میں تو موقع واردات پر موجود ہی نہیں ہوں باقی تم لوگوں کی مرضی ہے جو دل میں آئے کرو۔" وہ کہہ کر اندر بھاگ گیا۔
"میں تو ولید کی ٹیم میں تھا جب وہ ہی یہاں موجود نہیں تھا تو میں کیسے ہو سکتا ہوں۔" ولی بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔
لڑکیاں آوازیں دیتی رہ گئیں لیکن مجال ہے جو دونوں میں سے کوئی پلٹا ہو۔

[illegible] سب مروت نکلے۔" ہادی نے صدمے سے چور آواز میں کہا تھا۔
[illegible] بھی بھاگ جاتے ہیں کسی کو کیا پتا گیند کس کی تھی۔"
[illegible] کہ ہادی پلٹتی چوکیدار کی آواز آئی۔
"بی بی! مردہ کھڑا ہو رہا ہے۔"
دونوں حواس باختہ ہو کر گیٹ کی طرف دوڑیں اور جلال کو کپڑے جھاڑتا دیکھ کر ایک ساتھ پُرسکون سانس ان [illegible] سے برآمد ہوئی۔
"شکر ہے' آپ زندہ ہیں۔" انیبہ نے کہا۔
"اچھا ہوا بال آپ کو لگی ورنہ پتا نہیں کون معصوم میرے ہاتھوں زخمی ہو چکا ہوتا۔" ہادی کی آواز میں اطمینان [illegible] کے ساتھ ساتھ شکر گزاری بھی تھی۔
جلال بے چارہ پہلے ہی سر پر گیند کھا کر بوکھلایا ہوا تھا۔ یہ بات سن کر بڑا سخت صدمہ پہنچا۔
"یعنی میرا زخمی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔"
"ارے کیسی باتیں کر رہے ہو جلال۔ معنی کیوں نہیں رکھتا؟ بالکل رکھتا ہے بلکہ سچ کہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوئی [illegible] کہ میری گیند آپ کو لگی۔"
بڑی خوشی سے ارشاد فرمایا گیا پھر وہی ناسوچے سمجھے بولنے کی عادت۔
"جی۔" جلال کو دھچکا لگا۔
"یہ قدرت نے تمہیں ہمارا مہمان بنانے کا انتظام کیا ہے۔ ورنہ تم نے تو ہمارے گھر نہ آنے کی قسم کھا رکھی [illegible] چلو آؤ۔ اندر آجاؤ۔ تمہیں اچھی سی چائے پلاتے ہیں۔ ممی بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔" اس [illegible] بے تکلفی سے کہا۔
"جی نہیں۔ چائے کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔" جلال نے ٹالتے ہوئے کہا۔
"ضرورت۔" ہادی نے اپنائیت بھری جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔
"پہلی بار تم چوٹ کھا کر ہمارے گیٹ کے سامنے پڑے ہو۔ اب تمہیں سوکھے منہ تو جانے نہیں دے سکتے۔ ہم بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ کوئی کچھ کھائے پیئے بغیر ہمارے یہاں سے جائے' ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ چلو آؤ شاباش۔ چائے پی کر جانا۔"
حسب عادت وہ خدا جانے کیا کیا بولتی کسی بڑی اماں کی طرح اسے پچکارنے لگی۔ ناچار جلال اس کے ساتھ اندر چل دیا۔ کچھ ہادی کا اصرار اور کچھ سعدی کی منتیں بھی یاد آگئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے اماں! جیسے تیری مرضی۔ میں تو ویسے بھی تیری خوشی میں راضی ہوں۔"
دین محمد نے سر جھکا کر سعادت مندی سے جواب دیا۔ اس کی ماں کا دل یکدم خوشی سے بھر گیا۔ اسے فوری طور [illegible] نہیں آیا' کتنے عرصے کے بعد اس کا بیٹا دھیمے لہجے میں اس سے بات کر رہا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد رہا کہ اس [illegible] منہ سے یہ جواب سننے کے لیے وہ کتنے عرصے سے منتظر تھی۔ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے دین محمد کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیتی کمرے سے باہر جانے لگی۔
"بس ایک بات کا خیال رکھنا اماں۔" دین محمد کی آواز پر وہ دروازے کے قریب رک گئی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میرے لیے جو بھی لڑکی پسند کرنا وہ ایسی ہونی چاہیے جو میری جنت کا خیال رکھ سکے۔ اسے سوتیلی ماں ہونے کا احساس نہ دلائے۔ مجھے اپنے لیے بیوی سے زیادہ جنت کے لیے ماں کی ضرورت ہے۔"

اس کا لہجہ اس بار مدھم سہی لیکن مستحکم اور دوٹوک تھا۔ دین محمد کی ماں جانتی تھی جلد یا بدیر اگر وہ شادی کے لیے ہامی بھرے گا تو اسی شرط کے ساتھ بھرے گا تب ہی گہری سانس بھرتی اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے باہر آگئی جنت کے کمرے کے سامنے اس کے قدم بے ساختہ رکے۔ کھلے ہوئے دروازے سے وہ پلنگ پر لیٹی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس وقت ساڑھے گیارہ سال کی ہو چکی تھی لیکن قد کاٹھ سے اپنی عمر سے زیادہ بڑی لگتی تھی۔

دین محمد کی ماں چند منٹ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ گئی اور آنگن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ برادری کی تین چار لڑکیوں پر پہلے ہی اس نے دین محمد کے لیے نظر رکھی ہوئی تھی ان میں سب سے پہلے قرعہ فال شاہدہ کے نام نکلا جو اس کی چچیری بہن کی بیٹی تھی۔ اور اپنے لمبے قد اور لمبی چٹیا کی وجہ سے اسے بے حد پسند تھی۔ دین محمد کی ماں کو یقین تھا وہ جس کے بھی گھر میں دین محمد کے لیے دست سوال دراز کرے گی وہاں سے اسے مایوس نہیں لوٹایا جائے گا لیکن دقت یہ تھی کہ اسے ایک نہیں برادری کی کئی لڑکیاں پسند تھیں اور اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ان میں سے کس کو دین محمد کے لیے چنے بالآخر اس نے شاہدہ کے حق میں فیصلہ دیا اور اگلے روز اس کے یہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

گو کہ اس نے زہرہ کی ناگہانی موت کے کچھ عرصہ بعد ہی دین محمد کی تنہائی کے خیال سے اس سے شادی کے لیے اصرار شروع کر دیا تھا لیکن دین محمد ہر بار دوسری شادی سے انکار کر دیتا۔

"میں اپنی جنت پر سوتیلی ماں کبھی نہیں لاؤں گا۔" وہ ہر بار یہی کہتا لیکن چار ساڑھے چار سال کی مستقل تنہائی نے غالباً اسے تھکا دیا تھا تب ہی اس بار اس نے اپنا اہم شرط ماں کے سامنے رکھ کر شادی کے لیے ہامی بھری۔ دین محمد کی ماں جنت کی طرف سے پریشان تھی اس نے جنت کو مزار والے باباجی کا تبرک کھلا کر اس کا لے سائے کو ہٹانے کی اپنی سی کوشش کی تھی جو جنت کی وجہ سے اسے دین محمد کی عقل پر پڑا ہوا لگتا تھا لیکن اپنی اس کوشش میں اسے منہ کی کھانا پڑی تھی۔ بیٹے نے ناراض ہو کر بول چال کئی دن تک بند رکھی پھر اس کے معافی مانگنے پر راضی ہوا تھا۔

دین محمد کی ماں اس بات پر کئی روز تک پریشان رہی تھی۔ اسے بیٹے کی نگاہ میں اپنی قدر پتا چل گئی تھی اور اس کے بعد ماں نے جنت کو سدھارنے کی کوششیں ترک کر کے دین محمد کو شادی کے لیے راضی کرنے کی تگ ودو شروع کر دی تھی۔

اسے لگتا تھا دوسری بیوی کے زندگی میں آتے ہی دین محمد کی جنت کے لیے محبت اور غیر معمولی جھکاؤ میں کمی نہ سہی لیکن اعتدال ضرور آجائے گا جنت اس کی شہہ سے بہت زبان دراز ہو گئی تھی۔

اگلے روز دین محمد کی ماں مٹھائی اور پھل کے ٹوکرے کے ساتھ پوری شان سے بیٹے کا رشتہ لے کر اپنی چچیری بہن کے یہاں گئی لیکن اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب یہ پتا چلا کہ شاہدہ کا رشتہ چند روز قبل ہی اس کے ماموں کے بیٹے سے طے کیا جا چکا ہے۔

دین محمد کی ماں کو بے حد افسوس ہوا۔ دین محمد کی ٹال مٹول نے اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکال دی تھی۔ اس نے اگلے روز بھائی فردوس کے یہاں جانے کا فیصلہ کیا جو اس کا دور پرے کا رشتہ دار تھا اور جس کی بیٹی تبسم اپنے نام کی طرح کھلکھلاتے ہوئے مزاج اور بے حد گوری رنگت کی وجہ سے دین محمد کی ماں کو شاہدہ سے بھی زیادہ پسند تھی لیکن چونکہ اس کا باپ دور کا رشتہ دار تھا اس لیے تبسم کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا تھا۔

بھائی فردوس کے گھر جاتے ہوئے دین محمد کی ماں مسلسل جنت کے رد عمل کے متعلق سوچ رہی تھی۔ گھر میں

دلہن بنی تبسم کے آنے کی خبر سن کر وہ کیا کرے گی۔ وہ یقیناً خوش ہوگی اور باپ کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گی۔" دین محمد کی ماں کو یکایک خیال آیا تھا۔

"ویسے تو بھائی فردوس اعتراض نہیں کرے گا لیکن ہو سکتا ہے وہ جنت کے بارات کے ساتھ آنے پر اعتراض کرے۔ تبسم کی تو یہ پہلی شادی ہے ہو سکتا ہے ہونے والے شوہر کی پہلی بیٹی کا بارات کے ساتھ آنا اسے اچھا نہ لگے۔ پھر تو دین محمد نہیں مانے گا جب تک جنت اس کے ساتھ نہ ہوگی وہ بارات لے کر ہی نہیں جائے گا۔ لیکن خیر میں بھائی فردوس کو مناؤں گی بچی کی یہ خوشی تو نہ چھینیں۔"

وہ راستہ بھر اپنے پریشان کن خیالات کو خود ہی رد کر کے مطمئن ہوتی رہی لیکن بھائی فردوس کے یہاں اسے پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب یہ پتا چلا کہ تبسم کی بات بھائی فردوس نے اپنے بڑے بھائی کے یہاں چلا رکھی ہے۔

دین محمد کی ماں یہاں سے بھی نامراد لوٹ آئی لیکن اسے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ دونوں لڑکیوں کے رشتے چپ چاپ طے کیے گئے ہیں ورنہ برادری میں جب بھی کسی لڑکے یا لڑکی کے رشتے کی بات چلتی سب ہی کو خبر ہوتی اگلے دو گھرانوں میں دین محمد کی ماں کو اسی طرح انکار کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی حیرانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ لڑکیوں کے رشتے یا طے ہو چکے ہوتے یا طے پانے کے مراحل میں ہوتے۔

وہ جو یہ سمجھ رہی تھی اسے دین محمد کی دوسری شادی کے سلسلے میں کوئی دقت نہیں ہوگی تو اس کی ساری خوش فہمی دھری کی دھری رہ گئی لیکن اصل صدمے کا سامنا اسے اس وقت کرنا پڑا جب وہ اپنے سگے بھائی کی نواسی کا رشتہ لینے گئی۔ اس کے بھائی کی بیوی بے حد بدمزاج تھی۔ ساری زندگی اس نے نندوں سے جھگڑوں میں گزاری تھی۔ آگے اس کی بیٹیاں بھی ایسی ہی بدمزاج اور منہ پھٹ تھیں۔ البتہ اس کی بھتیجی کی بڑی لڑکی سلجھے ہوئے مزاج کی اور نرم خو لڑکی تھی۔ اسی لیے وہ اسے دین محمد کے لیے بیاہ کر لانا چاہتی تھی۔

لیکن جوں ہی اس نے اپنی بھتیجی نصرت کے سامنے اس کی بیٹی کے لیے سوال دراز کیا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بدلحاظی سے بولی۔

"بس پھپھی! اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔ یہ تو مجھے پتا چل ہی گیا تھا کہ تم دین محمد کے لیے ہر لڑکی کے لیے سوال کر رہی ہو لیکن میں تمہیں صاف بتا دوں ہم سے کم اس برادری میں کوئی تمہارے دین محمد کو اپنی بیٹی نہیں دے گا۔"

"ہائے ہائے نصرت! کیا کمی ہے میرے دین محمد میں۔ تو نے اپنی بیٹی نہیں بیاہنی نہ سہی مگر ساری برادری کا نام تو نہ لے۔" دین محمد کی ماں نے تنک کر کہا۔

"دیکھ پھپھی! اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ تجھے پتا ہے میں اللہ بخشے اپنی بے بے کی طرح صاف گو ہوں۔ لگی لپٹی رکھنا نہیں آتی مجھے۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہوتا ہے۔ میں تو ساری باتیں تجھے اس لیے بتا رہی ہوں کہ برادری کے کسی اور گھر میں تجھے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ تجھے کیا لگتا ہے میرے گھر آنے سے پہلے تو نے جہاں جہاں دین محمد کا رشتہ ڈالا ہے ان لڑکیوں کے رشتے پہلے ہی طے ہو چکے ہیں؟"

"ان کے ماں باپ تو یہی کہتے ہیں۔" دین محمد کی ماں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"جھوٹ بولتے ہیں سارے۔" نصرت نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہا ہا۔ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا نصری! وہ کیوں جھوٹ بولیں گے۔؟" وہ اکتا کر بولی۔

"صاف صاف انکار کر کے تیرا دل نہیں دکھانا چاہتے تھے اس لیے صرف تجھے انکار کرنے کا تمیزدار طریقہ" نصرت عرف نصری نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ جماتے ہوئے کہا تھا۔

"نصری! مجھے ٹھیک ٹھیک بتا بات کیا ہے؟"

"دیکھ پھپھی! دماغ کھول کے میری عقل والی بات سن۔ دین محمد میری گود کا کھیلا بچہ ہے میں اس کی بڑی قدر کرتی ہوں پھر زمین، دولت بھی وافر (بہت زیادہ) ہے لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جن پر جنت نے پردہ ڈال دیا ہے۔"

"جنت کا یہاں کیا ذکر؟"

"لے جنت کے بغیر دین محمد کا ذکر ہو ہی نہیں سکتا۔" نصرت نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔ "جنت کو تو دین محمد نے ہتھیلی کا چھالہ بنا رکھا ہے ساری برادری جانتی ہے وہ کس طرح جنت کو سر چڑھائے بیٹھا ہے۔ اتنی سی عمر میں جیسا اس لڑکی کا نخرہ اور مزاج ہے۔ توبہ توبہ اللہ معاف کرے۔ کسی کی مت ماری گئی ہے ایسے گھر میں اپنی بیٹی دے جہاں چار ساسوں جیسی اور چھ فسادن نندوں جیسی ایک سوتیلی بیٹی پہلے سے موجود ہو۔ اس نے تو ایک دن نئی ماں کی عزت نہیں کرنی۔"

دین محمد کی ماں چپ کی چپ رہ گئی۔

"میری مان پھپھی! یا تو دین محمد کی شادی کا خیال دل سے نکال دے یا پھر برادری سے باہر کی کوئی لڑکی تلاش کر اور اگر دونوں باتیں نہیں کر سکتی تو پھر دین محمد کو سمجھا کہ جنت کا مزاج ٹھکانے پر لائے۔ باقی میں تیرے لیے دعا کروں گی کہ اچھی بہو تجھے مل جائے۔"

دین محمد کی ماں مایوس ہو کر اس کے گھر سے نکل آئی۔ یہ بات تو اس نے سوچی ہی نہیں تھی اور اب نصرت کی باتیں سن کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی جنت کا وجود دین محمد کی زندگی میں کسی لڑکی کو نہیں آنے دے گا یا کم سے کم وہ ایسی لڑکی نہیں ہوگی جو اس کے گھرانے سے واقف ہو اور ایسی لڑکی برادری سے تو نہیں ہو سکتی۔

اس کے ذہن میں چند روز کی سوچ بچار کے بعد ایک اور خیال آیا۔ اس نے ملازمہ کے ذریعے گاؤں کی نائن کو بلوا بھیجا جو رشتے کروانے کا کام بھی کرتی تھی۔ اس نے نائن سے کچھ اچھی لڑکیاں دکھانے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی اپنی شرائط بھی بتا دیں کہ لڑکی دھیمے مزاج کی ہو اور بے حد خوبصورت ہونی چاہیے۔

دین محمد کو جنت کے مقابلے میں سمجھانا مشکل تھا لیکن اس کا دل کہتا تھا خوبصورت نئی بیوی کی موجودگی میں وہ جنت کی پروا کرنا کسی حد تک کم کر دے گا۔ جس سے یقیناً جنت کے مزاج پر بھی اچھا اثر پڑتا اور اگر وہ دھیمے مزاج کی ہوگی تو جنت کے ساتھ سمجھوتا کر کے گزارا کرے گی۔ اپنی طرف سے بہت اچھی تیاری کر کے اس نے نائن کو اپنی شرائط بتائی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر لڑکی کم حیثیت گھرانے سے ہو تو اور بھی اچھا ہوگا۔

نائن نے اسے تسلی دی اور جلد ہی اچھی لڑکیاں دکھانے کا یقین دلاتی اپنا معاوضہ لے کر چلی گئی۔ اس نے جلد ہی دین محمد کی ماں کو لڑکیاں دکھانا شروع کر دیں۔ لیکن دین محمد کی ماں کو کوئی لڑکی پسند نہ آتی۔ کوئی خوبصورت نہ ہوتی کوئی تیز مزاج لگتی تو کسی کا گھرانہ مضبوط حیثیت کا ہوتا۔ ہر جگہ انکار کرتے اسے شرم آتی لیکن یہ اس کی مجبوری تھی۔

دو مہینے کی خواری کے بعد بالآخر اسے بشریٰ پسند آ گئی جس کا تعلق پڑوس کے گاؤں سے تھا۔ وہ بے حد غریب گھرانے کی اور سات بہنوں میں سب سے بڑی تھی اور اس کے دائیں پیر میں لنگ تھا جس نے اس کی خوبصورتی کو ماند کر کے رکھ دیا تھا لیکن دین محمد کی ماں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ بشریٰ خوبصورت اور بھرپور لڑکی تھی۔ اس کے پیر کا لنگ نظر انداز کیا جا سکتا تھا بشریٰ کے ماں باپ کو دین محمد کی دوسری شادی یا ایک بیٹی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ایک مال دار زمین دار ان کی لنگڑی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور جوان کی باقی بیٹیوں کی شادیاں کروانے میں ان کی مدد کر سکتا ہے مالی بھی اور اخلاقی بھی۔

اس بات کی یقین دہانی دین محمد کی ماں نے کروا دی تھی۔

اور یوں دین محمد کی ماں کی چند مہینوں کی تگ و دو کے بعد بشریٰ نام کی خوبصورت لڑکی بیوی بن کر دین محمد کی اس حویلی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے آ گئی یا یوں کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ بشریٰ نام کی خوبصورت لڑکی سوتیلی ماں بن کر جنت کی زندگی میں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

ثروت کو بڑی دیر سے کوئی سوچ لاحق تھی۔

جب سوچتے سوچتے تھک چکیں تو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر لیکن حتمی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں کہ اب بات کیے بنا کوئی چارہ نہ تھا مگر اسٹڈی کے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ کر وہ ایک بار پھر الجھیں۔ بعض اوقات بہت زیادہ سوچ بچار کو بھی کسی فیصلے کی درستی کی ضمانت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگلے ہی پل وہ اندر داخل ہو گئیں۔ بک ریک کے قریب کھڑے اور کسی کتاب میں غرق دانیال حسن نے لحظہ بھر کے لیے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر سابقہ مصروفیت میں گم ہو گئے۔

ثروت کی نظریں سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں اور چائے کی اس کالی سی پیالی پر ٹھہر گئیں جو اسٹڈی پر تھی۔

"خود کو اور کتنا جلائیں گے دانیال حسن؟" ثروت نے گہری متاسف سانس بھرتے ہوئے سوچا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"میں مصروف ہوں۔" حسب توقع جواب آیا۔

"میرے لیے تو آپ ہمیشہ مصروف ہی رہے۔ یاد نہیں پڑتا ہے کبھی آپ کی کوئی فرصت میرے حصے میں آئی ہو۔" ثروت نے تلخ لہجے میں کہہ دوسری طرف یوں خاموشی چھائی رہی جیسے سنا ہی نہ گیا ہو۔ ثروت کے تلخیوں میں اضافہ ہوا لیکن کیا فائدہ۔

"علی آنیہ سے آپ کے رویے کی شکایت کر رہا تھا۔ وہ خود الجھا ہوا ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے اسے محسوس ہوا ہے ہمارے ریلیشن شپ میں کوئی ایسی بات ہے جو نارمل نہیں ہے۔ اس کی باتیں سن کر ولید نے کہا۔"

"بہتر ہو گا۔ تم مختصر بات کرو۔" دانیال حسن نے سرد مہری سے کہا۔ ثروت کا خیال تھا بیٹوں کے نام آتے ہی دانیال ضرور چونکیں گے لیکن۔

"آپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے بچے ہماری ہی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی عمروں میں انہوں نے بڑی بڑی باتیں سوچنا شروع کر دی ہیں۔"

"فرق پڑتا ہے۔ لیکن اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔" دانیال حسن ایک کتاب لیے واپس کرسی پر آ بیٹھے۔

"پھر کون ہے ذمہ دار؟" "میں۔ جس کی ساری زندگی شک کی آنچ پر سلگتی گزری ہے۔؟" ثروت نے تڑپ کر پوچھا۔

"میں نے تم پر کبھی شک نہیں کیا۔" دانیال حسن نے ان کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔

"زبان سے کبھی نہیں کیا لیکن کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا جب آپ نے میرے کسی بھی عمل کو شک کی نگاہ سے نہ پرکھا ہو حالانکہ آپ کو سوچنا چاہیے تھا مجھے مستقیم سے ہی ملنا ہوتا تو اس سے الگ ہو کر آپ کے پاس کیوں آتی۔"

"بات یہ ہے ثروت کہ تمہیں ہمیشہ اسی بات کا دکھ رہا۔ چاہو تو اب اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لو۔" دانیال حسن نے پتھر پھوڑے۔

"نظرِ ثانی۔" ثروت نے زہرخند لیا۔ "اپنے فیصلوں پر پچھتایا جاتا ہے دانیال صاحب! نظرِ ثانی نہیں کی جاتی

خصوصاً "تب جب اولاد بھی قد سے اونچی ہونے لگے۔"

"ایسا ہی پچھتاوا ہے تو جی کیوں نہیں لیتیں میری زندگی سے۔ تمہیں بھی سکون مل جائے گا اور مجھے بھی۔" دانیال حسن واقعی غصے سے دانت کچکچانے لگے۔

ثروت نے دکھ سے انہیں دیکھا۔ اپنی ریزہ ریزہ ہوئی ہمتیں جمع کیں اور بولیں۔

"یہی بتانے آئی تھی آپ کو جب آپ کی زندگی میں میری جگہ ہی نہیں تو اس گھر میں رہ کر کیا کروں گی۔ میں کل بھائی جان کے وہاں جا رہی ہوں واپس کب آؤں گی کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن مجھے لگتا ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے دور رہ کر سوچنا چاہیے۔ میرے کوئی الجھاؤ نہیں ہیں لیکن کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کے لیے یقیناً" آپ کو تنہائی درکار ہوگی، صرف ایک گزارش ہے اگر علیحدگی کا فیصلہ ہو تو میری بیٹی کو اس گھر سے رخصت کر دیجئے گا۔ ٹوٹے ہوئے گھروں کی بیٹیاں جڑ سے اکھڑے پودے کی طرح ہوتی ہیں۔ اپنی جڑیں زمین میں گاڑنے کے لیے انہیں وقت چاہیے ہوتا ہے۔

بیٹے سنبھل جاتے ہیں۔ شبیہہ العباس بھی سنبھل گیا۔ خدا کرے ولی اور ولید بھی۔ آپ کا جو بھی فیصلہ ہو مجھے مطلع کر دیجئے گا۔ میں منتظر رہوں گی۔"

"خود جا رہی ہو، واپس بھی خود ہی آنا ہوگا۔ اس امید پر مت رہنا کہ میں لینے آؤں گا۔" دانیال حسن کو ثروت کا فیصلہ سن کر بے یقینی کا جھٹکا لگا تھا لیکن انا آڑے آگئی۔ تڑخ کر بولے۔

"نہیں۔ خود واپس نہیں آؤں گی اگر واپس لانا ہے تو لینے کے لیے آپ کو ہی آنا پڑے گا۔ اسے میری ضد سمجھ لیں۔" ثروت نے دوٹوک کہا تھا۔

"یہ عمر ہے ضد کرنے کی۔" وہ سلگے۔

"جو عمر فیصلہ کرنے کی تھی، ہم اس میں فیصلہ نہ کر سکے۔ اب جو عمر ضد کی نہیں ہے اس میں ضد کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" ثروت نے آہستگی سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔ چند منٹوں میں بہت بڑا فیصلہ ہو چکا تھا۔

"اور نہ۔ پچھتاؤ گی ثروت بیگم! کیونکہ میں تو اب نہیں جھکوں گا۔"

دانیال حسن نے بند دروازے کو دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا پھر کتاب پر جھک کر خود کو اپرائی کا جھانسا دینے لگے۔

☆☆☆

"مجھے تو اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل دکھائی دے رہا ہے۔ بغیر جھجکے فیضان ماما کے پاس جاؤ اور ان سے صاف کہہ دو کہ تم ان سے محبت کرتی ہو۔ اور ان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

وہ دونوں ٹیرس پر موجود تھیں اور انیبہ کی بنائی ہوئی کولڈ کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اس مشورے پر انیباء نے سر اٹھا کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کی عقل پر شک گزرا ہو۔

"پاگل ہوئی ہو کیا۔ میں کیسے کہہ سکتی ہوں؟"

"تو کیا میں کہوں گی۔" مادی نے دوبدو کہا تھا۔

"محبت خود کی ہے تو اظہار بھی خود ہی کرنا پڑے گا۔ کوئی مدد کرنے نہیں آئے گا۔"

"تم جا کر کہہ دو پلیز۔ میری تو ہمت نہیں ہوگی۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"ہمت نہ ہو تو محبت وحبت جیسا مرض پالنا نہیں چاہیے۔" مادی نے بے دردی سے کہا۔ "بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر کونے میں پڑے رہنا چاہیے۔"

"عجیب لڑکی ہو۔ بجائے یہ کہ میری مدد کرو۔ مجھے طعنے دے رہی ہو۔" وہ خفا ہوئی۔

"مگر دیر کیسے کی جاتی ہے؟" مادی نے ترنت پوچھا۔

"یہی مشورہ دے تو رہی ہوں 'جا کر فوراً' سے پیشتر اظہار محبت کرو۔ ابھی تو تمہارے پاس چانس ہے یعنی سیٹ خالی ہے' ایسا نہ ہو کل کو کوئی اور چھمک چھلو اس ایجنسی پر غاصبانہ قبضہ کر لے اور تم منہ دیکھتی رہ جاؤ۔"

اس نے اپنے حساب سے سنسنی پھیلائی اور حسب توقع وہ خائف بھی ہو گئی۔

"ایسا بھی چانس ہے مادی؟"

"دیکھو۔ یہ دنیا ہے۔ اور دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے پھر اتنے ہینڈسم ہیں میرے فیضان ماما کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی دوسری لڑکی ان میں انٹرسٹ نہ لے۔"

"تم مجھے ڈرا رہی ہو مادی؟" اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

"شاباش۔ ویری گڈ۔" مادی پُرجوش ہو کر بولی تھی۔ "جتنا زیادہ ڈرو گی۔ اتنی جلدی جا کر فیضان ماما سے اپنے دل کا حال بیان کرو گی۔"

انیبہ گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"تو پھر میں یہاں بیٹھ کر تمہارے ساتھ سر کیوں کھپا رہی ہوں۔" مادی نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"میں جا کر اظہار نہیں کر سکتی مادی۔ مجھے شرم آئے گی۔" بالآخر اس نے سچ اگل دیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ تم بیٹھ کر شرماتی رہو۔ میں تب تک فیضان ماما کے لیے کوئی اور لڑکی تلاش کر لوں گی۔"

"بہت ہی بدتمیز ہو۔ میری دوست ہو کر مجھے ہی نقصان پہنچاؤ گی۔" اس کی طوطا چشمی پر اس نے صدمے سے کہا۔

"تو اور کیا کروں۔" مادی نے سابقہ انداز میں پوچھا۔

"فیضان ماما نے جدوجہد سے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ چھوٹی عمر میں پریکٹیکل فیلڈ میں آ گئے تھے' کم عمری میں بہت سی ذمہ داریاں اٹھائیں' مجھے لگتا ہے اتنی جدوجہد نے ان کے گرد حصار کھینچ دیا ہے کہ وہ زندگی کے اصل رنگوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ سوچا تھا تم جیسی لڑکی ان کا حصار توڑے گی تو وہ اصل خوشیوں کی طرف متوجہ ہوں گے۔ لیکن تم۔ تم تو بھئی۔ بہت ہی ڈیو نکلیں۔"

"ہاں تو میں کیا کروں' ڈیو نہیں ہوں لیکن یہ بات کچھ عجیب سی نہیں لگتی کہ۔"

"ارے کچھ عجیب نہیں لگتا۔" مادی اسے قائل ہوتا دیکھ کر پھر بیٹھ گئی اور پُرجوش انداز میں بولنے لگی۔

"تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنا پڑے گی۔ انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانا پڑے گا۔ وہ تو ناک کی سیدھ میں چلنے کے عادی ہیں۔ ارد گرد دھیان ہی نہیں دیتے۔ اب انہیں کیا پتا' ان کے آس پاس ایک ایسی لڑکی موجود ہے جو خوبصورت بھی بہت ہے اور ان کی محبت میں بھی مبتلا ہے۔ ساری زندگی محبت میں ناکامی کا غم دل سے لگا کر زندہ نہیں رہنا چاہتیں تو میری بات مان لو' جا کر خود ہی اظہار کر دو اس آس میں رہو گی کہ وہ خود پیش قدمی کریں تو فضول میں ساری زندگی چپ چاپ گزار لیں گے۔ دل کی بات زبان پر نہیں آنے دیں گے۔"

"تمہیں لگتا ہے وہ بھی مجھ سے۔" اس نے بے ساختہ خوش ہو کر پوچھا۔

"تم میں کس بات کی کمی ہے کہ کوئی تم سے محبت نہ کرے' بس یہ ہے کہ فیضان ماما کی دور و نزدیک دونوں کی نظر کمزور ہے۔ تمہیں شادی کے بعد دونوں طرح کی عینکیں اٹھا کر پھرنا پڑے گا۔" وہ جو سنجیدگی سے سن رہی تھی اس بات پر ہنس دی۔

"آج آپ کو بار بار میری شادی کا خیال کیوں آرہا ہے۔" اس نے الجھ کر پوچھا۔
"شاید اس لیے کیونکہ آج مجھے اپنی ماں کی بہت یاد آرہی ہے۔ سوچتی ہوں' ہر بیٹی پر ایسا وقت آتا ہے جب وہ ماں کو یاد کرتی ہے اور تنہا ہوتی ہے۔ یہ وقت تم پر بھی آئے گا۔" انہوں نے پیار سے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ نہیں آئے گا۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔"
"بری بات ہے بیٹا۔ ایسا نہیں کہتے۔ دعا کیا کرو اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے تمہیں اتنا بہترین شریک حیات ملے جو تمہیں ماں باپ کی کمی محسوس ہی نہ ہونے دے۔"
انیبہ کے تصور میں فیضان کا چہرہ روشن ہوگیا۔ "پتا نہیں ممی کو پتا چلے گا تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔" اس نے سوچا ممی کہہ رہی تھیں۔
"یہ جو زندگی ہوتی ہے پہاڑ کی چوٹی سر کرنے جیسی ہوتی ہے 'خصوصاً' عورت کے لیے۔ کچھ انسانوں کو بالکل سیدھی پگڈنڈی ان کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کے راستوں میں تقدیر رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی ہے کبھی انہیں راستے سے بھٹکانے کے لیے تو کبھی ان کا حوصلہ جانچنے کے لیے۔ کامیاب انسان وہ ہوتا ہے جو حوصلہ مندی کے ساتھ بغیر بھٹکے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ جائے۔ میں چاہتی ہوں تم' ولید اور رولی کامیاب انسان بنو۔"
ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا انیبہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔
"ممی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"
"آں۔ ہاں۔" ثروت چونک سی گئیں پھر مسکرا کر کہنے لگیں۔
"میری غیر موجودگی میں تمہیں اپنے ڈیڈی اور بھائیوں کا خیال رکھنا ہے اور جو بھی قدم اٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہے۔ ہو سکتا ہے اس دوران دانیال تمہاری شادی کا ایشو اٹھائیں اور تمہیں فیصلے کا اختیار دیں۔ میں چاہتی ہوں' تم جو بھی فیصلہ کرو۔ بے حد سمجھ داری سے کرو۔"
"ممی!" انیبہ نے الجھ کر انہیں ٹوکا ہر آن اس کی الجھن میں اضافہ ہوا تھا۔ "کیا آپ کا اور ڈیڈی کا جھگڑا ہوا ہے۔"
"نن۔ نہیں۔" ثروت سٹپٹا گئیں۔
"پھر آپ اس طرح کی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ میری شادی ایسا ایشو تو نہیں ہے کہ ڈیڈی آپ کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ کریں۔ دس نہیں تو پندرہ دن کے بعد تو آپ کو واپس آہی جانا ہے۔ جو بھی ہوگا' آپ کی موجودگی میں ہوگا اور پھر مجھے تو ابھی شادی نہیں کرنی۔ ایم ایس سی تو کرلوں پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا آپ ایک بار رولی اور ولید کو بھی بتا دیں کہ آپ کچھ دن نانو کے پاس گزارنے جا رہی ہیں اور کوئی بات نہیں۔"
اس نے ایک اور ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈالی۔ ثروت جو اسے بہت کچھ سمجھانا چاہ رہی تھیں' کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ انہیں یقین تھا۔ دانیال انہیں منانے ضرور آئیں گے۔ لیکن دوسری طرف دل عجیب سے خدشات کا شکار بھی تھا تب ہی وہ ایک بار تینوں بچوں کا ذہن بنانا چاہ رہی تھیں اور بعض اوقات ہم بہت کچھ چاہنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کر پاتے ثروت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے میں ان دونوں کو سمجھا دوں گی۔" ثروت نے گہری سانس بھرتے ہوئے خود کو حالات کے دھارے کے حوالے کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
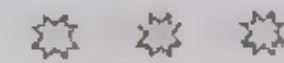
چند روز بعد جلال ثمینہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور تذبذب کی کیفیت میں بیٹھا پہلو پہ پہلو بدل رہا تھا۔

[illegible]دونں کی منتوں کے سامنے مجبور ہو کر آتو گیا تھا لیکن اب سمجھ نہیں پا رہا تھا' اسے بات کہاں سے شروع کرنا [illegible]
[illegible]ی اچھا تھا کہ آج گھر پر ماوی موجود نہیں تھی۔ پچھلی تین بار وہ ثمینہ سے سعدی اور ماوی کے رشتے کی بات [illegible]نے آیا تب ماوی موجود تھی۔ ڈر کے مارے جلال زبان پر ایک لفظ نہیں لا سکا کہ کہیں یہ لڑکی اس پر نہ برس [illegible]ے۔ حالانکہ ہر بار وہ بیٹھی جلال سے باتیں کرتی رہی تھی اور ایک اچھے میزبان کی طرح اسے کمپنی دی تھی۔
[illegible]اسے ثمینہ آنٹی بہت اچھی لگی تھیں۔ وہ بہت مہربان اور پُر شفقت انداز کی خاتون تھیں۔ جلال کو یقین تھا اگر انہیں سعدی کے رشتے والی بات پسند نہ آئی تب بھی وہ برے طریقے سے ردِ عمل ظاہر نہیں کریں گی اور مناسب طریقے سے اسے ٹال دیں گی البتہ ماوی کے بارے میں تو وہ بے حد پر یقین تھا کہ اگر اسے یہ بات ذرا بھی ناگوار لگی تو جلال کو گھر سے نکالنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرے گی۔
ابھی وہ اسی کشمکش میں تھا کہ ثمینہ کچن سے سجی سجائی ٹرالی دھکیلتی نکلیں۔ اتنے لوازمات دیکھ کر جلال چکرا گیا۔
"آپ نے خوامخواہ اتنا تکلف کیا آنٹی! میں تو بس کچھ ضروری بات کرنے آیا تھا آپ سے۔"
"تو کیا یہ ضروری بات چائے پیتے ہوئے نہیں ہو سکتی۔" ثمینہ نے مسکرا کر کہا۔
"چائے ٹھیک ہے لیکن یہ سب؟" اس نے ٹرالی میں سجے لوازمات کو دیکھا۔
"ارے اتنا کچھ نہیں ہے۔ جب سب کچھ چکھو گے تو پتا بھی نہیں چلے گا کہاں گیا سب اور ویسے بھی یہ اخروٹ حلوہ اور چکن رول تو ماوی نے اسپیشلی تمہارے لیے بنا کر رکھے ہیں کہہ رہی تھی۔ ممی جلال میری غیر موجودگی میں آیا تو اسے ضرور کھلا دیجیے گا۔ تم نے شاید بتایا تھا اسے کہ تم کو یہ دونوں چیزیں پسند ہیں۔" ثمینہ نے پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
جلال نے پلیٹ پکڑتے ہوئے خوامخواہ اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کب اس نے ماوی کو اپنی پسند ناپسند کے بارے میں بتایا لیکن وہ اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس بات پر غور بھی نہ کر سکا۔
"تم کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے؟" ثمینہ نے اسے چائے دیتے ہوئے پوچھا۔
"بات دراصل کچھ یوں ہے آنٹی! میں سمجھ نہیں پا رہا' مجھے کہاں سے بات شروع کرنا چاہیے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گھر کے کسی بزرگ کو آپ کے پاس بھجوایا جاتا لیکن آپ سعدی کو جانتی نہیں ہیں۔ اس لیے سعدی کہہ رہا تھا۔ میں پہلے آپ سے بات کرلوں۔ پھر اسے آپ سے ملوا دوں پھر۔" وہ سر جھکائے یوں بول رہا تھا جیسے گھر سے سبق رٹ کر آیا ہو اور بار بار اٹکتا ہو۔
"جلال۔ بیٹے!" کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہو بنا ڈرے یا جھجکے کہیں۔ ورنہ جس طرح آپ کنفیوز ہو رہے ہیں نہ بات مکمل کر پائیں گے نہ میں سمجھ سکوں گی۔" ثمینہ نے رسان سے کہا تب جلال نے گہری سانس اندر کھینچی اور از سر نو بات کا آغاز کیا۔
"میں یہاں یہ بات کرنے نہیں آنا چاہتا تھا آنٹی! لیکن سعدی نے مجھے زبردستی بھیج دیا۔ آپ کو پلیز میری بات اچھی نہ لگے تو۔" اس نے تمہید باندھی۔
"اور یہ سعدی کون ہے۔؟" ثمینہ نے پوچھا۔
"سعدی میرا دوست ہے آنٹی بہت اچھا لڑکا ہے۔ قانون دان بن رہا ہے۔ تین بہنیں دو بھائی ہیں۔ سعدی سب سے چھوٹا ہے فیملی بیک گراؤنڈ بھی اسٹرانگ اور فنانشل اسٹیٹس بھی اسٹرانگ ہے۔"

"تم اپنے دوست کے بارے میں اتنی ساری معلومات مجھے کیوں دے رہے ہو جلال۔" ثمینہ نے الجھ کر پوچھا۔
"کیونکہ میرا دوست آپ کی بیٹی کو پسند کرتا ہے اور ان سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" بالآخر بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔

"کیا؟" ثمینہ کے لبوں سے محض یہی لفظ نکلا۔

"پلیز آنٹی۔ آپ غصہ مت کیجیے گا میں جانتا ہوں۔ کسی کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کا یہ درست طریقہ نہیں ہے۔ سعدی کو اپنے بزرگوں کو لے کر آنا چاہیے تھا لیکن اس نے مجھے زبردستی بھیج دیا۔ آپ پلیز ناراض نہ ہوں۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔ ثمینہ سر پکڑے بیٹھی تھیں اور ان کے چہرے پر صدمہ رقم تھا۔

"میں ناراض نہیں ہوں جلال۔" ثمینہ نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن میں شاکڈ ضرور ہوئی ہوں۔ مجھے لگا تھا تم کچھ اور کہنے آئے ہو۔"

"آنٹی! دراصل لڑکے ۔ بہت جذباتی ہوتے ہیں جس دن سے اس نے مادی کو دیکھا ہے وہ۔ وہ اسی کے بارے میں بات کرتا رہتا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس نے میری کتنی منتیں کیں کہ میں آپ سے اس بارے میں بات کروں۔" وہ ڈرتے ڈرتے اور ناپ تول کر کہہ رہا تھا آخر کو ان کی بیٹی کی بات کر رہا تھا۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری آنٹی! مجھے دوست کی محبت میں بھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا آخر ہر خاندان کے کچھ طور طریقے، کچھ روایات ہوتی ہیں جن کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ آپ کے تو تحمل سے میری بات سن لی۔ اسی ڈر سے میں نے مادی کے سامنے بات نہیں کی کہ اگر ان کو برا لگتا تو وہ میرا سر ہی پھاڑ دیں گی۔"

ثمینہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم مادی کو اتنی اچھی طرح سمجھتے ہو۔ وہ واقعی تمہارا سر پھاڑ دیتی۔" ثمینہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

جلال دل ہی دل میں مطمئن ہوا کہ مادی یہاں موجود نہیں ہے۔

"میں چلتا ہوں آنٹی! امید ہے آپ نے میری بات کا برا نہیں مانا ہوگا لیکن آنٹی۔ اگر سعدی پوچھے تو اس کو انکار کی کیا وجہ بتاؤں ؟" وہ جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگا۔

ثمینہ نے پرسوچ انداز میں اسے دیکھا پھر گہری سانس بھر کر بولیں۔

"تم اپنے دوست سے کہہ دینا مادی اس سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ جلال الدین کو پسند کرتی ہے بلکہ پسندیدگی بہت چھوٹا لفظ ہے، وہ دراصل جلال الدین سے محبت کرتی ہے۔ اب سے نہیں اس دن سے جس دن جلال الدین نے اس کی ماں کی جان بچائی تھی۔"

ثمینہ نے ٹھوس لہجے میں کہتے ہوئے جیسے اس کے سر پر دھماکہ کر دیا تھا۔

"جی۔" جلال ششدر سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہُما انور

مٹھی میں سچ

اگرچہ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا تھا مگر حقیقت یہی ہے کہ ہوا کچھ بھی نہ تھا۔ پھر بھی ایک نامعلوم اداسی فائقہ کے دل میں جگہ بنائے چلی جاتی تھی۔ مسز صدیقی اپنے معمول کے خطاب میں مشغول تھیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، ٹریفک کے مسائل، ملکی سیاست، اخلاقیات، گرتی ہوئی اقدار وغیرہ وغیرہ۔ ان کی مخاطب وہی عام تر عوام تھی۔ جو شاید ان سے بڑھ کر آگاہ تھی۔ وہ حالات حاضرہ کیا حالات غائب پر بھی سیر حاصل گفتگو کر سکتی تھیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں روکنے یا ٹوکنے پر کوئی قادر نہ تھا۔ وہ اسکول کی نہ صرف سینئر ترین (عمر اور تجربے دونوں میں) استاد تھیں بلکہ سینئر سیکشن کی ہیڈ بھی تھیں۔ "وسیع تجربے" کی حامل مسز صدیقی کے لبوں سے تلخی اور مایوسی کا ایک دھارا تھا جو بہتا چلا جاتا تھا اور یہ تلخی وہ دوسروں کے کانوں میں انڈیلنا بھی ضروری سمجھتی تھیں۔ تنقید در تنقید، شکایت در شکایت، کچھ بھی اچھا نہیں ٹھیک نہیں اور نہ شاید ہو سکتا ہے۔ پھر ان کا اصرار یہ بھی ہوتا کہ انہیں نہ صرف سنا جائے بلکہ سر بھی دھنا جائے۔

بریک کا وقت تھا اور تقریباً" سب ہی ٹیچرز لیڈیز اسٹاف روم میں جمع تھیں۔ فائقہ نے اندر کے منظر سے اکتا کر کھڑکی سے باہر نظر کی۔ اسٹاف روم کے آگے پھیلے وسیع برآمدے میں کرسیاں اس کی سوچ کی طرح بے ترتیب پڑی تھیں۔

گرمی کے موسم میں بریک کے اوقات میں یہ برآمدہ ٹیچرز سے آباد رہتا تھا۔ دونوں طرف سے بند برآمدے کے آگے پیپل کا تناور درخت ایستادہ تھا۔ جس کی گھنی چھاؤں، سخت گرمی میں بھی اس جگہ کو حدت سے محفوظ رکھتی تھی۔ سنتے آئے ہیں کہ جنات جب چھپ چھپ کر آسمانوں کی سن گن لیتے ہیں تو ان پر فرشتے پتھر یا کنکریاں برسایا کرتے ہیں، وہی جنہیں ہم شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ ٹیچرز کی نئی خبریں لینے کو چھوٹے جنات اس برآمدے کے آس پاس چھپ کر سن گن لیا کرتے تھے، جن پر مسز صدیقی اپنے لفظوں کی کنکریاں برسایا کرتی تھیں، یوں بھی کنکریاں برسانے کے معاملے میں وہ خاصی سخی تھیں۔ خیر اب اس سے یہ مراد ہرگز نہ لی جائے کہ مسز صدیقی کوئی فرشتہ ہیں۔

فائقہ نے دیکھا۔ برآمدے سے پرے گراؤنڈ میں بچے باسکٹ بال کھیلنے میں مگن تھے۔ "کیسا سنہرا دور، کیسی بے فکری کی عمر ہے یہ۔" اس نے حسرت سے سوچا۔ "نہ بجلی گیس کے بل کا رونا، نہ غم جاناں نہ ہی غم روزگار۔" یہی بات اگر وہ اپنے قریب بیٹھی عفت سے کہے، جو حسب عادت اپنے ہاتھوں میں تھامی ایک کتاب کی ورق گردانی میں مگن تھی تو فائقہ کو علم تھا کہ وہ کیا جواب دے گی۔ وہ یہی کہتی کہ ہاں مگر غم امتحان تو ہے، ہر عمر کے مسئلے دکھ اور پریشانیاں مختلف ہوتے ہیں مگر ہوتے تو ہیں۔ کوئی بھی عمر، کوئی بھی شخص ان سے محفوظ یا مامون نہیں۔

ایک ہی منظر کو دیکھنے والی ہر نظر شاید مختلف ہوتی ہے، کھڑکی کے اندر کا منظر بدستور تھا۔ فائقہ نے ٹھنڈی آہ بھری، چھ مسز صدیقی کی اگلی بات موسم کے ساتھ مل کر ماحول کو سرد کیے دے رہی تھی۔ عفت نے چونک کر سر اٹھایا۔ باسکٹ بال کھیلتے بچوں کے کھلے ہوئے چہروں اور مسز صدیقی کی پیشانی کے بلوں سے پھسلتی ہوئی فائقہ کی نظر عفت پر آرکی۔

"شاید یہ بھی غلط نہیں ہیں۔" زندگی بھی کافی کی طرح جوں جوں سرد ہوتی گئی۔ "تلخ ہوتی گئی۔"

عفت نے مسز صدیقی کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہر بات خصوصاً" لحظہ لحظہ بدلتی زندگی محض ایک مثال سے کیسے واضح کی جا سکتی ہے فائقہ؟" اس نے ایک نظر کھڑکی سے باہر ڈالی۔ "اور بالفرض اگر کی جا سکے تو، کافی ہی کیوں؟ زندگی پیپل کا گھنا، چھتنار درخت کیوں نہیں ہو سکتی؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جس کا سایہ گھنا اور ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے جس کی جڑیں، زمین میں اسی قدر پھیلتی ہیں، جتنا اس کی

شاخیں آسمان کو چھونے کی سعی کرتی ہیں۔ پیپل کے پتے تیز آندھی کا استقبال بھی تالیاں بجا کر کرتے ہیں۔"

عفت کے چہرے کی مسکراہٹ تھی یا [illegible] چند جملے... مگر فائقہ کو لگا بھری دوپہر میں، پیپل کی شاخوں پر مایوسی کی صورت جھولتی تاریکی نے جست بھری اور بچوں کے شور سے بھرے گراؤنڈ کی دھوپ میں غائب ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

فائقہ کو اس اسکول میں پڑھاتے کم و بیش دو سال جب کہ نعمان سے شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ چند مہینے قبل ہی اسے جونیئر سیکشن میں بھیجا گیا تھا۔ نعمان اور فائقہ دونوں کے خاندانوں کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ وہ نعمان کی بینک کی ملازمت کے باعث لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ لاہور آنے کے بعد کچھ عرصہ تو فائقہ نے جوں توں کر کے گزارا۔

دو افراد کے گنے چنے کام صبح کے ابتدائی وقت میں پورے ہو جاتے اور پھر وہ سارا دن اکیلے گھر میں دیواروں سے باتیں کیا کرتی یا اس خاموشی کو توڑنے کے لیے اونچی آواز میں ٹی وی چلا لیتی۔ اور وہ ٹی وی بھی ایک عجب کردار تھا۔ جو خود تو اونچی آواز میں بولے جاتا مگر اس کی ایک نہ سنتا تھا۔ ایک تماشا جس کے اندر تھا اور ایک تماشا جس کے باہر اور فائقہ خود نہ تماشا تھی نہ تماشائی۔

جب اس کی اکتاہٹ اور بے زاری آخری حدوں کو چھو رہی تھی، تو نعمان نے اسے ملازمت کا مشورہ دیا۔ مصروفیت جو اس کے ذہن کو آباد رکھتی۔ اسی کے مشورے سے فائقہ نے اس پرائیوٹ اسکول میں اپلائی کیا اور چند روز میں اسے وہاں ملازمت مل گئی۔ اب وہ سینئر کلاسز کو انگریزی پڑھاتی تھی۔ کوئی معاشی تنگی نہ ہونے کے باوجود جب پہلی تنخواہ اس کے ہاتھ میں آئی تھی۔ تو کیسی فرحت اور آزادی کا احساس اسے ہوا تھا۔ نعمان اسے مطمئن اور خوش دیکھ کر خوش تھا مگر اس کے گرد ہر دوسرا [illegible] شخص بھی ناخوش تھا۔ مایوس اور اکتایا ہوا تھا۔

پھر اکثر اسے بچوں کے ناموں پہ حیرت ہوتی۔ مسرت صدیقی کبھی مسرور دکھائی نہ دیتی تھیں۔ واصف میں اوصاف کی شدید کمی تھی۔ اسکول کے ایڈمن متین صاحب، متانت سے عاری تھے۔ ہاں! البتہ رباب کے تار اکثر و بیشتر چھڑے رہتے اور پرنسپل وقار صاحب، خاصے پروقار تھے۔ یہیں اس کی ملاقات عفت سے ہوئی۔ حیرت اسے یہ بھی ہوئی کہ عفت کے پیشانی پر بل کیوں نہ آتے تھے۔ اس کی آنکھیں تو بچوں پر بھی شعلے نہ برساتی تھیں۔ ہمہ وقت مصروف، مگن اور ہر کسی کی مدد کے لیے تیار عفت، ٹیچرز اور طلبا و طالبات، سب میں مقبول تھی۔ نصابی سرگرمیاں ہوتیں یا غیر نصابی، وہ اپنی مخصوص "امدادی" اور "دوستی" [illegible] سرگرمی میں مگن ہوتی۔ یہ بھی تھا کہ وہ مسرت [illegible] اس کی [illegible] دولت کا اندازہ کبھی [illegible] جیسے کسی بات کی پروا ہی نہ تھی۔

فائقہ نے اس [illegible] کے عرصے میں اسے کبھی اسٹوڈنٹ کو بھی ڈانٹتے، کسی سے بحث کرتے یا کسی کی شکایت کرتے نہ دیکھا تھا۔ یوں بھی وہ ٹیچرز کے درمیان گفتگو میں کم ہی حصہ لیتی اور [illegible] ہر بات کا جواب ایک آدھ جملے میں ہی دیتی تھی۔ فائقہ سوچتی ہاں اس کی ضرورت بھی کیا ہے، بات تو مختصر جواب ہی کر سکتی ہے۔ قائل تو عمل ہی کرتا ہے۔ فائقہ کے متجسس ہونے اور کئی بار اپنے بارے میں دریافت کرنے پر عفت نے اسے بتایا۔

"ارے بھئی وہی عام سے گھر، عام لوگوں سی عام سی کہانی ہے میری۔

میرے والد بھی ایک اسکول ٹیچر تھے اور بہت محنتی بھی اسکول کے اوقات کے بعد وہ ایک جنرل اسٹور چلاتے تھے۔ کچھ عرصے قبل ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ عام سے سرکاری اسکول اور کالج میں پڑھ کر میں نے بی ایس سی کی۔ مڈل کلاس روایات کے مطابق، میرے والدین کو بھی کوئی بیٹا نہ ہونے کا روایتی ملال تھا۔ بیٹا جو

ان کے بڑھاپے کا سہارا بنتا، جو چار بہنوں کی شادیوں [illegible] ... کرتے ہی ایک عام سے گھرانے کے [illegible] شخص سے میری شادی کر دی گئی۔ جو ایک پرائیوٹ [illegible] میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ میری ایک بڑی اور دو چھوٹی بہنیں بھی اب شادی شدہ ہیں اور عام سے گھروں میں عام سی زندگیاں گزار رہی ہیں چھ اور دو سال عمر کی دو بیٹیاں ہیں میری، ایمن اور ندا، مگر وہ دونوں عام نہیں بہت خاص ہیں میرے لیے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ روشن ہو گئی۔

"اس عام سی کہانی میں خاص اور غیر معمولی یہی نرم اور مہربان مسکراہٹ ہے۔" فائقہ نے سوچا۔

عفت ریاضی جیسے مشکل اور خشک مضمون کی استاد تھی۔ مگر مشکل اور خشک زندگی ریاضی کا کوئی سوال تو نہیں، جسے اس نے کسی فارمولے کے تحت حل کر لیا ہو۔ فائقہ کے پوچھنے پر اس نے ایک بار کہا تھا۔

"زندگی کا فلسفہ تو [illegible] مشکل چیزوں کو آسان بنانے پر توانائی خرچ کی جائے نہ کہ آسان چیزوں کو مشکل بنانے پر۔"

عفت کی بڑی بیٹی ایمن اسی اسکول میں کلاس ون میں پڑھتی تھی۔ چوں کہ جونیئر سیکشن میں چھٹی جلدی ہو جاتی تھی۔ سو وہ عفت کے پاس اسٹاف روم میں آ جاتی اور اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔ [illegible] اس کی معصوم آنکھوں میں شرارت تو تھی مگر اس کے لب خاموش رہتے اور برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے کسی پر بیٹھی ٹانگیں جھلایا کرتی یا برآمدے کی سیڑھیوں پر جا بیٹھتی۔

☆ ☆ ☆

ان ہی دنوں نعمان نے فائقہ کو قسطوں پر گاڑی لے دی تاکہ اسے گھر آنے جانے میں سہولت ہو جائے اور وہ بس یا وین کے دھکے کھانے سے بچ جائے۔ گاڑی کی اقساط البتہ اسے اپنی تنخواہ سے ہی ادا کرنی تھیں۔ باتوں کے دوران اس نے یہ ذکر عفت سے کیا تو قریب بیٹھی سیما بول اٹھی۔

"شکر کرو گاڑی ہی کی قسطیں ہیں، تمہیں کم از کم اپنے میاں کی قسطیں تو نہیں بھرنی پڑتیں، رباب کی طرح۔"

رباب بھی اسی اسکول میں پڑھاتی تھی اور ابھی چند ماہ قبل ہی اس کی شادی، اس کی پسند سے اپنے ساتھی ٹیچر واصف سے ہوئی تھی۔ بقول اس کے واصف کو اس کے جیسی ایکٹو، زمانے کے ساتھ چلنے والی اور اپنے پیروں پر کھڑی سیلف میڈ لڑکیاں ہی پسند تھیں۔ سوال تو "لڑکی" کے بجائے "لڑکیوں" پر بھی اٹھ جا سکتا تھا۔ مگر ایسے سوال پر رباب کے تار چھڑنے کا خدشہ تھا۔ وہ شوہر کے شانہ بہ شانہ چلنے میں یقین رکھتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ شانہ بہ شانہ چلنے کی اس کوشش میں اسے سرپٹ بھاگنا پڑ رہا تھا۔

واصف کی تین بہنوں کی شادی ہونا تھا اور رباب اپنے شوہر کی قسطیں بخوشی اپنی تنخواہ سے ادا کر رہی تھی۔ اس امید پر کہ نندوں کی شادی کے بعد اس کے میاں اور گھر پر صرف اور صرف اس کا حق ہوتا۔ اب یہ کون بتا سکتا تھا کہ ایسا ہوتا یا کیسا ہوتا۔

سیما کی دونوں بیٹیاں اسی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اس نے شوقیہ ملازمت شروع کی تھی۔ ابتدا میں اسے یہ بات اچھی لگی کہ وہ اپنی خواہشات کو خود پورا کرنے پر قادر تھی اور ہر معاملے میں اب اپنے شوہر کی محتاج نہ تھی۔ پھر جانے کب خواہشات، اپنی ضروریات میں بدلیں اور پھر بچوں کی ضروریات ہر چیز پر حاوی ہونے لگیں۔ پھر...

"اسٹینڈرڈ" نامی بھوت کو قابو میں رکھنا یعنی مین ٹین رکھنا بھی تو ضروری تھا، یہی سوچ کر وہ خود کو تسلی دے لیتی تھی۔ گھر اور ملازمت، دونوں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر موجود محاذ تھے جہاں اسے مصروف رہنا پڑتا۔ وہ اکثر شکایت کرتی۔

"حیدر تو گھر آتے ہی صوفے پر نیم دراز ہو جاتے ہیں اور ٹی وی آن کر لیتے ہیں۔ کھانا، کپڑے ہر چیز انہیں وقت پر چاہیے۔ بچوں کو بھی میں ہی دیکھوں۔

وہ تو ہر چیز سے بری الذمہ ہوتے ہیں میرے ہاتھ میں مہینے کا خرچ تھما کر۔ میں بھی انسان ہوں، ملازمت میں بھی کرتی ہوں۔ پھر کیا حرج ہے اگر حیدر بھی کبھی گھر کے کاموں میں میری مدد کروادیا کریں۔ جب میں ان کے حصے کی کچھ ذمے داری اٹھائے ہوئے ہوں تو وہ میرے حصے کی ذمے داری شیئر کیوں نہیں کرتے؟"

اس وقت بھی سیما کی گفتگو نے یہی شکایتی ٹرین پکڑ لی تھی۔

رباب نے یہ سب سن کر نخوت سے سر جھٹکا اور اس کے لہجے میں فخر بولنے لگا۔

"ارے! میری ساس اور نندیں اور خاص طور پر واصف تو اس قدر خیال رکھتے ہیں میرا، مجال ہے کبھی کسی کام کو ہاتھ لگانے دیں مجھے۔"

مسز صدیقی چٹکیاں کاٹنے کی عادی تھیں۔ رباب کی بات پر اپنے مخصوص استہزائیہ لہجے میں بولیں۔

"ہاں، انڈے دینے والی مرغی کے دانے دنکے کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے بھئی۔"

کئی قہقہے اسٹاف روم کی فضا کو مرتعش کر گئے اور فائقہ نے سوچا، ہم کس قدر آسانی سے دوسروں پر ہنس لیتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ زندگی بھی میوزیکل چیئرز کا کھیل ہے کوئی بھی کبھی بھی کسی دوسرے کی جگہ لے سکتا ہے۔ بات کا رخ بدلنے کو اس نے اپنا رخ عفت کی طرف کیا۔

"خود کمانے پر پیسے کی زیادہ قدر آجاتی ہے، میرا تجربہ تو یہی ہے کہ محنت سے کمایا ہوا روپیہ ہم سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں۔"

لیکن عفت کی سوئی کسی اور نکتے پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ چند ثانیے اپنے الفاظ کو تولتی رہی اور پھر جب بولی تو اس کا لہجہ کسی نامحسوس حزن میں لپٹا ہوا تھا۔

"ہاں، مگر کبھی تم نے غور کیا؟ مرد چاہے واصف کی طرح بھائی ہو یا حیدر کی طرح باپ، یا نعمان کی طرح شوہر وہ اسی محنت سے کمائے گئے روپے کو ہمیشہ دوسروں پر، اپنے خاندان پر خرچ کردیتا ہے۔ مانا کہ اس دوران اس سے کسی ایک کی بیوی یا بہن یا ماں کی حق تلفی بھی ہو جاتی ہوگی۔ مگر سوچو اپنی کمائی کا کتنا حصہ وہ خود پر خرچ کرتا ہے؟ اس کا رتبہ اگر کسی قدر بلند یا الگ ہے تو شاید اسی لیے۔"

"اب تم خود کو مردوں کے حقوق کی علم بردار ثابت نہ کرو عفت! ہر کوئی تمہاری طرح مطمئن اور آسودہ زندگی نہیں گزار رہا۔" سیما نے چڑ کر اس کی بات کاٹی۔

"پھر انہیں افلاطون کون کہے گا۔" مسز صدیقی کی پیشانی کے بل فائقہ کو لگا کہ پیدائشی نشان کی طرح تھے، شناختی علامت۔

"اور جو شخص ایسا نہ کرتا ہو..." عفت نے خود کلامی کی اور ایک گہری سوچ اس کی آنکھوں کی تہہ میں آبیٹھی۔

☆ ☆ ☆

مسز صدیقی، عفت سے خار کھاتی تھیں۔ یہ بات کچھ ایسی ڈھکی چھپی بھی نہ تھی۔ عفت کو یہاں پڑھاتے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے جب ایک صبح مسز صدیقی نئی نسل کی غیر ذمے داری کے موضوع پر خطاب فرما رہی تھیں۔ نئی نسل کہ ابہام جس کی سرشت میں تھا۔ ہر بات کہہ دینے اور سوال پوچھنے کا درس تو انہیں پہلے روز سے دیا جا رہا تھا۔

اس درس کی زد میں کبھی کبھی مسز صدیقی بھی آجاتی تھیں۔

مگر یہاں وہ کچھ مجبور بھی تھیں۔ نئی کارپوریٹ دنیا کے جدید اصولوں کے مطابق یہ طلبا و طالبات بھی "کلائنٹس" ہیں۔ انہیں ناراض کرنے کا تحمل کوئی نہیں ہوسکتا۔ ان "کلائنٹس" کے مستقبل پر روشنی ڈالتی مسز صدیقی کی تقریر اپنے عروج پر تھی، جب عفت اسٹاف روم کے اندر داخل ہوئی۔ کیبنٹ سے جرنلز نکالنے اور واپس مڑنے کے دوران وہ کہہ اٹھی۔

"یہ آج کی نسل ہے مسز صدیقی! انہیں مستقبل کا حال نہیں۔ حل بتائیے۔ سوچیے... "حال" میں "حل"

...ف مشاغل ہیں نئی۔ اور پھر وہ استاد ہی کیا جو ... سے لیے سوالات حل نہ کرسکے۔"

...ن کے بعد سے مسز صدیقی نے عفت کو اپنے ...نی زد پر رکھ لیا تھا۔ بیشتر اوقات وہ عفت کو "...ت" کہہ کر پکارتیں اور ظاہر یوں کرتیں جیسے اس ...نام کے صحیح تلفظ میں انہیں دشواری ہو۔ ان کے ...ل میں وہ خود کو افلاطون سمجھتی تھی۔ (اب جانے ...لاطون ریاضی دان تھا بھی یا نہیں) اس کی سدا بہار ...اہٹ ڈھکوسلا تھی، سب کی گڈ بک میں آنے کی ...ش میں سرگرداں عفت، ڈرامے باز تھی اور ...بق۔ وہ اس کے یک سطری جوابوں سے چڑ جایا ...تیں۔ سو اب عفت ان کے سامنے حتی الامکان ...وش رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ البتہ جب ان کی ...اڑتے اڑتے عفت کے کانوں پر آبیٹھتی تو وہ اسے ...بھی کسی مکھی کی طرح اڑا دیتی۔

...وئی بھی ہر کسی کی نظر میں تو اچھا نہیں بن سکتا۔ ...نیا آپ کی معترف ہو جائے پھر بھی کوئی نہ کوئی تو ...مانہ ور ہوگا۔ جو آپ کو برا سمجھے گا، کہے گا بھی۔ ...ت دنیا نے تو پیغمبروں اور ولیوں کو نہ چھوڑا، پھر ہم ...شمار ہی اوقات کیا۔"

صرف عفت پر ہی کیا موقوف، مسز صدیقی، (ا)... ہزار فٹ سے زائد بلندی پر محو پرواز کسی ...ن طیارے کی طرح، کسی پر بھی یک لخت حملہ کردیا ...رتی تھیں۔ حملے سے چند سیکنڈ پہلے تک سب کچھ ...ول کے مطابق اور متاثرہ شخص بے خبر ہی رہتا۔ ...ی شادی نہ ہوسکی تھی، اب تک تو کیوں آخر؟ ...کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے؟ رباب کی ...ی تھی تو کیسے؟ اور اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ ...ں، نندوں کا حال؟ میاں کا احوال؟ فلاں کی ...بھیاں کیسی ہیں؟ کس نے کس کا جینا حرام کر رکھا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو ہر قسم کی ہر خبر پر نظر رکھنا اور تبصرہ کرنا اپنا حق جانتے ہیں۔ وہ درمیانی عمر کی خاتون تھیں۔ بیٹا ڈاکٹر تھا اور امریکہ میں رہتا تھا۔ ...اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ میں آباد تھی۔ مسز صدیقی، اپنے شوہر کے ہمراہ پاکستان میں رہائش پذیر تھیں۔ ان کے بدخواہوں کی دیرینہ آرزو تو یہ بھی تھی کہ مسز صدیقی کی بہو ان کے گھر کو رونق بخشنے کے لیے جلد سے جلد آجائے، تاکہ وہ اپنی تیر اندازی کا ہنر اس پر آزمایا کریں۔ کچھ ان کے دل کو سکون ملے، کچھ باقی سب کو چین نصیب ہو۔

اس روز، ان کے توپ خانے نے اچانک فائقہ پر گولہ باری شروع کردی۔ "ارے بھئی فائقہ! تمہاری شادی کو کتنے سال ہوگئے؟"

"تین سال تو ہوچکے ہیں۔" اس نے قدرے حیرت سے ان کا سوال سنا، مگر وہ سوال کئی دوسرے سوالوں کا آغاز تھا۔

"کتنے بچے؟"

"کوئی نہیں؟"

"کیوں؟" فائقہ، فق ہوتے چہرے کے ساتھ قدرے اٹک اٹک کر ان کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ چند سال قبل، جب فائقہ کی بھابھی پہلی مرتبہ اس کے بھائی کے پاس امریکہ گئی تھیں، تو چیکنگ کے دوران ایئرپورٹ کے عملے نے ان کا سوٹ کیس کھول کر تلاشی لی تھی۔ بعد میں انہوں نے یہ واقعہ فائقہ کو بہت مزاحیہ انداز میں سنایا تھا، لیکن اس وقت فائقہ کو ان کی شرمندگی اور کوفت کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا بھرے مجمع میں مسز صدیقی نے اس کا سوٹ کیس کھول دیا ہو اور اب ایک ایک چیز کو جھٹک جھٹک کر اس کا جائزہ لے رہی ہوں۔

جب وہ اپنے حواسوں میں واپس آئی تو مسز صدیقی موجودہ زمانے کی لڑکیوں میں احساس ذمے داری کے فقدان پر محو گفتگو تھیں۔ بولتے بولتے انہوں نے کیسٹ بدلی اور اب ان کا روئے سخن مہوش کی جانب تھا۔ مہوش حال ہی میں اپائنٹ کی گئی تھی اور وہ اسکول کے پرنسپل وقار صاحب کی بھانجی تھی۔ انہوں نے مہوش سے اس کے شادی شدہ ہونے کے بارے میں پوچھا تھا۔ مہوش نے اپنے سیل فون کے بٹنوں سے کھیلتے کھیلتے سر اٹھایا، ان کا سر سے پیر تک طائرانہ جائزہ

لیا اور بولی۔

"ہوئی تھی شادی، مگر اب میں اپنے شوہر کو ناک آؤٹ کر چکی ہوں۔" اس کا لہجہ پُرسکون تھا اور انداز میں بے پروائی تھی۔ بقول اس کے اس نے شادی کسی کے ناز نخرے اٹھانے، کھانا پکانے اور شوہر کی شرٹس استری کرنے کے لیے نہ کی تھی۔ فائقہ نے گہری سانس لی اور سوچا کوئی اسے بتائے کہ شادی کا دوسرا نام میاں کی جرابیں دھونا اور کھانا پکانا ہی ہے۔ مسز صدیقی کو اگلا سوال کرنے کا موقع نہ دیتے ہوئے مہوش نے سرد مگر ہموار لہجے میں پوچھا۔

"مسز صدیقی! آپ کی بیٹی کی شادی کو بھی تو غالباً چھ سال ہو چکے ہیں، اس کے کتنے بچے ہیں؟"

مسز صدیقی کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔

"ارے کہاں، اس کے شوہر نے ایک انڈونیشی پیر کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہے اور ان پیر صاحب نے انہیں ابھی اولاد سے منع کر رکھا ہے۔"

فائقہ اپنی افتاد بھول گئی۔ اس کے تو چودہ طبق روشن ہو چکے تھے، جب وہ بولی تو اس کی آواز معمول سے کچھ بلند ہی تھی۔

"جس بات سے اللہ منع نہیں کرتا، اس سے کوئی پیر یا اللہ والا کیسے منع کر سکتا ہے؟"

"چاہے وہ پیر انڈونیشی ہی کیوں نہ ہو۔" مہوش کا قہقہہ خاصا بلند تھا۔ بعد میں یہ سارا واقعہ عفت کے گوش گزار کرتے ہوئے فائقہ نے کہا۔

"ہر فرعون کو کسی نہ کسی موسیٰ کا سامنا کبھی کرنا پڑ ہی جاتا ہے۔" عفت نے مسز صدیقی کے چہرے کے پھیکے رنگ دیکھے اور بولی۔ "ہاں، مگر ہر فرعون کو نہیں، موسیٰ کوئی ایک ہی ہوتا ہے، ایک بار ہی آتا ہے اور اس سے قبل کئی ہزار سال تک ہر فرعون کے گھر میں فرعون ہی پلتا ہے اور وہ ہی اس کی جگہ لیتا ہے۔"

فائقہ کو محسوس ہوا، مہوش کی صورت ایک ننھا منا فرعون جنم لے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہوا، برف کی طرف جامد ہوئی تھی اور دھند لہروں کی صورت بُت تھی۔ وہ جنوری کی ایک خاموش صبح تھی۔ اسکول شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا اور اسٹاف اور طلباء و طالبات کی آمد جاری تھی۔ فائقہ چلتے چلتے چند لمحے کے لیے رک گئی۔ جس منظر کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو، ایسا منظر دیکھنے والا ہوتا ہے۔ اس کے گرد ہر طرح کے چہرے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اداس، مسرور، مگن، لاپروا، اکتائے ہوئے، زندگی اپنے تسلسل کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اسکول میں مختلف کلاسز کے ماہانہ ٹیسٹ ہو رہے تھے اور ہر کوئی مصروف تھا، عجلت میں تھا یا کم سے کم ایسا دکھائی دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ البتہ ہمیشہ مصروف رہنے والے دو ہاتھ، آج عفت کی گود میں ساکت پڑے تھے۔ وہ گراؤنڈ کے ایک کونے میں رکھے گئے سنگی بینچ پر بیٹھی تھی۔ بینچ کی ٹھنڈک کو دور سے ہی محسوس کر کے فائقہ کو جھرجھری سی آگئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عفت کے پاس چلی آئی۔

"دھوپ کے انتظار میں بیٹھی ہو تو وہ شاید آج سارا دن دکھائی نہ دے گی۔"

عفت نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی ناک سردی سے سرخ ہو رہی تھی، جبکہ بائیں آنکھ کا نچلا حصہ نیلا دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" فائقہ نے بے ساختہ تشویش سے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا حادثہ ہو گیا تھا۔" عفت کی آواز ہوا میں منجمد ہو رہی تھی۔ اس نے دھند میں لپٹی اسکول کی عمارت پر نظر جما دی۔ فائقہ چند لمحے عفت کے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ جیسے تمہاری آنکھوں کے پیچھے کوئی دریا بہہ رہا ہے؟"

عفت کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔ "دریا تک پہنچنے کے لیے بھی تو دریا سے گزرنا پڑتا ہے، ہم بھی گزر آئیں؟"

"ہاں! دریا کا پاٹ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ مگر دریا تو سب کو ہی پار کرنا پڑتے ہیں۔ مگر تمہارے ساتھ ہوا کیا

ہے؟"

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے عفت نے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں' دو دن کی چھٹی لے لوں' کچھ بہت ضروری کام نمٹانے ہیں اور امی کی طبیعت بھی کل سے ٹھیک نہیں' انہیں میرے ہونے سے ڈھارس رہے گی۔" یہ ایک اور انہونی تھی۔ عفت اور چھٹی؟ اور وہ انہونی کس قدر بڑی ہے' جو اس کی آنکھوں کے نیچے بستی ہے' فائقہ نے سوچا۔ مگر اس کی زبان پر آنے والا سوال دوسرا تھا۔

"اور ایمن! اس کی بھی تو ایگزامز ہو رہی ہیں نا!"

"ہاں' مگر کام ضروری ہیں۔ میں اسے اسکول چھوڑ بھی جاؤں تو واپسی کا مسئلہ ہوگا۔ اس وقت میں جانے کہاں ہوں گی' کہاں نہیں' اس کی فکر لگی رہے گی۔"

"ارے' تو میں چھوڑ دوں گی اسے گھر۔" فائقہ نے کہا۔

"تمہیں تکلیف ہوگی۔" عفت کو تامل تھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تکلیف ہوگی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو دو ہی دنوں کی بات ہے صرف۔"

"میں آج اپنی امی کی طرف ہوں فائقہ! تمہیں خاصا لمبا چکر پڑے گا اور وقت بھی ضائع۔" فائقہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بحث مت کرو' میں آج واپسی پر تم دونوں کو گھر چھوڑ دوں گی' رستہ بھی دیکھ لوں گی۔"

عفت بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی' لیڈیز اسٹاف روم تک پہنچتے پہنچتے اس کی آنکھوں کے پیچھے بستا دریا دھند کی کسی لہر میں گم ہو چکا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے فائقہ نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دھوپ جس کے سارا دن دکھائی نہ دینے کی پیش گوئی اس نے ابھی ابھی کی تھی۔ وہ نہ صرف عفت کے چہرے بلکہ گراؤنڈ میں بھی نکل آئی تھی۔ اور جب سورج کی کرنیں' دھند کی دبیز تہہ کو چیر کر زمین پر اتریں' تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھاس پر پانی کے ننھے ننھے قطرے چمکتے تھے اور ایک معمول کے دن کا آغاز ہو گیا تھا۔

اتنے مصروف دنوں میں عفت کو وقار صاحب نے چھٹی بھی محض اس لیے دے دی کہ وہ انتہائی ضرورت کے تحت شاذ و نادر ہی چھٹی لیا کرتی تھی۔

مسز صدیقی حسب عادت' عفت کے چہرے کے اس نیلے نشان کے متعلق متجسس تو ضرور ہوئیں' مگر کھوج کچھ نہ پائیں۔ اس کے تاثرات معمول کے مطابق تھے۔ خوش گوار اور روشن۔ انہونی دھوپ میں تحلیل ہو چکی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے آج کی تقریر کا موضوع نہ بنا پائیں۔ کچھ یوں بھی آج کل ان کی توجہ کا مرکز مہوش کی ذات تھی اور وہ اپنے تخت کے لرزتے پائے جمانے میں مصروف تھیں۔

☆ ☆ ☆

فائقہ کے ساتھ بیٹھی ایمن اسی طرح خاموش تھی جیسا کہ وہ عام طور پر ہوا کرتی تھی۔ اس کی نظریں سڑک پر بھاگتی ٹریفک پر جمی تھیں۔ فائقہ کو محسوس ہوا کہ جیسے اس ننھی بچی کے چہرے پر کسی نے بوڑھی آنکھیں لگا دی ہوں۔ میں شاید وہمی ہوتی جا رہی ہوں اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر اس نے راستے پر نظریں جمائیں۔ مین روڈ پر جاتے ہوئے جب بائیں طرف گرجا کی عمارت دکھائی دیتی تو اس عمارت کے عین بالمقابل سڑک پر اسے دائیں جانب مڑنا تھا۔ گلی کے کونے پر ایک سبزی کی دکان تھی۔ سبزیوں کے ٹوکرے آدھی سڑک تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گلی اس قدر چھوٹی بھی نہ تھی اور ابھی فائقہ کی گاڑی اور انا اس قدر بڑے نہ ہوئے تھے کہ وہ اس میں داخل نہ ہو پاتی۔ گاڑی پارک کر کے اس نے سبز گیٹ والے اس چھوٹے سے گھر کی گھنٹی بجائی۔

دروازہ کھولنے والی خاتون عفت کی والدہ تھیں۔ عمر میں تو مسز صدیقی کے برابر ہی رہی ہوں گی' مگر ان کی پیشانی شکن آلود نہ تھی۔ ایک نرم اور مہربان مسکراہٹ نے فائقہ کا استقبال کیا۔ یہ مسکراہٹ تیسری نسل کو منتقل کیوں نہ ہو پائی تھی' فائقہ نے

[illegible] چہرے کو دیکھ کر سوچا۔ وہ پرانی طرز کا بنا ہوا [illegible] سا مکان تھا۔ جس میں [illegible] نفاست اور ترتیب دکھائی [illegible] عفت کی ذات میں تھی۔

"[illegible] عفت کی دوست ہو؟ تمہارا ذکر اس سے کئی [illegible] سنا ہے۔" عفت کی والدہ کے لہجے میں [illegible] تھی۔ ان کی آنکھوں سے ہراس جھانکنے لگا۔

"عفت آتی ہی ہوگی بس۔ کچھ اس کو سمجھاؤ بیٹی۔ [illegible] یوں ہی نہیں بن جاتے۔"

فائقہ کو عفت کی نگاہوں سے جھانکتی انہونی یاد [illegible] "ہوا کیا؟"

"اس کے شوہر نے اس کو نکال دیا گھر سے' مگر بیٹا [illegible] گنجائش ہوگی نا؟ کوئی تو راہ ہوگی۔ ندا کو اسکول [illegible] ہوئے میرے پاس چھوڑ جاتی ہے' کل بھی چھوڑ [illegible] اب میں کیا جانوں کہ ہوا کیا تھا؟ واپس آئی تو بتایا [illegible] اس کے شوہر شفیق نے اسے طلاق دے دی۔ میں [illegible] آج اس کی ساس سے بات کی تو وہ بولی کہ شفیق تو [illegible] سے گھر سے غائب ہے' وہ واپس آئے تو اپنے [illegible] دوسری شادی کروائے گی۔ اسے پروا ہی نہیں۔ [illegible] واپسی کا راستہ نہیں۔ آج [illegible] کرنے طلاق موثر کروانے کے لیے ارے [illegible] دنیا [illegible] کہ بہو نے اپنے فائدے اور [illegible] کے لیے بیٹی کو گھر بٹھا لیا۔ بیٹیوں کی ماں ہے [illegible] ان کے مستقبل کا بھی سوچے۔" ان کی زبان [illegible] اور وسوسے' سوکھے پتوں کی طرح جھڑتے [illegible]

[illegible] مکدر ہو گئی' یہ عفت اپنے حال میں مگن اور [illegible] یا حد سے زیادہ لاپروا؟ بوڑھی آنکھوں والی مطمئن ماں؟ اسی اثناء میں عفت گھر آ چکی تھی۔

"[illegible] کی راہ تو اس نے کوئی چھوڑی ہی نہیں امی! [illegible] تو میں نہ پلٹتی۔ افسوس مجھے یہ ہے کہ اب [illegible] فیصلہ اس نے کیا۔ اور دنیا کی بات مت [illegible] کے لیے یہ سارا قصہ آج کی تازہ خبر ہے' جو [illegible] بھلا دے گی۔"

"[illegible] تیری ساس کہتی تھی' وہ بیٹیاں لے لیں [illegible] مجھ سے۔" اس کی امی کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔

"شوق سے.... اگر وہ انہیں کما کر کھلانے اور ان کی ذمے داری اٹھانے کے قابل ہوتا تو اور مسئلہ ہی کیا تھا امی! وہ محنت نہیں کر سکتا اور اولاد پالنے کے لیے مشقت کرنی ہوتی ہے' سو بے فکر رہیں۔"

"اس قدر بڑی بات پر بھی تم مطمئن کیسے ہو؟" فائقہ کے ہونٹوں پر سوال آ ہی گیا۔ عفت کے لہجے میں اس نے پہلی بار تلخی محسوس کی۔

"یہ بے نیازی نہیں ہے' حقیقت پسندی ہے فائقہ! مڈل کلاس کی مڈل پاس ماؤں کی اولاد کو گھٹی میں یہ سخت جانی اور حقیقت پسندی ہی تو ملتی ہے۔"

"لیکن ہوا کیا تھا آخر؟"

اس سوال کا جواب عفت نے ندا کو بہلاتے سب کے لیے کھانا لگاتے اور ایمن کو کھانا کھلاتے ہوئے دیا۔

شفیق سے اس کی شادی جس رشتہ کروانے والی کے توسط سے ہوئی تھی' اس کے مطابق وہ بی کام کر چکا تھا اور ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ نسبتاً بہتر علاقے میں پانچ مرلے کے گھر اور گھر میں کھڑی دو' دو موٹر سائیکلوں کا ذکر بھی اس نے کیا تھا۔ عفت کے والدین کو یہ رشتہ اس کے لیے بہترین لگا' سو اس کی شادی طے کر دی گئی۔ شادی کے بعد کھلا کہ گھر میں کھڑی وہ موٹر سائیکلیں شفیق کے بھائیوں کی تھیں۔ تین شادی شدہ اور بال بچے دار بھائی بھی اسی چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تو وہ ضرور تھا۔ مگر شادی کے سلسلے میں وہ اسے چار روز سے زیادہ چھٹی دینے کو تیار نہ تھے۔ اسی تنازعے پر شفیق شادی سے پہلے ہی نوکری چھوڑ چکا تھا۔

"بعد میں تم نے اپنے والدین کو بتایا نہیں یہ سب؟" فائقہ نے پوچھا۔

"کیا کرتی بتا کر؟ شادی تو ہو ہی چکی تھی۔ میکے آنے پر ابو' شفیق کے بارے میں پوچھتے تو میں یہ ہی بتاتی رہی کہ اس نے آج چھٹی کی تھی' دفتر سے یا جلدی آ گیا

تھا۔"

عفت کے لیے یہ سب کچھ بالکل نیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو دن رات محنت کرتے دیکھا تھا۔ مردوں سے متعلق اس کی ساری دنیا اور معلومات اپنے باپ تک محدود تھیں۔ اس کا شوہر نہ صرف بے روزگار بلکہ کم ظرف بھی تھا۔ اسے کہیں ٹک کر کام کرنے، محنت کرکے کمانے اور ذمے داری کا بوجھ ڈھونے کی عادت نہ تھی۔ اس عرصے میں اس نے کئی بار نوکری کی اور ہر مرتبہ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں پر چھوڑ دی۔

ایک سال کا عرصہ تو عفت نے جوں توں کرکے گزار لیا اور پھر ایمن کی پیدائش کے بعد ایک اسکول میں نوکری کرلی اور زندگی کی گاڑی میں جت گئی۔ عام کام چور مردوں کی طرح شفیق نے بھی اسے زندگی کی اس گاڑی میں جوتنے کے بعد ہاتھ میں چابک اٹھا لیا۔ کچھ مدد تو عفت کے والد بھی اس کی کرتے رہتے تھے۔ خراج کی وہی رقم، جو بیٹی یا بہن کی شادی کے بعد کئی باپ، بھائیوں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ سو وہ بھی ادا کرتے رہے۔

تقریباً" ایک سال بعد عفت کے والد کا انتقال ہوگیا تو خراج کی یہ رقم شفیق کو ملنی بند ہوگئی۔ ایمن بھی اب اسکول جانے لگی تھی۔ فیس تو عفت کو اپنے ٹیچر ہونے کے باعث ادا نہیں کرنی پڑتی تھی، مگر دوسرے خرچ تو تھے۔ پھر بڑھتی ہوئی مہنگائی، سو اب شفیق نے اس پر ہاتھ اٹھانا بھی شروع کردیا تھا۔

ایک ہی گھر میں رہنے کے باعث، ایمن اور ندا اپنے تایا اور چچا کو اپنے کزنز کے لاڈ اٹھاتے، فرمائشیں پوری کرتے دیکھتی تھیں۔ سارے باپ ان کے باپ جیسے نہیں تھے۔ ساری مائیں ان کی ماں جیسی نہ تھیں جو سارا دن زندگی کی چکی میں پستی تھی اور شام ڈھلے ان کے باپ سے مار کھاتی اور کسی کونے میں بیٹھی آنسو بہاتی۔ ان کی چچی اور تائی بھی تو مائیں تھیں، بیویاں تھیں، جو ناز بھی اٹھواتی تھیں، نخرے بھی دکھاتی تھیں۔ اسی گھر میں ان کی دادی بھی تھیں، جو وقتاً" فوقتاً" عفت کو شوہر کے حقوق یاد دلاتی اور تخت پر بیٹھی تماشا دیکھا کرتی۔ ان کے معصوم ذہن سوچتے تو ہوں گے کہ کچھ حقوق ان کے بھی تھے یا نہیں؟ اور جو فرائض ادا کرتے ہیں، کیا ان کے حقوق معاف ہوجاتے ہیں۔

عفت بولی۔ "اور پرسوں بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کے ہاتھ اٹھانے پر میں نے سوچا، گھر میں چلاتی ہوں، نہ صرف بچوں بلکہ خود اس کی کفیل بھی میں ہوں۔ کام گھر کے اندر کے ہوں یا باہر کے، چھوٹے ہوں یا بڑے، وہ میرا مددگار نہ تھا، میری زندگی میں وہ کہیں نہ تھا، تو پھر میں اس کے گھر میں کیوں تھی؟ صرف اس لیے کہ وہ میری بیٹیوں کا باپ تھا؟ مگر شفیق نے تو کبھی ان پر بھی شفقت نہ کی تھی۔ ایمن کے اسکول میں داخلے پر اس نے کہا تھا کہ کیا کرلے گی یہ پڑھ کر؟ زیادہ سے زیادہ تم جیسی بن جائے گی۔

اور میں کیسی تھی؟ کیسی ماں؟ جس کا شوہر اس پر ہاتھ اٹھاتا تھا اور ایمن کمرے کے کونے میں بیٹھی آنکھوں میں خوف اور آنسو لیے مجھے [illegible] مجھ جیسی بن [illegible] خوف زدہ بچپن [illegible] باپ کا سایہ اس کے لیے احساس تحفظ کی ضمانت کیوں نہ تھا؟ اور پھر اس سب کے باوجود صرف شفیق کا ہاتھ اٹھے گا، کیا؟ میرا کیوں نہیں؟ سو اس روز میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا۔ اس کے لیے یہ اس قدر غیر متوقع بات تھی کہ اس نے اشتعال کے عالم میں مجھے طلاق دے دی۔ اور تب سے وہ میرے لیے بھی غائب ہے۔ یقیناً کسی [illegible] کے تحت کہ بقول مسز صدیقی اس نے انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کرلیا ہے۔"

عفت کی گود میں لیٹی ندا سوچکی تھی اور باہر صحن میں دھوپ ڈھل رہی تھی۔

"اور تمہاری بیٹیاں؟ تم جس قدر بھی حق بجانب سہی، جو ہونا تھا ہوچکا۔ اور اب کل کو انہیں سننا ہوگا کہ وہ ایک طلاق یافتہ ماں کی بیٹیاں ہیں۔" فائقہ نے تاسف سے کہا۔ وہ ہی مستقبل کا خدشہ اور مستقبل کیسا تھا؟ یہ کون جانتا تھا؟

"میں نے ایسا چاہا تو نہیں تھا، مگر جو ہوا ٹھیک ہوا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوتا رہا میں نے تو وہ بھی نہیں چاہا تھا۔ مجھے اس نے کبھی تو سوچا ہوگا جس نے زندگی دی [illegible] جو کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے، زندگی سے [illegible] بنا ہے اسے حل کرلو۔ کل کا سوال کل آنے پر دیکھ لیں گے۔"

"تمہیں یاد ہے وہ کہانی؟ جس میں بادشاہ کی پوچھی جانے والی ہر بات پر اس کا وزیر باتدبیر یہی جواب دیتا تھا کہ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے، اسی میں بہتری ہے۔"

"ہاں۔" عفت مسکرائی۔ "اور اسی کی پاداش میں اس سرپھرے بادشاہ نے اس وزیر کو ایک روز کنوئیں میں الٹا لٹکانے کا حکم جاری کردیا تھا۔"

"جیسے تم سسرال کے کنوئیں میں ڈال دی گئیں۔" فائقہ نے کہا۔

"ہاں، مگر کہانی کے آخر میں اس وزیر کی بات سچ بھی تو ثابت ہوگئی تھی اور اسے کنوئیں سے اسی بادشاہ نے نکلوایا تھا۔ کنوئیں میں تو سب کو ڈالا جاتا ہے۔ فائقہ! بس سب کے کنوئیں الگ الگ ہیں۔ سب کے مسائل مختلف ہیں، فرق [illegible] ہمارے [illegible] امتحان کی جگہ ہے [illegible] کسی کو اس کی برداشت، ہمت اور ظرف کے مطابق سوال حل کرنے کو دیے جاتے ہیں۔ میرے اور تمہارے سوالوں میں، امتحان میں فرق ہوگا، مگر اس امتحان سے گزرنا تو ہم سب کو ہے۔ اس امتحان سے کسی کو مفر نہیں۔"

"تمہارے دل میں شکایت تو آتی ہوگی کہ تم ہی کیوں؟"

"خدا اور لوگوں سے شکایت، سوال حل کرنے اور امتحان میں کامیاب رہنے میں مدد تو نہیں دے سکتی۔"

"ان سب حالات کے باوجود تمہارے اندر تلخی ہے، نہ پیشانی پر بل۔ حساس لوگ تلخ ہو ہی جاتے ہیں، ان حالات میں۔" فائقہ نے کہا۔

"ہاں مگر میں تلخ ہونا نہیں چاہتی۔ ہماری کیفیات اور جذبات خود ہمارے اندر ہوتے ہیں۔ اداسی، تکلیف، خوشی اور اطمینان، سب کا مرکز ہماری اپنی ذات ہے فائقہ! کوئی دوسرا نہیں۔ حالات ہمارے کنٹرول میں نہیں رہتے، مگر خود ہماری ذات بہت حد تک ہمارے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا ہمیں خوشی سے، خوش رکھے کیوں؟ اطمینان اور خوشی کے حصول کا ذریعہ دوسرے نہیں، ہم خود ہیں، چاہو تو ہنس کر گزار دو، چاہو تو تلخی سے، زندگی تو اپنی سوچ، خود اپنی مٹھی میں ہے۔"

"مگر تم کبھی تو دوسروں سے اپنا موازنہ کرتی ہوگی عفت؟ تمہیں کیا ملا؟ تم نے کیا پایا؟" فائقہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے کیا ملا؟" عفت کے چہرے پر مسکراہٹ چمکنے لگی۔ "مجھے کچھ دوست ملے، جو میری آنکھوں کے پیچھے بہتے دریا تک پہنچنے کے باوجود اس کی تشہیر نہیں کرتے۔ انسان کی کمائی انسان ہوتے ہیں، پیسہ نہیں، اپنے لیے دعا کرنے والے ہاتھ کماتا ہے انسان، اس زندگی میں، جو دونوں زندگیوں کو آسان کردیتے ہیں۔ میری بیٹیاں میرا سرمایہ ہیں اور میرے اندر کی نرمی، میری آنکھوں کی چمک اور میرے چہرے کی مسکراہٹ میری کمائی ہے۔ ایسی کمائی، جو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ مجھے محسوس کرنے والا دل دیا گیا، سوچنے والا ذہن عطا کیا گیا، دیکھنے والی آنکھ دی گئی، اور کیا چاہیے؟"

فائقہ جب عفت کے گھر سے نکلی تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی اور زندگی اپنے تسلسل کے ساتھ جاری و ساری تھی۔ وہ آج تک یہی سنتی آئی تھی کہ عورت خصوصاً" مشرق کی عورت، مٹھی میں ریت بھر کر زندگی گزارتی ہے۔

"ہر بات مثال سے واضح نہیں کی جاسکتی۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ ریت ہی کیوں؟ بیج کیوں نہیں؟ اور عورت ہی کیوں؟ مرد بھی کیوں نہیں؟ زندگی مٹھی میں بیج بھر کر بھی تو گزاری جاسکتی ہے۔ مستقبل کے بیج، دعاؤں کے بیج، خوشیاں اور آسانیاں بانٹنے کے بیج، حکمت، دیانت اور سچائی کے بیج، جو دوبارہ کاشت کیے جاسکتے ہیں۔
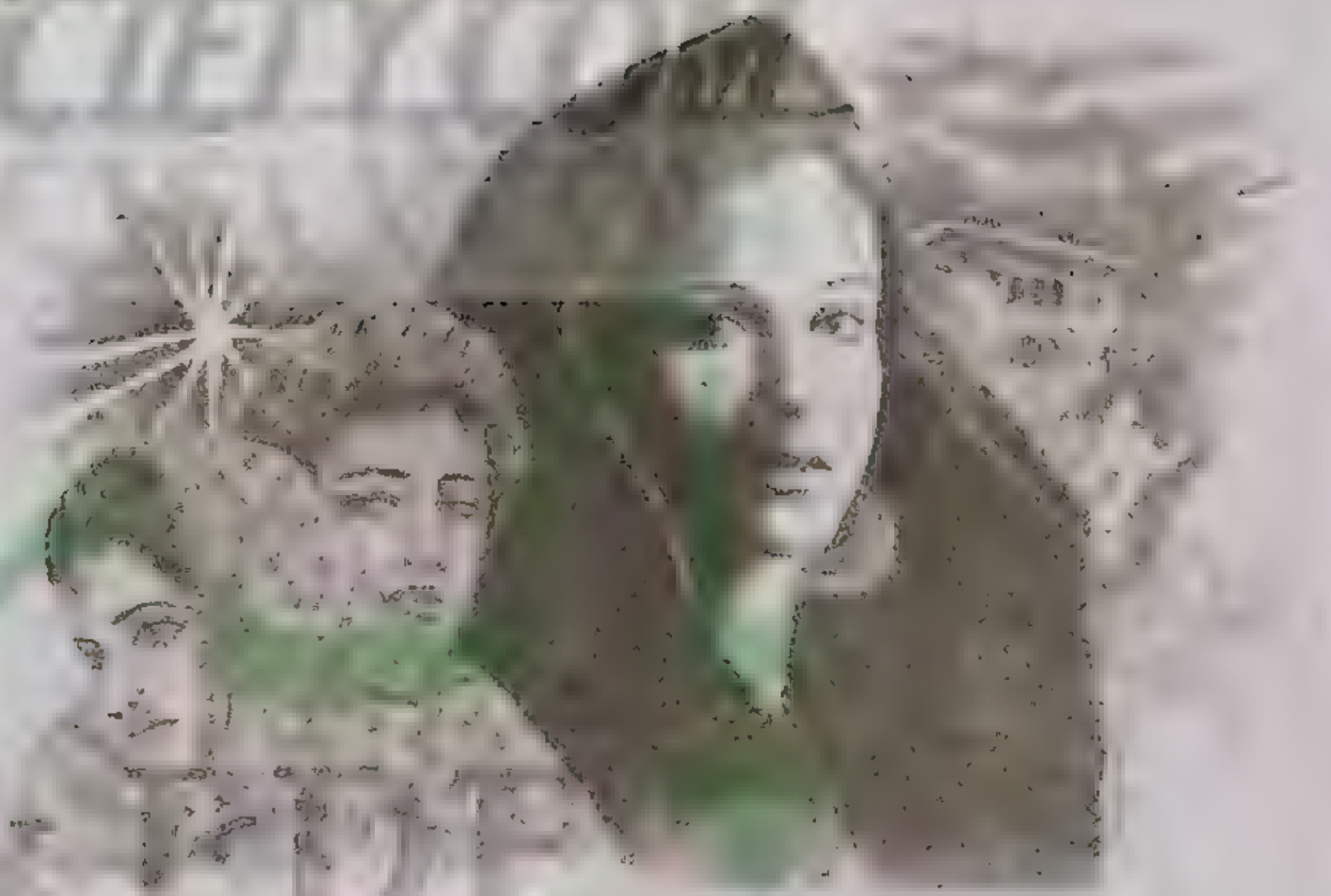
★

آسیہ رزاقی

پہلے خط کا انعام

مکمل ناول

صبح سے ہی بادلوں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ آسمان پر دھماکے تو یوں ہو رہے تھے جیسے کئی توپیں ایک ساتھ چل رہی ہوں۔ تیز تیز ہواؤں کا شور۔ آندھی نے ساری گلی کا کچرا صحن میں لا پھینکا تھا۔ شاپر' کاغذ' پتے اور رنگ برنگی دھجیاں۔

"یہ دیکھو' کمبخت نورل درزی کے کارنامے' اپنا سارا کچرا' کپڑوں کی دھجیاں گلی میں پھینک دیتا ہے۔ دیکھو ذرا' ایک جھونکا اس کی دھجیاں ہمارے صحن میں لے آیا' کمبخت کہیں۔"

اماں جھاڑو سے کچرا سمیٹتی بڑبڑاتی رہیں۔ موٹا موٹا کچرا تو سمٹ گیا۔ اب دھول مٹی بغیر دھوئے نہیں صاف ہوگی۔

شکر ہے کہ بارش شروع ہوگئی۔ دو فائدے ہوئے' ایک تو یہ کہ گلی کا کچرا بھاری ہو کر وہیں پڑا رہ گیا مزید اڑ نہیں سکا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ صحن دھونے کی ضرورت نہیں پڑی' خود ہی دھل گیا۔

انسہ نے کھڑکی سے برسات کا زور و شور دیکھا' سنا پھر کچن کا رخ کیا۔ کئی دن کی شدید گرمی اور حبس کے

بعد۔ خوش گوار موسم کی وجہ سے کچن کی کھڑکی کھلی تھی۔ امّاں نے گرد مٹی کی وجہ سے بند کی تھی۔

ایک تیز ہوا کا جھونکا برسات کی نمی لے کر کچن میں داخل ہوا اور کھڑکی کا پٹ بجاتا ہوا واپس چلا گیا۔ انسہ کے بال اڑ کر بکھرے۔ اس شرارت پر انسہ کو ہنسی آگئی۔ ہوا کو پکڑنا آسان نہیں۔ ورنہ وہ اس شریر جھونکے کو چپت رسید کرتی۔ مگر وہ کچن کی حرارت اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گیا یہ کیا اس کا احسان نہیں؟

وہ گنگناتے ہوئے کھانا پکانے لگی۔ چھٹی کا دن تھا۔ ابا کی فرمائش پر چنے کی دال کے پراٹھے بن رہے تھے۔ دال میں مسالا ملاتے ہوئے اس نے خوشبو کو خوش دلی سے پھیپھڑوں میں اتارا۔ واہ ہرا دھنیا، ہری مرچ اور گرم مسالا مل کر کیا مزے دار خوشبو اڑا رہے تھے۔ ایک اور جھونکا آیا اور پراٹھوں کی خوشبو سے لطف اٹھاتا بھاگ نکلا۔

رمشا رائتہ بنانے لگی۔ اماں املی، پودینے کی چٹنی خود بناتی تھیں۔ انہیں املی کی میٹھی چٹنی بہت پسند تھی۔ مگر اپنے ہاتھ کی یوں بھی انہیں انسہ پر سارا بوجھ ڈالنا پسند نہ تھا۔ یوں تو ان کے گھر کھانا بہت سادہ بنتا تھا۔ مگر ابا کو لوازمات بھی چاہیے تھے۔ چٹنی، رائتہ، سلاد، اچار، خواہ کم مقدار ہو۔ انہیں سجا دستر خوان خوش کر دیتا تھا۔ انسہ کالج سے آکر کچن سنبھال لیتی۔ اماں کچھ نہ کچھ بنا لیتی تھیں۔ ادھورے کام انسہ پورے کر لیتی۔ اسے ابا کی پسند کی چیزیں تیار کرتے ہوئے بہت خوشی ہوتی تھی۔

انسہ کو سیکھنے کا شوق تھا۔ نت نئی ڈشیں ہی نہیں، اس کے علاوہ بھی دیگر کاموں میں دلچسپی تھی۔ پڑوسن سے اس نے سلائی کے کتنے ٹانکے سیکھ لیے۔ ان کی بہو نے اسے ننگ کے کتنے ہی ڈیزائن سکھائے۔ کام والی ماسی نے کمر بند بنانا سکھایا۔ بلکہ پراندوں کی کئی قسم کی گرہیں لگانی بھی۔ رمشا اس کے شوق کو پسند نہیں کرتی تھی۔ چند دانے شوق، انسہ کی کوئی قمیص ہاتھ کی کڑھائی کے رنگ برنگے بوٹوں بیلوں سے خالی نہ ہوتی۔ رمشا کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

"اونہہ مرل! اتنے اچھے سادہ کپڑوں میں چھول لگا کر ان کی نفاست کو داغ دار کر دیتی ہو۔"

"ہمارے تو بہت شوق سے کھا لیتی ہو۔" انسہ کہتی۔

"مجھے لگتا ہے آپا کے لیے کسی ٹیلر ماسٹر یا خانساماں کا رشتہ صحیح رہے گا۔"

"توبہ کرو، فضول لڑکی! اللہ نہ کرے۔" اماں دہل گئیں۔

"وہ بھی انسان ہوتے ہیں۔" "اور آج کل ان کی ویسے بھی بہت مانگ ہے۔"

رمشا کو انسہ کا ہر وقت کام میں مصروف رہنا پسند نہ تھا۔

"بھئی جسم کو آرام کی بھی ضرورت ہے یہ کیا کہ کالج سے آتے ہی سوئی دھاگے، کپڑے، یا کچن میں کسی نئی ڈش میں مگن۔ گھر والوں کے بھی کچھ شوق کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ پاس آکر بیٹھو، باتیں کرو، ہنسی مذاق کرو، کچھ نہیں تو ہماری سنو، دوستی بناؤ، ٹی وی نا ... کی کار گزاری، شہرت کا نشہ۔"

رمشا کی باتوں پر اسے ہنسی آجاتی۔ "ہائیں یہ شہرت کا نشہ کون سا ہے؟"

"چھوڑ چاہے کہ بھئی۔ لڑکی کو تو انسہ جیسا ہونا چاہیے، ہر فن مولا۔"

"رمشا باتوں کی ماہر ہے، انسہ کاموں کی۔" یہ ابا کے الفاظ تھے۔

"رمشا اپنی ماں کی طرح کاہل ہے، انسہ میری طرح ذمہ دار۔" ابا چپکے سے کہتے۔

رمشا برا مان کر ابا سے لپٹ جاتی۔ "میری تعریف کریں ابا! ورنہ میں نہیں چھوڑوں گی۔"

"بھئی۔ لاڈلی بھی تم ہو، چھوٹی سی، ننھی منی گڑیا۔" ابا کروں بچاتے۔

"اور میرا کوئی ذکر نہیں۔" دانش سرد آہ کے ساتھ کرسی پر گر جاتا۔

اماں محلے اور خاندان میں خاصی مقبول تھیں۔ ان

... ایک زمانے بہت سی ان کی گرویدہ تھیں۔ اماں بتاتی ... قمر یہاں نہ صرف ان کی بچیوں کی دوست ... بیٹیو اور خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ چونکہ بچپن ساتھ گزرا اور پھر شادی کے ایک شہر میں رہنے کے باعث میل جول میں بھی کمی نہ آئی۔

"قمر بہت ذہین اور محبت کرنے والی ہے۔ اس نے ... وقت خاصا سخت گزارا ہے۔ ہر قسم کا تجربہ ہے ...۔" اماں کہتیں۔

"مگر ہماری ایک سگی خالہ جان بھی تو اسی شہر میں رہتی ہیں۔ ان سے آپ کے تعلقات کچھ خراب ہیں شاید، کبھی آتی ہی نہیں۔ شاید پانچ سال میں ایک بار ... ہیں۔"

اماں نظریں چراتیں۔ اِدھر اُدھر مصروف ہو جاتیں۔ ان کے لیے سب سے اذیت ناک سوال تھا۔

دانش بار بار پوچھتا۔ "ہم بھی کیوں نہیں جاتے ان کے گھر؟"

خالہ قمر نے ہی جواب دیا تھا کہ۔ "تمہارے خالو مزاج ہیں، وہ نہ خود ملتے ہیں، نہ میرا آنا جانا پسند کرتے ہیں انہیں بڑا غرور ہے بھئی۔"

☆ ☆ ☆

مگر ایک دن وہ آگئیں۔ بڑی سی گاڑی میں۔ ڈرائیور کے ساتھ۔ آتے ہی دھماکہ کر دیا۔ اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے انسہ کا رشتہ طلب کر رہی تھیں۔

چھوٹا بیٹا ان کا لاڈلا تھا۔ بہت نیک فرماں بردار، اعلا تعلیم کے لیے انگلینڈ جا رہا تھا۔ خالہ کو تو اس پر بہت بھروسا تھا۔ خالو کو خدشہ ہوا کہ شاید وہ وہیں رہ جائے۔ اور ماں، باپ کو بھلا دے، کئی مثالیں موجود تھیں، سو اس کی شادی کر کے بھیجا جائے، تاکہ بیوی کی نسبت سے ہی وطن اور ماں، باپ سے تعلق رہے۔ خالہ کو یہ ... تھی کہ دو بہوئیں سسرال سے ملی ہیں۔ ایک میکے ... ملی گی تو وہ ان کا خیال رکھے گی۔ ہمدرد ہوگی ان کی خدمت کرے گی۔

صاف صاف کہا کہ "اپنی غرض کے لیے یہ رشتہ کرنا چاہتی ہوں۔"

اماں تو حق دق رہ گئیں۔ بہت اصرار کے بعد بڑے تحمل سے بولیں۔

"آپا! میرا آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ میں تو آپ کی سسرال کے پاسنگ نہیں۔ آپ کی بہوئیں ٹرک بھر جہیز لائی ہیں۔ میری حیثیت بھلا کہاں؟ اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔ آپ کے بیٹے کو برابر کی پوزیشن والی اچھی سے اچھی لڑکی مل جائے گی۔"

"وہ میری بھانجی نہ ہوگی۔ میں بڑی امید سے آئی ہوں سمیرا! مجھے مایوس نہ کرنا۔"

"آپا! میرے حالات ایسے نہیں کہ۔ آپ دیکھ رہی ہیں، میرا بیٹا بھی بے روزگار ہے ابھی، اور کوئی تیاری ہی نہیں ہے کہ بیٹی کو بیاہنے کا سوچوں۔"

"مجھے جہیز نہیں، صرف تمہاری بیٹی چاہیے، وہ رخصت ہو کر انگلینڈ چلی جائے گی۔ اسے یہاں کی کوئی چیز نہیں چاہیے۔"

"پھر آپ کی خدمت کیسے کرے گی آپا؟" اماں ہنس

دیں۔ کیا بودی دلیل خالہ نے دی تھی۔ "آپا! برابری کا رشتہ اچھا ہوتا ہے۔"

"دیکھو ہنس کر ٹالو تو نہیں' بس میری خواہش ہے کہ ایک بہو اپنوں کی لوں۔ جتنا تحمل' صبر' برداشت تم میں ہے جو سلیقہ' قرینہ' فہم و فراست ہے' یقیناً" تمہارے بچوں کو بھی ملا ہوگا۔ میں ایک اعلا نسل ہیرا پسند کر رہی ہوں۔ تمہارا میرا ایک خاندان' ایک خون' ایک ماں' باپ تھے۔ برابری تو ہے۔"

خالہ دو گھنٹے بیٹھی' خوشامد کرتی رہیں' انسہ کے بنائے ہوئے کباب کھائے' چائے پی' تعریفیں کیں۔

"بیٹا! ڈرائیور کو بھی چائے بھجوا دو' کباب بھی بھیجنا۔"

انہوں نے اماں کو الجھن میں ڈال دیا' شام کو ابا آئے' انہیں کہانی سنائی گئی' صاف انکار۔

"لڑکا کتنا بھی اچھا قابل لائق ہو۔ اس کے باپ کو بھی دیکھو۔ اپنے برابر تو سمجھتے نہیں ہمیں۔ دو' چار دفعہ آئے تو یوں بیٹھے رہے جیسے قید میں ہوں۔ دیواریں چھت دروازے گردن گھما گھما کر گھور رہے ہیں۔ ہم سے تو مخاطب ہونے کی زحمت کی نہیں موصوف نے۔ بیٹی کا رشتہ برابر والوں میں کرنا چاہیے۔ بعد میں بے چاری کو مشکل نہ ہو۔"

"تو۔۔ تو ہم میں کیا کمی ہے' ماں' باپ ایک' خاندان ایک' آپا چاہتی ہیں بھانجی کو بہو بنائیں۔"

"ہاں۔ اس میں بھی ان ہی کی غرض ہے۔ غریب گھر کی بھانجی لاؤ۔ دباؤ میں رہے گی۔ خدمت کرے گی۔ حکم کی تعمیل کرے گی۔ اب بیٹا چاہے لے کر جائے یا نہ لے جائے۔ وہاں گل چھرے اڑاتا رہے۔ چاہے تو وہیں ایک گوری سے شادی کرلے۔ بھانجی یہاں ساس کی خدمت کو موجود۔ برداشت کرلوگی بیٹی کا دکھ۔"

اماں بے چاری' خالہ کی دی ہوئی برابری اور یقین دہانی پر میاں کو بھی ہم خیال بنانا چاہتی تھیں۔ مگر ان کے اندیشے۔ اور یہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکیں۔

"اور مجھے تو یقین نہیں کہ وہ اپنے میاں کی مرضی سے آئی ہوں گی۔ ان اکرو خان کی نظر میں میری تمہاری کوئی عزت نہیں' تو ہماری بیٹی کی کیا قدر ہوگی۔ بس ان کے شان دار محل میں ایک مفت کی خادمہ کا اضافہ ہو جائے گا۔"

لبا کے خدشے اور یقینی انکار کی صورت حال۔

☼ ☼ ☼

خالہ امی پھر آگئیں اور اس بار ان کے ساتھ ان کا بیٹا طارق اور شوہر نامدار اکرو خان بھی آئے۔ بقول ابا کے' اس بار ان کا مزاج اور رویہ بالکل مختلف تھا۔ نہ تو چھت اور دیواریں اور دروازوں میں کسی چیز کی کھوج لگا رہے تھے۔ نہ ہی اکتائے ہوئے تھے' پہلے کی طرح اماں سے ہلکا پھلکا مذاق کیا۔ ابا سے بہت مربیانہ انداز میں گفتگو کی۔

خالہ امی نے بطور خاص انسہ کو بلوایا۔

چھٹی کا دن تھا۔ انسہ کے کسی نئی ڈش کے تجربے کا دن۔ چنانچہ مہمان ہی ممتحن بن گئے۔ بے حد تعریفیں وصول کرکے انسہ کو تو پورے نمبر مل گئے۔ دانش اور طارق الگ جا بیٹھے۔ اور خالو اکرو خان نے ابا سے انسہ کا رشتہ طلب کرلیا۔ وہ تو فوری جواب کی امید لے کر آئے تھے۔ مگر ابا نے تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوچنے کے لیے وقت مانگ لیا۔

دانش کو طارق پسند آگیا تھا۔ طارق نے معذرت بھی کی کہ وہ ان کے گھر آنے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ کئی سال پہلے آیا تھا تو دانش کے ساتھ کرکٹ کھیلی تھی۔ اس نے بہت سادگی و بے تکلفی سے دانش کو اپنے پروگرام بتائے۔ انگلینڈ میں وہ اسکالر شپ پر جا رہا ہے۔ یونیورسٹی میں داخلہ ہو چکا ہے۔ اماں' ابا کے اصرار پر نکاح کرکے جائے گا۔ ابھی شادی' رخصتی کے حق میں نہیں' خود کسی قابل ہو جائے تو بیوی کو بلا لے گا۔ یا آکر لے جائے گا۔ پاکستان آنا جانا بھی لگا رہے گا۔

"ظاہر ہے میرا وطن ہے' مگر ماں' باپ ہیں' اماں خوامخواہ خوف زدہ ہیں کہ شاید میں وہیں کا ہو جاؤں گا۔"

اماں کو اس کی باتیں اور وہ پسند آئے۔ نہ تو اپنے باپ جیسا نخرہ' نہ غرور' نہ ہی بظاہر کوئی عیب۔ قدرت نے ایک موقع دیا ہے۔ خوش قسمتی در پر دستک دے تو اسے خوش آمدید کہنا چاہیے' لڑکا سمجھ دار ہے۔ اپنے زور بازو سے ترقی کرنا چاہتا ہے۔ ان کی کوئی ڈیمانڈ بھی نہیں۔"

خالہ قمر سلطانہ سے مشورہ لیا گیا۔ وہ بھی حیران ہوئیں۔ طارق کے لیے کوئی کمی نہ تھی' پھر اس گھر کو کیوں منتخب کیا گیا۔ وہ یہ سوال لے کر طارق کی اماں کے پاس بھی گئیں' طارق سے بھی پوچھا' اس نے کہا۔

"میں نے کہہ دیا تھا۔ اگر وہ مجھے پسند آئی تو اشارہ دوں گا۔ ورنہ آپ اس معاملے کو ختم ہی کردیں۔ میں نے ان کے گھر کی سادگی۔ صفائی' اور انسہ کے ذوق دیکھ کر اشارہ کردیا۔"

"مگر۔۔ وہ تمہاری ٹھاٹ باٹ کا مقابلہ نہیں کرسکے۔ یہ نہ ہو کہ یہاں آکر اس کے شوق اور سلیقے کا ہی خاتمہ ہو جائے۔"

"مجھے یقین ہے' وہ اپنے خلوص اور ذہانت سے سب پر بازی لے جائے گی۔ اور ویسے تو میں کسی بھی تماشے کو پسند نہیں کرتا۔"

خالہ قمر کچھ مطمئن تو ہوئیں۔ پھر طارق کی امی جو ان کی بہن' وہ حمیرا آپا کہتی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"میری بھانجی میرا خیال کرے گی۔ میری ہمدرد ہوگی۔"

پھر بھی انہوں نے زیادہ زور نہ دیا۔ یہی کہا۔

"خود اچھی طرح سوچ لو' غور کرلو' بیٹی سے بھی مشورہ کرو' اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔" یوں لگتا تھا وہ کچھ متردد ہیں۔

"اس سے کیا مشورہ کروں' خالہ کے گھر کبھی بچپن میں گئی ہوگی۔ خالہ نے تعلق رکھا ہی نہیں۔"

"ہاں تو اسی لیے کہہ رہی ہوں' ناواقفیت ہے' خالہ کا گھر نہ سمجھو' خالو جی کا گھر ہے' جیسے اور لوگ' یعنی غیروں میں رشتہ۔"

"غیروں میں بھی لڑکیاں بیاہ کر جاتی ہیں۔ نبھ جاتی ہے' یہ تو پھر خالہ ہیں' خیال تو کریں گی' بس یہ ہے کہ ان کا رہن سہن امیرانہ ہے' اسے تو اپنا کام خود کرنے کا شوق ہے' اس لیے کہ گھر میں کوئی نوکر نہیں' وہاں نوکروں کی فوج' سلیقہ اور شوق دھرا رہ جائے گا' جب پکا پکایا کھانے کو ملے گا۔"

"یہ شوق انگلینڈ میں بھی کام آئے گا۔ وہاں نوکر نہیں ہوتے۔"

کئی دن کی سوچ بچار' مشورے' دانش کی حمایت' اماں کی توقعات' ابا کیا کرتے' اس سے بہتر رشتہ تو آنے کی امید نہ تھی۔ ادھر سے برابر اصرار' تقاضا' ہاں کرتے بنی۔

گھر میں ہی سادہ سی تقریب ہوئی' خالہ قمر' ان کی بیٹی' داماد اور دو' چار ابا کے رشتے دار۔ وہ لوگ بھی مختصر بارات لائے۔ نکاح کے بعد طارق کو اندر بلایا گیا۔ انسہ کے پاس بٹھا کر طارق کے بھائی نے تصویریں بنائیں۔ گروپ فوٹو بنائے گئے اور کھانا کھا کر سب چلے گئے۔ خالہ امی نے گلے لگا کر پیار کیا۔

"جی چاہتا ہے ابھی ساتھ لے جاؤں۔ اب تو کوئی روک نہیں سکتا' مگر ایسے تھوڑی لے جاؤں گی' دھوم دھام سے پورے خاندان کے ساتھ آکر لے جاؤں گی۔"

خالہ قمر کے مشورے سے مہر میں دس تولہ سونا لکھا گیا تھا اور خالہ امی اس سے بھی زیادہ کا سیٹ لائی تھیں۔ جٹھانیوں نے بھی سیٹ تحفے میں دیے' چلتے چلتے خالہ امی نے کہا۔

"طارق خیر سے چلا جائے۔ تو میں تمہیں بلوا لیا کروں گی۔ خالہ کا گھر سمجھ کر آجایا کرنا۔"

ابھی نکاح کو دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ فوراً" ہی خدمت کے لیے طلب کرلیا' ابا معترض ہوئے۔ چند دن بعد طارق لندن روانہ ہو گیا تو خالہ کے تقاضے بڑھ گئے۔

"شادی سے پہلے سسرال جانا مناسب نہیں۔" ابا نے صاف جواب دیا۔

"تو سسرال کیسی، خالہ کا گھر ہے۔"

"وہ تو پہلے بھی تھا۔ کب بلایا آپ نے؟" ابا تو جیسے سمدھی بن گئے۔

"بیٹوں کی شادیوں میں، ہر فنکشن پر بلایا تھا۔"

"وہ تو شادی ہال میں ہوئی تھیں۔ ہم وہیں سے آ گئے۔" اور یہ سچ تھا انسہ کو تو یاد بھی نہیں تھا کہ وہ کتنے سال پہلے ان کے گھر گئی تھی۔ شاید بچپن میں۔ وہ بہت ہی پوش علاقے میں رہتی تھیں۔ خود بھی کئی سال بعد ہی آتی تھیں۔ اماں کو ان کی اور بے رخی کا احساس تھا۔ اسی لیے وہ کبھی کبھی خود ہی افسردہ ہو جاتی تھیں۔ ابا بھی اماں کا خیال کر کے خالہ کا ذکر ٹال جاتے۔ ورنہ اتنا تو کہہ دیتے کہ ہفتے میں ہی ایک بار وہ فون کر لیا کریں۔ تو خیریت تو معلوم ہو سکتی ہے۔

اماں نے دو ایک بار فون کیا بھی تو کبھی ملازم، کبھی بہو نے ریسیو کیا۔ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں۔ کہیں گئی ہوئی ہیں۔ مہمانوں میں مصروف ہیں۔

اسی قسم کے جواب ملے، خود وہ تو ایک سال بعد ہی فون کرتی تھیں۔

مگر اب تو اکثر ان کے فون آتے۔ ایک بار انسہ سے انہوں نے کہا۔

"میں چاہتی ہوں تم یہاں آ کر نمو، شمو سے دوستی، تعلقات بناؤ۔ آگے تمہیں آسانی رہے گی۔ کچھ اپنے سلیقے کے نمونے انہیں دکھاؤ، کچھ پکا کر کھلاؤ، اپنی بنی ہوئی ایمبرائیڈری دکھاؤ۔ انہیں پتا تو چلے کہ میں نے ان دونوں کی بہنوں کو ریجیکٹ کر کے تم کو کس لیے منتخب کیا ہے۔ یہ تو میری ہی خواہش اور ضد کی وجہ سے ہوا ہے، تمہارے خالو بھی دونوں بہوؤں کے طور طریق دیکھ کر بے زار تھے۔ میری خوشی کے لیے راضی ہوئے۔"

انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ طارق کیوں کر راضی ہوا۔ یقیناً خالہ نے بہوؤں سے تو طارق کی پسند کا نام لے کر یہ رشتہ کیا۔ کیونکہ ان کی بہوئیں نکاح کے دن بھی "طارق کی پسند لاجواب ہے۔" قسم کے جملے ادا کرتی رہی تھیں۔

طارق کے لندن سے فون آتے رہتے تھے۔ کبھی ابا، کبھی دانش یا اماں اس سے بات کرتے تھے۔ ایک دو بار انسہ نے بھی فون ریسیو کیا۔

طارق نے وضاحت کی کہ وہ انسہ سے بطور خاص اس لیے بات نہیں کرتا کہ شاید خالو جان کو یہ بات پسند نہ ہو۔ وہ تم کو اماں جان کے بلانے پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ اس لیے لیکن فون میں صرف تمہاری خاطر کرتا ہوں۔"

انسہ شرمندہ ہو گئی۔ "میں جاؤں گی۔"

"فون کر دینا اماں جان صبح گاڑی بھیج دیں گی۔"

طارق نے اپنی چاہت یا پسند کا کوئی ذکر نہ کیا۔ نہ ہی اسے انگلینڈ بلانے کے متعلق کوئی آس دلائی۔ بعد میں بھی کئی بار اس نے فون پر بات کی۔ طارق کی طرف سے بس خیر خیریت، موسم، مصروفیت، زیادہ سے زیادہ کیا کرتی رہتی ہو؟ کا سوال اور بس۔ کبھی کبھی انگلینڈ کے شرمناک ماحول کا بھی ذکر... مر مر کے نہ جانے اس نکاح کا کیا مطلب تھا۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

✿ ✿ ✿

ایک بار وہ رمشا کے ساتھ اپنی سسرال بھی گئی۔ نمو، شمو نے بہت خوشی کا اظہار کیا، پورا گھر دکھایا۔ رمشا بے حد متاثر تھی۔

"کیا! تمہارے تو عیش ہوں گے، کتنی قیمتی چیزیں جگہ جگہ سجی ہوئی ہیں، بیڈ پر چادریں دیکھی تھیں۔ اف قالین کے رنگ کے پردے اسی رنگ کی چادریں، ڈرائنگ روم اتنا بڑا، ہمارا آدھا گھر اس میں آجائے، اور صوفے...!"

"رمشا، دوسروں کی چیزوں کو آنکھیں پھاڑ کر نہ دیکھا کرو۔"

"میں صرف تعریف کر رہی ہوں، کبھی میں بھی تمہارے گھر تم سے ملنے آؤں گی نا، ان صوفوں پر بیٹھوں گی، جہازی سائز کے شان دار بیڈ پر لیٹوں گی۔ ویسے دل تو چاہ رہا تھا ایک بار تو لوٹ لگا کر دیکھوں، نرم نرم...!"

"اپنا گھر۔ اپنی چیزیں۔ سب سے قیمتی ہوتی ہیں۔ اماں تمہاری بیڈ اور اپنے گھر کے اپنے پرانے صوفے ... یا ٹوٹ گئے۔ خوش رہو۔ دوسروں کی ... پر نیت نہیں لگاتے۔ ... تم کسی قیمتی چیز کے لیے اس طرح بے قرار ہو کر تعریف نہ کرنا۔"

پتہ نہیں انسہ رمشہ سے کیوں ناراض تھی۔ یا اپنی سسرال کی نمائشی اشیاء کی تعریف اسے پسند نہ آئی۔

خالہ قمر کی بیٹی رخسانہ نکاح میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ میاں کے ساتھ۔ وہ اس شادی پر بہت خوش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ خاندان کو جوڑے رکھنے کے لیے ایک دو شادیاں آپس میں ضرور ہونی چاہئیں۔

وہ انسہ کے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھی۔

"تعلقات کی مضبوطی اور محبت قائم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ورنہ۔ دوریاں..." رخسانہ رک گئی۔

"لیکن اکثر تعلقات خراب بھی ہو جاتے ہیں۔" انسہ نے سوچ کر کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ اصل میں جہاں برداشت کی کمی ہو۔ اپنے ہوں یا غیر۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہاری وہاں بہت قدر ہوگی۔ تم میں برداشت اور صبر ہے۔ اور خالہ نے عرصے بعد تعلقات جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ... تو یوں بھی ماہی کہلاتی ہے۔ ماں ہی۔ ... ... بیٹے کے لیے بہو بھی اپنی پسند کی ... اصل میں بڑی بہوؤں نے انہیں مایوس کیا ہے۔ ... فرماں بردار بیٹا ہے۔"

اب وہ طارق کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر رہی تھی۔ جبکہ انسہ کو یقین تھا کہ جب خالہ امی سگی ... سے ملاقات میں برسوں لگا دیتی ہیں۔ تو قمر خالہ تو ... تھیں۔ ان سے ملنا تو کسر شان ہوگا۔ اور ... اس نے طارق کو شاید دیکھا بھی نہیں ہوگا۔

"رخسانہ آپا! وہ فرماں بردار ہیں یا مجبور کیے گئے ... تو ایسا ہی لگتا ہے۔" انسہ نے اپنے خدشے کا ... کیا۔

... ہنس دی۔ "ارے۔ آج کل کون مجبور ہوتا ہے۔"

بات درست سہی مگر انسہ کا ذہن ابھی صاف نہ تھا۔ اور جوں جوں دن گزر رہے تھے اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ مگر کیوں؟ وہ سمجھ نہیں پائی۔

✿ ✿ ✿

ایک سال گزر گیا تھا۔ دانش کو اچھی جاب مل گئی۔ انسہ نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا۔ ابا کو دانش کی شادی کا شوق ہوا۔ دانش دامن بچاتا رہا۔ مگر ابا کا ارمان، جان پہچان والوں کی لڑکی تھی۔ اچھی شکل صورت کی گھریلو۔ معمولی تعلیم تھی۔

شادی تو بہت ہی سادگی سے ہوئی۔ کفایت کو مدنظر رکھ کر۔ خالہ قمر نے ہر ہر قدم پر اماں کا ساتھ دیا۔ مشورے بھی اور تعاون بھی۔ وہ یوں تو اماں کی ہم عمر تھیں مگر بے حد سمجھ دار اور معاملہ فہم۔ اور چاق و چوبند۔ اماں نے تو خود پر بڑھاپا طاری کر لیا تھا۔ مگر خالہ قمر بہت خیال رکھتی تھیں اپنا۔ چونکہ ایک ٹیوشن سینٹر میں جاب کرتی تھیں۔ سلائی اور کوکنگ سکھاتی تھیں۔ وقت پڑنے پر پڑھا بھی لیتی تھیں۔ یعنی کوئی ٹیچر چھٹی پر گئی۔ تو خالہ اس کی جگہ پڑھا لیتی تھیں۔ بہت ہی مددگار، تعاون کرنے والی ہمدرد خاتون۔ اور بے حد نڈر بھی۔

بیٹی رخسانہ شادی کے بعد سسرال چلی گئی۔ بیٹا بھی باہر تھا۔ اکیلی رہتی تھیں۔ گھر میں دو کمرے کسی کو کرائے پر دے دیے تھے۔ تنہائی سے تو نجات ملی۔

انسہ ان سے بہت متاثر تھی۔ جبکہ خالہ امی نے اسے بہت مایوس کیا تھا۔ وہ بس نمود و نمائش کی عادی تھیں۔ باتیں بھی زیور، کپڑے، فیشن اور سیر و تفریح کی کرتی تھیں۔ شاید خالو کی دولت پر انہیں بھی غرور تھا۔ یا پھر اس ماحول میں رنگ کر انہیں اپنی کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ رمشہ کا خیال تھا وہ مصنوعی فضا کی عادی ہیں۔

بھائی کی شادی میں پہننے کے لیے انسہ کے دو زرق برق سوٹ لائی تھیں، انسہ نے مروتاً پہن لیے۔

رمشہ اس کو دیکھ دیکھ کر مسلسل ہنستی رہی۔

"آپا! بالکل بازار میں بکنے والی گڑیا لگ رہی ہیں۔ جو گوٹے سلمہ ستارے اور موتی سے بھرے کپڑے پہنے آنکھیں پھاڑے موتیوں کا ٹیکہ لگائے ہونٹوں پر کچا لال رنگ تھوپے دکان پر ٹنگی رہتی ہے۔"

انسہ کو غصہ آرہا تھا مگر رخسانہ تسلی دیتی رہی۔

"کہنے دو اسے۔ تم دلہا کی شادی شدہ بہن ہو۔ سسرال کی طرف کے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔"

"رخسانہ آپا! میں کیا بہت عجیب لگ رہی ہوں؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"نہیں بھئی۔ شادی شدہ لگ رہی ہو۔" انہوں نے دلاسا دیا۔

"آپ بھی تو شادی شدہ ہیں۔ آپ نے تو ایسے کپڑے نہیں پہنے؟"

"میں پرانی ہوں۔ اور ایک نٹ کھٹ بچے کی والدہ سے میں نہ موتی سلمہ ستارے کے کپڑے پہن سکتی ہوں۔ نہ کانوں گلے کے زیور۔ میرا بیٹا موتی ستارے نوچ نوچ کر کھالیتا ہے۔ ورنہ میری شادی پر بھی ایسے ہی کپڑے سسرال سے آئے تھے۔"

رمشہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میں تو کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنوں گی۔ چھمک چھلو بنوں گی۔ توبہ۔ بس کہہ دیا میں نے۔ میری سسرال والوں کو پہلے ہی بتا دیجیے گا۔"

رخسانہ تو ہنسنے لگی۔ انسہ صرف حیرت ہی ظاہر کر سکی۔ رمشہ نڈر اور بے باک بھی ہے؟ وہ انسہ جیسی نہیں۔ ایک ماں ایک باپ کی اولاد میں اتنا فرق؟ شاید یہ قدرت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اماں اور خالہ امی میں بھی تو فرق تھا۔

اماں اللہ کی شکر گزار بندی۔ خاموش اور صابر شاکر۔ ہر حال میں مطمئن اور متحمل۔ ابا کی معمولی تنخواہ میں گزر کرنے والی۔

ابا اپنے سب بہن بھائی سے بڑے تھے۔ چار بہنوں ایک بھائی کی ذمے داریاں۔ پڑھا لکھا کر شادیاں کرنے تک اپنا سب کچھ ختم کر بیٹھے۔ نہ بن بکی۔ دکان بکی، بینک خالی ہو گیا۔ رہ گئی تنخواہ۔ اس کے سہارے بس دن باقی رہی۔ اور اس میں کس طرح بچوں کو پڑھایا بھی۔ دنیا کے دوسرے معاملات رسومات تعلقات بھی نبھائے۔ گھر نہیں بکنے دیا۔ سلائی کر کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر۔ کمیٹیاں ڈال کر۔ خود کم کھا کر۔ شوہر اور بچوں کے پیٹ بھرے۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ دانش کی شادی کے لیے بھی گھر میں سے کپڑے بھی نکل آئے اور زیور بھی۔ اماں نے اپنے زیورات کی حفاظت بھی تو کی تھی۔ تینوں کے لیے برابر کی تقسیم۔ معلوم نہیں کس کس طریقے سے بچت بھی کرتی رہیں۔ اور خالہ قمران کے ہر معاملے میں مشیر خاص تھیں۔

دانش کی دلہن موٹا سیدھی سادی لڑکی تھی۔ سب سے گھل مل گئی۔ کچھ دن ہی گزرے تھے۔ ایک دن ابا ایسا سوئے کہ پھر اٹھے نہیں۔ سوتے ہی رہ گئے۔ نہ بیمار ہوئے۔ نہ کسی سے خدمت لی۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے دانش کی شادی میں جلدی کی۔

چند دن گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت رہی۔ پرسے کے لیے آنے والے۔ آتے رہے۔ پھر اداس دن سنسان راتیں۔ اماں چپکے چپکے آنسو بہاتیں۔ خالہ قمر روز آتیں۔ اماں کو ان سے ڈھارس تھی۔

پھر رمشا نے میٹرک میں پوزیشن لی۔ کچھ دیر خوشی کی لہر سی آئی۔ پھر رک گئی۔ دانش نے دونوں بہنوں کی تعلیم کا ذمہ لینے سے معذوری ظاہر کر دی۔ رمشہ خوب روئی۔ انسہ نے اس کی حمایت کی تو دانش نے کہا۔

"تمہارا بھائی کہیں کا وزیر نہیں لگ گیا کہ سب کے خرچے پورے کرے۔ نوکری کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اوپر سے شادی کی جلدی پڑ گئی۔ اب کہاں ڈاکہ ڈالوں کہ بیوی کے خرچے بھی پورے کروں۔ تمہاری پڑھائیاں بھی۔"

یہ دانش تھا۔ اس باپ کا بیٹا؟ جس نے پانچ بہن بھائیوں کو پڑھا لکھا کر شادیاں کر دیں۔ اس ماں کی اولاد جو آج تک محنت کر کے عزت کا مقام دلانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"بھائی! اماں بھی تو ابا کی تنخواہ میں گزارا کر رہی تھیں۔ آپ کو پڑھایا بھی اسی آمدنی میں..." رمشہ سے چپ نہ رہا گیا۔ انسہ تو بس حیران تھی۔ دانش کے صاف جواب پر۔

"اب ابا کی تنخواہ نہیں ہے۔ میرے اپنے بھی اخراجات ہیں۔ بیوی ہے۔ شادی پر بھی میں نے خرچ ڈالا۔"

"آپ نے؟" رمشہ حیرت سے چلائی۔ "اماں نے کمیٹیاں ڈال ڈال کر بچت کر کر کے پیٹ کاٹ کے جمع کیا تھا۔ جو ہم دونوں کے لیے رکھا تھا وہ آپ کی شادی میں خرچ کر دیا۔"

اماں کے آنسو بہنے لگے۔ بہت ضبط کیا مگر...

"تو میری شادی کی جلدی کیا تھی۔ کہاں بھاگا جا رہا تھا میں۔ کچھ دن کما کر جمع کر لیتا۔"

"تمہارے ابا کی خواہش پوری ہو گئی۔ مجھے کوئی غم نہیں۔" اماں نے آنسو پونچھ لیے۔

"پیسہ ختم ہو گیا تو ہونے دو۔ تمہارے ابا کی آخری خواہش تو پوری ہو گئی۔"

"تو بس۔ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ گھر کا خرچ بھی ہاتھ روک کر کرنا پڑے گا۔"

"تو بیٹا! پہلے کب مرغے چرغے بھونے جاتے تھے۔"

اماں نے دانش کو گھورا۔ لاڈلا بیٹا بحث ختم۔ رمشہ کے آنسو رواں۔ اداسی نے ماحول کو سرد کر دیا۔ اماں کی چپ۔ خالہ قمر آئیں۔ ان کے سامنے رمشہ نے ذکر چھیڑا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ کچھ متفکر۔

"وہ بھی صحیح کہتا ہے۔ اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی۔ اپنی شادی ہونے تک وہ بھی کچھ جمع کر لیتا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ کی مصلحت وہی جانے۔ مرنے والے کی خواہش پوری ہو گئی۔ شکر کرو۔ اب فکر نہ کرو۔ اللہ مددگار ہے۔ اسی سے طلب کرو۔ قسمت میں ہے تو تم پڑھ بھی لو گی۔ رونے سے تو کوئی کام نہیں ہوتا۔ تقدیر بھی تدبیر سے۔ دعا سے منوائی جا سکتی ہے۔ میں تو سچی بات ہے۔ دعا کی مقبولیت کی قائل ہوں۔ اور تدبیر کی بھی۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ انسہ چائے بنا رہی تھی۔ اس سے کچھ دیر باتیں کر کے باہر نکلیں۔ اماں کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگیں۔

"سمیرا! حمیرا آپا آئی ہیں تمہارے پاس؟"

"وہ تین دن برابر آئیں۔ یہی بہت ہے۔ اب تو دس بارہ دن میں فون کر لیتی ہیں۔"

"ہائے سمیرا! یہ کیسی بہن ہے تمہاری۔ بڑی بہن کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ تو لگتا ہے۔ ظالم ماں ہے یا لاپروا ماں... توبہ۔ کبھی ڈرائیور کے ساتھ ہی آجاتی۔"

"رہنے دیں خالہ!" رمشہ نے کہا۔ "وہ آتی ہیں تو ہمیں خاطر کرنی پڑتی ہے۔ ان کے ڈرائیور کی۔"

"توبہ ہے رمشہ! بری بات۔ ڈرائیور بھی ہمارے جیسا انسان ہے۔" اماں نے ڈانٹا۔

خالہ جاتے ہوئے انسہ سے کہہ گئیں۔ "آج کا اخبار بھی منگالو۔" اور انسہ نے بھی تعمیل میں دیر نہ کی۔

شام کو دانش آیا۔ انسہ نے اس کے سامنے اخبار کا صفحہ کھول کر رکھ دیا۔ اس نے دیکھا۔ اشتہار تھا سمجھ گیا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"بھائی! اچھا اسکول ہے۔ خاصی شہرت ہے اس کی۔ اور تنخواہ بھی بہت اچھی ہے۔"

"ہوں۔ اور سارا خاندان مجھ پر تھوکے گا کہ باپ کے مرتے ہی بہن کو کمائی پر لگا دیا۔ اور وہ... سسرال والے تمہارے۔"

"بھائی! یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ کسی کو اس سے کیا۔ میں یونیورسٹی چھوڑ چکی ہوں۔ خالی بیٹھنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ اگر میری وجہ سے گھر میں سہولت ہو جائے تو کیا برا ہے؟ رمشہ کالج جانے لگے گی تو مجھے

بہت اطمینان ہو گا۔ ابا بھی ہمیں اعلا تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔"

دانش خاموش رہا۔ انسہ پُر اعتماد تھی۔ حساس بھی تھی۔ خالہ نے بھی اسے یقین دلایا تھا۔

"کہ دانش مخالفت نہیں کرے گا۔ اس کا فائدہ بھی ہے۔ ذمے داری میں حصہ بٹانے سے تم بھی شرمندگی سے بچو گی۔ اس سے پہلے کہ دانش اور مونا اخراجات کا رونا روئیں اور بے زار ہو جائیں۔ تم شروع ہو جاؤ۔ کچھ دن بعد تم بھی اپنی تعلیم مکمل کر سکو گی۔ تمہارے پاس اتنا وقت تو ہے کہ ایم اے کر لو۔"

خالہ کی امیدیں۔ دلاسے۔ وہ انٹرویو میں کامیاب ہو گئی۔ اماں بھی حالات کا رخ پہچان کر خاموش رہیں۔ ورنہ انہیں یہ تجویز پسند تو نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

اسکول شروع ہو گیا۔ دانش نے بھی فائدہ اٹھایا۔ خرچ کے لیے رقم کم کر دی۔ ایک بار تو وہ کہنے پر مجبور ہو گئیں۔ "اگر انسہ نہ ہوتی۔" دانش سمجھ گیا۔ ان کا مطلب تھا۔ اس کی تنخواہ نہ ہوتی۔ تو دانش کی دی ہوئی رقم میں گزارا کیسے ہوتا۔ اسے اچھا تو نہیں لگا۔ مگر شکر ادا کیا کہ اس نے مخالفت نہیں کی تھی۔

طارق کا فون آیا۔ انسہ نے اسے بتایا کہ وہ جاب کر رہی ہے۔ اور ایم اے کی تیاری بھی۔ اس نے اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ کہہ بھی دیا کہ خالی بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ انسان مصروف رہے۔ تجربے سے بہت عقل آتی ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے ابھی یہاں مزید وقت لگے گا۔ وہ اور بھی آگے پڑھنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس کامیابی کے بعد واپسی کا سوچے گا۔

انسہ کو اس نے چند مشکل کورس بتائے۔ جن کی کامیابی اسے بہت آگے لے جاتی۔ دولت۔ شہرت۔ عزت۔ وہ کیا کہتی۔ اس نے کوئی مدت بھی نہیں بتائی۔ اب صبر کرنا تھا۔ اور انتظار لامحدود...

☼ ☼ ☼

ڈھائی سال گزر گئے۔

ان ڈھائی سالوں میں تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ دانش ایک بچے کا باپ بن گیا۔ انسہ کی ترقی ہو گئی۔ اور رمشہ تھرڈ ایئر میں آ گئی۔ خالہ کے مشورے پر انسہ نے ترقی کی اطلاع کسی کو نہ دی۔ اور امتحانات کے پرچے چیک کرنے پر اسے جو معاوضہ ملتا۔ وہ بینک میں جمع کرتی رہی۔

خالہ کے مشورے پر ہی اس نے کمیٹیاں ڈال کر "دولت کمانے" کی دوڑ میں حصہ ڈالا۔ وہ بے حد محنت کر رہی تھی۔ مونا گھر کے کاموں سے جان چراتی۔ بچے کا بہانہ بھی تھا اور یوں بھی وہ کچھ کاہل تھی۔ اماں کی صحت اس قابل نہ رہی کہ وہ پورا کچن سنبھالتیں۔

رمشہ تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی۔ مگر انسہ اسے صرف پڑھائی تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ رمشہ کی اکثر مونا سے نوک جھونک رہتی۔ اور مونا دانش سے شکایت کرتی۔ پھر دانش رمشہ سے الجھتا۔ انسہ اسکول سے آ کر کچن کا کام کرتی۔ مگر صرف کھانا پکانا ہی تو کام نہیں ہوتا۔ صفائی۔ بکھری چیزیں سمیٹنا۔ اماں کے پاس بیٹھ کر ان کی دلجوئی کرنا۔ پھر رات گئے تک اسکول کی کاپیاں چیک کرنا۔ صبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرنا۔ کبھی تو دیر ہو جاتی تو وہ بغیر ناشتے کے چلی جاتی۔ مونا سوتی ہوتی۔ دانش بھی کہتا۔

"اسے نہ جگاؤ۔ رات کو راس نے بہت جگایا ہے۔"

دانش کو بیوی اور بچے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ آفس سے آ کر بچے کو گود میں اٹھا کر کمرے میں چلا جاتا۔ کمرے سے آتا تو بچے کو سیر کرانے باہر لے جاتا بیوی کے ساتھ۔ رات کو کھانا اپنے کمرے میں ہی منگاتا۔ اسے اماں یاد تھیں۔ نہ بہنیں۔ اسے ماں کی گرتی ہوئی صحت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

اماں پر اس کی بے نیازی کا بہت اثر تھا۔ چپکے چپکے آنسو بہایا کرتیں۔ یہ ان کا وہ لاڈلا تھا جسے سب سے چھپا کر حلوے کھلاتیں۔ کونے کھدرے پردے کے پیچھے لے جا کر جلدی جلدی کھلاتیں۔ ذرا سا بیمار ہوتا ان کی نیند اڑ جاتی۔ جاگ کر اسے گود میں لے کر پڑھ پڑھ کر پھونکا کرتیں۔ پوری رات جیتی رہتی تھیں۔ ابا کو جھنجھوڑ کرتیں۔

"تم کو ذرا خیال نہیں۔ بچہ بیمار ہے۔ بے فکر سو رہے ہو۔ ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔"

"میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ گھر آنے کی فیس بہت زیادہ ہے ڈاکٹر کی۔"

لیکن اماں، دانش کے معاملے میں کسی بچت یا کفایت کی قائل نہ تھیں۔ اسے بہتر سے بہتر لباس مہیا کیا جاتا۔ کوشش کی جاتی کی غذا بھی بہتر ہو۔ اس کی پسند کا کھانا اسے دیا جاتا۔ وہی دانش اب اماں کا علاج کرانے سے چشم پوشی کر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک دن دھماکہ کر دیا۔

"میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ پنڈی کا۔ ایک ہفتے بعد چارج سنبھالنا ہے۔" جس بے فکری سے بتایا گیا تھا۔ انسہ ہکا بکا رہ گئی "تو پھر؟"

"پھر کیا؟ جانا پڑے گا۔" وہ نظریں چرا کر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ٹرانسفر رکوا نہیں سکتے؟" وہ بول گئی۔ "بیمار ماں۔ جوان بہنوں کو چھوڑ کر۔"

"مذاق نہیں ہے ٹرانسفر رکوانا۔ ترقی کے ساتھ موقع مل رہا ہے۔ ابھی جا کر مونا کے چچا کے گھر رہ لیں گے۔ پھر ایک کمرے کا پورشن تلاش کر لیں گے۔"

سب طے کر چکا تھا وہ۔

پیکنگ شروع ہو گئی۔ دانش کے پاس تو فرصت نہ تھی کہ پریشان حال ماں کی دلجوئی ہی کر لے۔ اس کی سسرال میں دعوتیں شروع ہو گئی تھیں۔

انسہ نے اپنی سسرال اطلاع نہ دی۔ وہ لوگ پشاور گئے ہوئے تھے۔ کسی عزیز کی شادی میں۔ یوں بھی ان کے فاصلے بڑھ گئے تھے۔ انسہ اپنی مصروفیت کے باعث خالہ امی سے بات نہ کر سکی۔ اور جب فون کیا۔ نوکر نے بتایا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں۔

خالہ قمر تقریباً روز آتیں۔ اماں کچھ بہل جاتیں۔ لیکن ان کی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں متفکر تھیں۔ ایک دن دانش ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ خالہ نے پوچھ لیا۔

"کچھ خبر ہے۔ ماں کتنی بیمار ہیں۔ اور جوان بہنوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ان کے لیے کچھ سوچا ہے۔؟"

"تو کیا کروں؟ نوکری چھوڑ کر ان کی چوکیداری کروں؟" اماں کا ذکر گول کر گیا۔

"میں یہ نہیں کہتی۔ مگر دوسرے شہر جاتے ہوئے بندہ پیچھے رہ جانے والوں کا کچھ انتظام تو کرتا ہی ہے۔ کیا تمہارا فرض نہیں کہ ماں کا خیال کرو۔"

دانش سر کھجانے لگا۔ جواب نہیں تھا اس کے پاس۔

"ذرا اماں کو غور سے دیکھو۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں۔ جوان لڑکیوں کے ساتھ۔ اس ناتوانی میں کیسے حفاظت کریں گی۔ تم بیٹے ہو۔ کچھ تو سوچا ہی ہو گا۔ تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ کمزور بوڑھی عورت۔ لڑکیوں کے ساتھ۔ آج کل کا زمانہ...؟"

دانش بالکل خاموش رہا۔ وہ خالہ قمر سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کچھ سوچا ہی نہ تھا۔

پھر وہ چلا گیا۔ ماں اور بہنوں کو چھوڑ کر۔ اسے ماں کی نقاہت اور ناتوانی نظر آئی۔ نہ ان کے خاموش آنسو۔ نہ بہنوں کی سراسیمگی۔ اور آنکھوں میں تفکر کی سرخی۔ بلکہ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی تھی۔ قدموں میں تیزی اور شوق۔ بچے کو سنبھالتے اس کے ہاتھوں کی لرزش خوشی بے پناہ خوشی کا تاثر دے رہے تھے۔

وہ چلا گیا۔ اور گھر میں سناٹے چھوڑ گیا۔ گھر کی رونق بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اماں کی گود سونی ہو گئی۔ اور بے شمار امیدیں دم توڑ گئیں۔ انسہ کو لگا وہ جنگل میں اکیلی کھڑی ہے۔ رمشہ سر گھٹنوں میں ڈالے گھنٹوں بیٹھی رہی۔ وہ تھی مگر کوئی اس کے آنسو پونچھنے نہیں آیا۔ تینوں خواتین گم صم خاموش تھیں۔ بولنے کے لیے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ مگر کب تک۔ رات کو رمشہ نے انسہ کو بتایا۔ اس نے اتفاق سے دانش اور مونا کی گفتگو سنی تھی۔ دانش کہہ رہا تھا۔

"میں نے تو صرف تمہاری وجہ سے ٹرانسفر کروایا۔

گھر کی چیخ چیخ سے بچنے کے لیے۔ بابا تو آجکل شیخ کو بھیجنا چاہتے تھے۔ اتفاق تھا کہ وہ دس دن کی چھٹی پر اسی دن کراچی چلا گیا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔"

"مگر میرا دل نہیں چاہتا۔ اتنی دور۔۔۔۔" مونا ستا ئی تھی۔

"کوئی دور نہیں۔ سوچو۔ کتنا لطف آئے گا۔ سیرو تفریح کریں گے گھر کی فکر نہ کوئی روک ٹوک۔ رمشہ سے تمہاری نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ کام کرنا پڑتا تھا۔ اپنا الگ گھر ہو گا۔ جو چاہیں کریں۔ کبھی کھانا گھر میں پکا لیا۔ نہ جی چاہا تو ہوٹل زندہ باد۔"

"خیر پابندی تو یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔"

"اوہو۔ وہ نئی جگہ نیا شہر ہو گا۔ خوب سیر کریں گے۔"

"ہونہہ۔ پنڈی میں کون سی سیر گاہیں ہیں۔ گندا شہر۔"

"اُفوہ۔ اسلام آباد چلے جایا کریں گے۔"

"روز کون سیر کرتا ہے اور اسلام آباد اتنا قریب بھی نہیں کہ روز جائیں۔ پہاڑیوں کے سوا اور وہاں ہے ہی کیا۔ یہاں! اتنے پارک ہیں۔ راوی۔ جہانگیر کا مقبرہ۔ اور۔۔۔"

"اُفوہ۔ چھوڑو بھی۔ اب میں نے خود کہہ کر کروایا ہے۔ بس تیاری کرو۔ چلتے ہیں مزے کریں گے۔"

"ہاں۔ بڑے مزے۔ خود سارا کام کرنا پڑے گا۔ یہاں تو کچھ نہ کروں پھر بھی پکا پکایا مل جاتا ہے۔ اماں کہتی ہیں' رامس کو دیکھو۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

مونا برابر اعتراض کر رہی تھی۔ دانش آزادی کے گن گا رہا تھا۔ رمشہ سے کبھی کبھار کی نوک جھونک کی سزا۔ ان تینوں کو کتنی سخت دی تھی بھائی نے۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ وہ ابھی چچا کے گھر ہی مقیم تھے۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ گزر گئے۔ شاید سیر و تفریح ہی ہو رہی تھی۔ پھر انہیں ایک پورشن مل گیا۔ اور دانش نے پھر ایک دھماکہ کر دیا۔

"میں پنڈی سے ہر ماہ نہیں بھیج سکوں گا۔ مکان کا کرایہ' گیس بجلی کا بل' رامس کا خرچہ۔ تم لوگ ہاتھ کھینچ کر خرچ کرو۔ بہتر ہے کہ انسہ کی تنخواہ میں ہی گزارا کر لو۔ جب بھی ممکن ہوا۔ میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔"

گویا یہ لوگ تو گیس بجلی سے واقف ہی نہیں۔ انسہ کے پیر تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس نے دانش کو فون کیا۔ کیونکہ اس کی بات رمشہ سے ہوئی تھی۔

"بھائی! میں۔۔۔ سارے بل کیسے دوں گی۔ پھر ہم کھائیں گے کہاں سے؟"

"تو میں کیا کروں۔ اسلام آباد میں گھر ملا ہے۔ مونا کو پنڈی پسند نہیں۔ اور یہاں کی مہنگائی۔ اف توبہ۔ تھوڑے دن میں سستی مارکیٹ کا پتہ چل جائے گا تو شاید کچھ بچت ہو جائے۔ پھر بھیجوں گا جو بھی ہو سکا۔"

"پر بھائی! میری تنخواہ۔۔۔ اتنی تو نہیں ہے۔" دل بھر آیا۔ کہہ نہ سکی۔ اماں کی دوائیں۔ رمشہ کے کالج کا خرچ۔ گیس بجلی کے بل۔ اور مہنگائی کا دیو۔۔۔۔

"میری شادی نہ ہوئی ہوتی۔ تو تم سب کو لے کر آتا۔ اب تو مجبوری ہے۔ تم خالہ امی سے کہو۔ بہت پیسے والی ہیں۔ تمہارا خرچ تو انہیں اٹھانا چاہیے۔ ان کا فرض بنتا ہے۔ تمہارا حق ہے۔ بعض دفعہ مانگنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔"

نہ جانے وہ کیا کیا کہہ رہا تھا۔ انسہ نے فون بند کر دیا۔ پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر دل کی دھڑکن کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کس سے کہتی۔ اور لے دے کے خالہ قمر ہی تھیں۔ ہمدرد۔ خیر خواہ' بہترین انسان۔ بہترین مشیر۔ وہ بھی ایک لمحے کو دم بخود ہو گئیں۔

"تم کہتیں۔ جتنی ترقی ہوئی ہے۔ وہی پابندی سے بھیج دیا کرو۔"

"خالہ! مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔" وہ بے بسی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"اچھا۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ [illegible] انشاء اللہ ملیں گی جب بیٹے خود غرض [illegible] ہیں۔ شادی کے بعد خاص طور پر کچھ تو [illegible] ہیں کر۔"

فکر مند تو تھیں۔ انسہ کا بوجھ کم ہو گیا۔ اماں کی دوائیں اور سودا آ گیا۔ اب۔۔۔۔ اللہ کے سوا۔۔۔۔ کوئی مددگار نہ تھا۔ زندگی پہلے بھی بہت شاندار نہ تھی۔ لیکن خوشگوار تھی۔ اماں ابا بھائی بہن ہنستے تھے۔ لطیفے سنا کر خوش ہوتے' لڑتے تو کوئی ابا سے شکایت کرتا کوئی اماں سے۔ لمحوں میں پھر سب ایک ہو کر ہنسی مذاق شروع کر دیتے۔

دولت نہ سہی۔ بہت خوشحالی نہ سہی۔ مگر ایک دوسرے کے ساتھ۔ صبر شکر قناعت اور اتفاق کی دولت سے مالا مال یہ گھرانہ۔ کبھی کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ فکریں' پریشانیاں' اندیشے اور ویرانیاں اس گھر کے مکین ہو سکتے ہیں۔

انسہ سوچ سوچ کر تھک گئی۔ اللہ ہم سے کیوں ناراض ہے۔ کیا ہم نے ناشکری کی ہے؟ یا اللہ کی نافرمانی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اور اللہ سے توبہ کرنے لگی۔

خالہ آئیں تو چار لڑکیوں اور دو لڑکوں کے ساتھ۔

"رمشہ کے لیے ٹیوشن کا انتظام ہو گیا۔" انسہ نے [illegible] کو پاس بلا کر بچوں سے ملایا۔ میٹرک کے طلباء و طالبات۔ فیس بھی قابل قبول۔ رمشہ مان گئی۔

"میں نے دانش سے بات کی ہے۔ اچھی طرح خبر لی۔ کہتا تو صحیح ہے۔ اس مہنگائی میں گھر لے کر پوری ذمہ داری اٹھانا۔ ناتجربے کاری کے سبب اخراجات کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ بہرحال وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجنے پر راضی ہو گیا ہے۔"

کچھ دانش نے اس پر عمل بھی کیا۔ مگر آٹے میں نمک کے برابر۔ انسہ نے شکر ادا کیا۔ رمشہ بچوں کو پڑھانے لگی۔ خود وہ بھی محنت کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

خالہ اپنی بہن سے ملنے آئیں۔ حج کی ادائیگی کے لیے جا رہی تھیں۔ فکر مند اور رنجیدہ تھیں۔ سب سے مل کر دعائیں لے کر اور دے کر گئیں۔

مگر خالہ آ جاتیں گھر میں کچھ رونق چہل پہل ہو جاتی۔ رخسانہ آئی ہوتی تو اسے بھی لے آتیں۔ وہ انسہ کو طارق کے نام سے چھیڑتی۔ مذاق کرتی۔ انسہ تو اب اس ذکر سے چڑنے لگی تھی۔

"فون تو کرتے ہوں گے۔ کب تک آنے کا کہا ہے؟ نہیں؟ ارے تو تم کر لیا کرو۔ بیوی ہو ان کی۔ گناہ تو نہیں ہے بات کرنا۔ پوچھو تو سہی۔ کیا ارادے ہیں۔"

خالہ نے بھی پوچھا۔ "حج کے لیے گئی ہیں آپا۔ کچھ بتا کر نہیں گئیں؟ بھئی اپنی امانت لے جائیں۔ کب تک انتظار کروائیں گی۔" اماں بھی پریشان تھیں خالہ امی نے نام تک نہیں لیا۔

ایک دن اماں نے خالہ سے کہا۔ "قمر! مجھے بہت فکر ہے۔ اگر میں نہ رہی۔ ان دونوں کا کیا ہو گا۔ کون ان کے سر پر ہاتھ رکھے گا؟" خالہ ناراض ہونے لگیں۔ "توبہ کرو۔ مایوسی کفر ہے۔ ایک تو خالہ کے گھر کی ہو گئی۔ دوسری کا بھی اللہ رشتہ بھیجے گا۔ اللہ سے ہمیشہ اچھی امید رکھنا چاہیے۔ تم ان کا سائبان ہو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ خدا سب سے بڑا مددگار ہے۔"

اماں رونے لگیں۔ وہ بہت رقیق القلب ہو گئی تھیں۔ بیٹے کی جدائی سے زیادہ اس کی بے نیازی اور لاپروائی کا غم اندر ہی اندر انہیں کمزور کر رہا تھا۔

خالہ بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ ان کے آنسو پونچھتے ہوئے ساتھ ہی سمجھاتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

ایک دن رخسانہ چند خواتین کے ہمراہ آئی۔ وہ رمشہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ دیکھتے ہی رشتہ دے دیا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ دوبئی میں کسی شیخ کے تعاون سے کلینک چلا رہا تھا۔ اماں نے چند سوال کیے۔ خالہ قمر بھی آ گئیں۔ دراصل لڑکا رشتے میں رخسانہ کا دور کا دیور تھا۔ اماں نے اقرار کر لیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد

انسہ نے کہا۔

"اماں! اتنی جلدی اقرار کر دیا؟ بھائی سے تو مشورہ کر لیتیں۔ وہ کہیں گے کہ ان سے ذکر تک نہیں کیا۔"

"مجھے اس کے مشورے کی ضرورت نہیں۔" اماں تنک کر بولیں۔ وہ بے زار تھیں۔

وہ لوگ تو نکاح کرنے کا کہہ رہے تھے مگر اماں ایک کا حال دیکھ کر ڈری ہوئی تھیں۔ بی اے کے امتحان کے بعد نکاح، رخصتی طے کر دی۔ انسہ کو اب رمشہ کے جہیز کی فکر ہو گئی۔ ان لوگوں نے سختی سے جہیز لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا تو تھا۔ کپڑے، بستر، چادریں تو لیے وغیرہ۔ زیور تو تھا۔

اللہ کی مہربانی سے انسہ کی ترقی ہوئی۔ اب اسے دو کلاسیں دے دی گئیں۔ تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ رمشہ کے اسٹوڈنٹس کی فیسوں نے بھی برکت ڈالی۔ دانش کا بھیجا چیک بینک میں جمع ہو جاتا۔

دانش، مونا کے ساتھ ایک سال بعد آیا تھا تین دن کے لیے سسرال کی دعوتوں سے جو وقت ملتا۔ گھر آتا۔ اماں کے پاس بیٹھتا۔ دوائیں چیک کرتا۔ حال چال پوچھتا مگر اماں اس سے مخاطب نہ ہوتیں۔

وہ رمشہ کی سسرال بھی گیا۔ فون پر دل سے بات کی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ اس نے ایک بار بھی مشورہ نہ کرنے کا شکوہ نہیں کیا۔ شاید سمجھ گیا تھا کہ اماں کو اس پر اعتبار نہیں۔

اس نے طارق سے بات کی تھی وہ ان دنوں سوئٹزرلینڈ گیا ہوا تھا۔ سوئٹزرلینڈ جانے کی بات تو طارق نے انسہ کو بتائی تھی مگر اس بات کو بھی مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ دانش کے جانے کے دو ماہ بعد اماں کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ جو ممکن تھا انسہ رمشہ نے کیا۔ رات آنے کو تھی۔ خالہ کو فون کیا۔ وہ بھی گھبرا گئیں مگر لڑکیوں کو تسلی دی۔

"اچھا میں آتی ہوں۔ تم دانش کو فون کر دو۔ اسے فوراً آنے کا کہو۔"

وہ جب آئیں۔ رمشہ ماں کا ہاتھ کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ انسہ ضروری چیزیں جمع کر کے باسکٹ میں رکھ چکی تھی۔ دونوں بہنیں سخت ہراساں تھیں۔ اماں بے ہوشی کے عالم میں تھیں۔ قریبی میں جو ہسپتال نزدیک تھا۔ وہیں لے گئیں ایمرجنسی میں جو ڈاکٹر تھے وہ کچھ مطمئن نہ تھے۔ خالہ کے پوچھنے پر انسہ نے بتایا۔

"دانش نے کہا ہے۔ ڈاکٹر جو بتائیں۔ انہیں بتا دیا جائے۔ سردی میں آدھی رات کو روانہ ہوئے تو صبح چار بجے لاہور پہنچیں گے۔ بچے کے ساتھ مشکل ہو گی۔ وہ صبح ہی روانہ ہوں گے۔"

انسہ فکر مند تھی۔ تین لوگوں کا ہسپتال میں رہنا مناسب نہ تھا۔ خالہ تمر رمشہ کو لے کر گھر چلی گئیں۔ انسہ ایمرجنسی کے باہر برآمدے میں بینچ پر بیٹھ گئی۔ خالہ اور رمشہ کے سامنے خود کو بہادر ظاہر کرنے کے باوجود وہ اندر ہی اندر کمزور ہو رہی تھی۔

"اللہ۔ مدد فرما! میری ماں کو میرے سر پر قائم رکھنا۔ ہمیں بے آسرا نہ کرنا۔"

دل میں دعائیں کرتے کرتے وہ تھک گئی۔

ایمرجنسی میں ڈاکٹر، نرسیں، وارڈ بوائے اور نئے آنے والے مریضوں کی وجہ سے ذرا سی چہل پہل تھی۔ لیکن برآمدہ خالی تھا۔ اس دواؤں کے اثر سے مدہوش تھیں۔ پھر نرس کو اس پر ترس آیا۔ جو شال اپنے سردی سے سکڑی بیٹھی تھی۔ نرس نے اسے اندر آنے کو کہا۔ بالکل کونے میں کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ نہ اسے دواؤں کی بدبو بری لگی نہ مریضوں کی کراہیں کہ سامنے اماں تھیں۔

صبح فجر کے وقت اماں کو ہوش آیا۔ انسہ سے انہوں نے باتیں کیں تسلی دی۔ دودھ پیا۔ اور پھر دوا کے اثر سے سو گئیں۔ کمزوری۔ خون کی کمی۔ بس ڈاکٹر نے یہی بتایا۔ صبح کو بڑے ڈاکٹر صاحب آئیں گے۔ کچھ ٹیسٹ لیے جائیں گے۔

انسہ تو اماں کے ہوش میں آ کر چند باتیں کرنے سے ہی شکر ادا کر رہی تھی۔ باہر جا کر نماز ادا کی اور ان کی صحت کے لیے دعائیں کیں۔ کینٹین جا کر چائے پی۔ اماں کے لیے دودھ لیا۔ اب وہ ایمرجنسی میں نہیں

بستی تھی کیونکہ نرسوں کی شفقت تبدیل ہو گئی تھی۔ سو وہ دوا دے کر پھر بینچ پر آ بیٹھی۔ پھر رمشہ کو فون بتایا اور تاکید کی کہ ابھی دانش کو بتا دے۔ بڑے ڈاکٹر صاحب آئیں گے۔ تب وہ معائنے کے بعد صحیح بتائیں گے۔

بارے صبح کی روشنی کے ساتھ چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ اور نئی امید کے ساتھ وہ کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی۔ پوری رات جاگ کر گزاری تھی۔ جسم اکڑ رہا تھا۔ تب ہی رمشہ اور خالہ آ گئیں۔ ڈاکٹر نے چند ٹیسٹ بتائے تھے۔ اس کے لیے اماں کو لے جایا گیا تھا۔ پھر وہ آ گئیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائیں۔ مگر ان کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ شاید بیٹے کے لیے۔

خالہ گھر چلی گئیں۔ تاکہ سب کے لیے کھانا وغیرہ بنا لیں۔ دانش پنڈی سے دوپہر کو آیا۔ دونوں بہنیں جذباتی ہو گئیں۔ انہیں تسلی دے کر ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا۔

پھر رمشہ کو لے کر گھر چلا گیا۔ تھکا ہوا تھا شاید... رمشہ ایک پڑوسن کے ساتھ آئی۔

"گھر میں دل نہیں لگا۔ وحشت ہو رہی تھی۔" اس نے بتایا۔ "خالہ نے کچھ رقم بھیجی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے قرض مانگا تھا۔"

"تو... یہ بھائی کچھ نہیں دیں گے۔"

"میں نے سوچا۔ میرے پاس بھی کچھ رقم ہونی چاہیے۔ بعد میں واپس کر دوں گی۔"

"بھائی کو بتا دینا۔ ورنہ انہیں یقین ہو گا کہ ہم بہت پیسے والے ہیں۔"

"تم گھر چلی جاتیں۔ صبح کالج جانا ہو گا۔" انسہ نے بات ٹال دی۔

"اور تم؟ اسکول نہیں جاؤ گی؟ کل سے یہیں بیٹھی ہو۔ ذرا گھر جا کر سو لیتیں۔ ویسے بھائی کو اتنی فکر نہیں ہے۔ جتنی ہمیں ہے۔ تمہارے بجائے وہ رک سکتے تھے۔"

انسہ کو اس کی فکروں پر پیار آ گیا۔ یہ وہی رمشہ ہے۔ کھلنڈری۔ لاپروا۔ ضدیں کر کے منوانے والی۔

رات کو خالہ ان دونوں کا کھانا لے آئیں۔ پھر کچھ دیر ٹھہر کر اپنے گھر چلی گئیں۔ یہ کہہ کر کہ "صبح آؤں گی۔"

خالہ سے ان کو بہت ڈھارس تھی۔ وہ تو اللہ کی طرف سے فرشتہ بن کر آ جاتی تھیں ہمیشہ۔ اماں کی ڈھارس بندھاتیں۔ تسلیاں دیتیں۔ واقعی انسان کی زبانی تسلی بھی طاقت بحال کرتی ہے۔ جیسے ڈرپ لگا دی ہو۔ اور پھر وہ ہمدرد بھی تھیں۔ ہر موقعے پر ستون کی طرح کھڑی ہو جاتی تھیں۔

رات والی نرس نے آج بھی دونوں کو ایمرجنسی وارڈ میں ایک بینچ دے دی۔ شکریے کے ساتھ دونوں بیٹھ گئیں۔ اتنا ضرور ہوا کہ انسہ کو اس مختصر بینچ پر رمشہ کی گود میں سر رکھ کر نیم دراز کیفیت میں تھوڑی نیند لینے کا موقع مل گیا۔ رمشہ نے دیوار سے پیٹھ لگائی ہوئی تھی۔ کبھی وہ بھی اونگھنے لگتی۔

صبح ہوتے ہی دونوں باہر آ گئیں۔ رات میں اماں ایک بار جاگی تھیں۔ دونوں ان کے پاس پہنچ کر ان سے لپٹ گئیں۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ مگر کمزوری میں کمی نہیں آئی تھی۔ پھر بھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائیں۔ صبح ڈاکٹر آئے تو انسہ نے ان سے کمرے کی بات کی۔ تاکہ وہ دونوں بھی ان کے پاس رہ سکیں۔ ڈاکٹر نے سہولت سے انکار کر دیا۔

"ابھی ان کی حالت قابل اطمینان نہیں۔ ٹیسٹ، بلکہ ٹیسٹوں کی رپورٹ دیکھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔"

دانش ڈاکٹر سے مل کر آیا۔ تو اس کے ہاتھ میں ٹیسٹوں کے بل تھے۔ بوکھلایا ہوا تھا۔

"میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔ ابھی کیا پتا کتنے دن کا علاج ہونا ہے۔ یہ بل دیکھو۔ مریض کی چھٹی ہوتی ہے تو بل ادا کر کے جاتا ہے۔ ان کا نیا اصول ہے کہ فوراً ادائیگی کرو۔ آخر کیا سوچ کر تم اتنے مہنگے ہسپتال میں آئی تھیں۔ اپنی حیثیت دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ سرکاری ہسپتال بھی تو ہیں۔"

"بھائی!" رمشہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ "وہ ہماری

اماں ہیں۔ ہم ان کا بہتر سے بہتر علاج کرائے یا انہیں خیراتی ہسپتال لے جاتے؟ جو ان کی حالت ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے؟ خیراتی ہسپتال میں نہ علاج ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ اور نہ ہی دوائیں ملتی ہیں۔ وہاں لے جاتے۔ اماں کو؟"

"کیوں؟ جو وہاں جاتے ہیں۔ وہ انسان نہیں ہوتے؟ وہاں ماؤں کا داخلہ بند ہوتا ہے؟ تم لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" وہ بگڑ گیا۔

"بس بھائی! اس وقت یہ ہسپتال ہی قریب تھا اور اچھا بھی ہے۔" انسہ نے اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"کیا اچھا ہے؟ اتنا مہنگا۔ لٹیرے ہیں سب یہاں۔ بہانوں سے لوٹتے ہیں۔ ٹیسٹوں کے ہزاروں روپے۔ او میرے خدا! کہاں سے دوں گا میں؟"

"ابا پر تو خرچ نہیں کیا تھا کچھ۔ آپ سمجھ لیں کہ ــــ دونوں کے علاج کا خرچ ہے۔" رمشہ نے نکتہ تلاش کیا۔

"میں نے خالہ سے قرض لیا ہے۔" انسہ نے دھیمی آواز میں کہا کہ کہیں وہ قرض کا سن کر ہی نہ خفا ہوجائے۔ "ابھی یہ بل تو دے دیں۔ بعد کے بل اس رقم سے ادا کردیں گے۔ مگر ان کا قرض بھی ادا تو کرنا ہوگا۔ خیر۔ میں بات کرلوں گی خالہ سے۔"

دانش نے اطمینان کا سانس لیا۔ انسہ کو ایسا ہی لگا۔ دانش کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ "وہاں مونا اکیلی ہے۔ رامس تنگ کررہا ہوگا۔ کھانا بھی اسے بنانا ہے۔"

رمشہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ اب انسہ اکیلی تھی۔ اماں کی حالت بھی ٹھیک نہ تھی اور دانش کا رویہ... اسے رونا آرہا تھا مگر ضبط کررہی تھی۔ مائیں بیٹوں کی دعائیں کرتی ہیں۔ تعویذ بھی کرتی ہیں۔ اور بیٹا ہو تو بیٹیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کس لیے؟ بیٹے ایسے ہوتے ہیں؟

دانش، مونا کو لے کر شام کو آیا۔ باہر سے ہی جھانک کر دیکھا۔ انسہ سے تو بات بھی نہیں ہوسکی۔ اسے دیکھ کر آنسوؤں کی چلمن سے باہر آگئے۔ مونا نے اس کو گلے لگا کر تسلی دی پھر "رامس رو رہا ہوگا۔" کہہ کر دونوں چلے گئے۔

شام کو رمشہ خالہ کے ساتھ آئی۔ خالہ نے بہت اصرار کیا کہ آج انسہ چلی جائے۔ وہ اکیلی رہ لیں گی مگر۔ سرد رات۔ اور سخت بینچ۔ خالہ کو اگر ٹھنڈ لگ گئی؟ وہ بیمار نہ ہوجائیں۔ رات کے جاگنے کی جو تکان ہوتی ہے انسان اس سے بیمار بھی ہوسکتا ہے۔

اسے اپنی فکر نہ تھی۔ جو متواتر ہسپتال کی ڈیوٹی دے رہی تھی مگر وہاں اس کی ماں تھیں۔ وہ ان سے ایک منٹ بھی دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔

خالہ چلی گئیں۔ رمشہ نہیں گئی۔ اب پھر دونوں بہنیں برآمدے میں بیٹھی ایمرجنسی کے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید کوئی نیا مریض آیا تھا۔ نرسیں بھی ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ ڈاکٹر بھی اندر باہر جا رہے تھے۔ انسہ نرسوں کے کردار سے بہت متاثر تھی۔ بغیر کسی رشتے ناتے کے وہ کس طرح رات دن مریضوں کا خیال کرتی ہیں۔ نیند کی قربانی دے کر۔ بے آرامی اور وقت دینا ہی نہیں بس کام۔ کام۔ خدمت دیکھ بھال۔ قابل تعریف اور باعزت پیشہ ہے۔

رات کو اچانک اماں کی طبیعت بگڑ گئی۔ نرس نے آکر بتایا۔ اماں کے پلنگ کے گرد سفید پردے تھے۔ اندر ڈاکٹرز اور نرسیں۔ نرس نے ان دونوں کو اندر آنے سے منع کردیا۔ دونوں خوف کی کیفیت میں دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔ انسہ نے رمشہ کو کانپتے دیکھا تو اسے پکڑ کر بینچ تک لائی۔ نرس نے انہیں تھپکی دی۔

"حوصلہ کرو گرلز! حوصلہ۔ اللہ سے دعا کرو۔"

"میں فون کرلوں گھر؟" انسہ نے نرس سے کہا۔

"پلیز سسٹر۔ آپ۔ میری بہن کے پاس...؟" نرس نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ جاؤ۔ میں بیٹھی ہوں۔"

فون پر مونا تھی۔ اس نے بتایا۔ "دانش، رامس کو لے کر ڈاکٹر کے کلینک گئے ہیں۔ وہ زینے پر سے گر گیا تھا۔ بہت رو رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں سخت چوٹ لگی ہے۔ خالہ کی بیٹی کا فون آیا تھا وہ ان کے گھر آئی تھی۔ تو خالہ اپنے گھر چلی گئیں۔ کہہ رہی تھیں۔ صبح ادھر سے ہی ہسپتال جائیں گی۔"

"اچھا مونا! بھائی آجائیں تو ان سے کہنا اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ پتہ نہیں اب...؟" مزید کچھ بولا نہ گیا۔ آنسو روکتی ہوئی واپس آئی اور رمشہ کے پاس بیٹھ گئی۔

"خالہ ــــ آرہی ہیں؟" رمشہ کو شاید خالہ ہی کا انتظار تھا۔ بھائی کا نہیں۔

"وہ ــــ رخسانہ آگئی تھیں تو۔ خالہ گھر چلی گئیں۔"

"اب ــــ اب کیا ہوگا آپا!" رمشہ بہت گھبرا گئی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"اللہ۔ اللہ مالک ہے۔ صبح آجائیں گی۔"

انسہ کے پیر بھی اپنا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوئے تو وہ بینچ پر ٹک گئی۔ دل جیسے سینہ توڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔ وہ ہر پانچ منٹ بعد ہسپتال کے گیٹ کی طرف دیکھتی۔ مگر وہاں گیٹ بند۔

☆ ☆ ☆

رات ایک بجے ایمرجنسی میں ہلچل سی ہوئی پھر ڈاکٹر نے ان کے پاس آکر بہت افسوس کے ساتھ بتایا۔

"سوری۔ آپ کی والدہ کو ہم نہیں بچا سکے۔ اللہ کی مرضی۔"

"میں؟ اماں... کیا؟" وہ کھڑی ہوئی تو جیسے زمین کانپی تھی۔ رمشہ نے جیسے مدد طلب نظروں سے ایمرجنسی کے گیٹ کی طرف دیکھا۔ انسہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ جو سراسیمگی کی کیفیت میں نرسوں کے اندر باہر آنے جانے کا منظر دیکھ رہی تھی۔

"اٹیک ہوا تھا۔ بہت سخت، دوسرا اٹیک تھا۔ صبر کرو بی بی!"

یہ وہی نرس تھی۔ مہربان سسٹر جو انہیں سرد موسم سے بچا کر ایمرجنسی کے کونے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتی تھی۔

"بی بی! اپنے بھائی کو اطلاع دے دو۔ یا تو ابھی ڈیڈ باڈی وصول کرلے۔ یا پھر صبح کا انتظار..."

انسہ مرے مرے قدموں سے فون کرنے کاؤنٹر پر پہنچی۔ دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ یہ کیا ہوگیا۔ کیسے ــــ کبھی سوچا نہ تھا۔ باپ نہ ماں اور کھلا آسمان قدموں تلے سرکتی زمین۔ دانش بے خبر سو رہا تھا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ کئی بار کی کوشش کے بعد اس کی سوئی سوئی بھاری آواز آئی۔ "ہیلو۔"

"بھائی! آپ فوراً آجائیں۔ اماں۔ اماں گزر گئیں۔"

"پاگل ہو۔ اتنی سردی میں دو بجے رات کو بھاگا بھاگا ہسپتال آؤں۔ رات بھر رامس روتا رہا۔ پیر میں فریکچر ہوگیا ہے۔ ابھی تو ہم سوئے تھے۔ خالہ کو بھی آج گھر جانا تھا۔ اف...!" اس نے شاید آخری بات سنی نہیں تھی۔

"بھائی! اماں۔ نہیں رہیں۔ وہ چلی گئیں۔" نہ جانے کیسی آواز تھی اس کی۔

"ارے۔ اب۔ میں مونا کو اکیلا چھوڑ کر کیسے آؤں۔ صبح آؤں گا۔ اچھا۔"

رمشہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ نرس دلاسا دے رہی تھی۔ بس اب دلاسوں کے ساتھ ہی زندگی گزرنی ہے۔ وہ خود کو بھی تسلی دے رہی تھی۔

"آپا! بھائی آرہے ہیں؟ خالہ کو فون کردیا؟"

"نہیں۔" اس نے دونوں سوالوں کا جواب دیا۔ اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ پھر وارڈ بوائے اماں کو اسٹریچر پر ڈال کر کسی دوسری جگہ لے گئے۔ وہ دونوں دیکھتی رہیں۔ عقل کام نہیں کررہی تھی۔ رات، سردی۔ ہوا کی مدھم سی آواز۔

ایمرجنسی میں بھی یک لخت سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ ایک اجنبی سا احساس ان کے دلوں پر زخم لگا رہا تھا۔ جیسے سوئی کی نوک سے کوئی دل کی باریک رگوں کو چھیڑ رہا ہو۔ چبھن اذیت ناک چبھن۔ ہر جانب جنگل اگ آیا تھا۔ یا صحرا پھیل گیا تھا۔ بے یار و مددگار دونوں بہنیں۔ مسافروں کی مانند اس صحرا میں بھٹک رہی

تھیں۔

"آپا! کیسے ہو گیا یہ سب۔ ایسی حالت تو نہیں تھی اماں کی۔ اب ہم کیا کریں گے۔"

رمشہ کی آواز نے انسہ کے اعصاب جھنجھوڑ ڈالے۔ "اللہ کی مرضی اب صبر کرنا ہے۔ اب ہم دونوں کا۔ اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ یاد رکھو۔ کسی سے توقع نہیں۔ کسی سے مدد کی امید نہیں۔ اللہ کے سوا۔ صرف اللہ ہے۔ اس کی مرضی ہے تو ہم زندہ رہیں گے اس کی مدد ہوگی تو نعمتوں کا حصول مشکل نہیں۔ ورنہ بھوکے رہ کر بھی گزارا کرلیں گے' اٹھو۔ نماز پڑھو۔ اماں کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ اب جو کچھ کرنا ہے۔ ہمیں ہی کرنا ہے۔ اور اس وقت اماں کو ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ آنسوؤں کی نہیں۔"

وہ اس وقت ایک ناصح بن گئی۔ بڑی بہن۔ ماں جیسی۔ بزرگ اور وارث۔

فجر کی نماز کے بعد اس نے خالہ کو فون کیا۔ وہ فجر کے لیے اٹھی ہوئی تھیں۔

رات گزر گئی تھی۔ صبح نمودار ہوگئی تھی۔ ایک غم ناک افسردہ اور بوجھل۔

خالہ 'رخسانہ کے ساتھ آئی تھیں۔ خاموشی سے دونوں کو اپنے گرم وجود میں سمیٹ کر آنسو پونچھنے لگیں۔ ہاں کوئی تو ہے۔ اپنا ہمدرد۔ خیر خواہ۔

"تم نے رات کو ہی مجھے فون کیوں نہ کیا۔ میں آجاتی۔ کم از کم تم دونوں اس طرح بے یار و مددگار تو یہاں نہ بیٹھی ہوتیں۔ بیٹا! انسان ہی انسان کا ساتھی ہے۔"

"آپ اس وقت آکر کیا کرتیں خالہ! اتنی سردی میں...!"

"سردی میں کیا سارے کام رک جاتے ہیں؟ میں وہی کرتی جو اب کر رہی ہوں۔ تمہیں لپٹا کر روتی۔ غم مناتی۔ فاتحہ کرتی۔ دانش کب آئے گا؟"

دانش جب آیا۔ دھوپ پھیل چکی تھی۔ خالہ ہاسپٹل کے واجبات کی ادائیگی اور ایمبولینس کا انتظام کرچکی تھیں۔ چاروں خواتین گیٹ پر ایمبولینس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ایمبولینس آئی اور اب سمیرا بیگم کے جسد خاکی کو آنا تھا۔ رخسانہ انہیں لیے اندر جا چکی تھی۔

دانش آکر مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اسے مخاطب کیا نہ ہی اسے دیکھا۔ خالہ نے دائیں بائیں بھانجیوں کو لپٹایا ہوا تھا۔ دانش کو شرمندگی ہوئی۔ خالہ کا گھر تو یہاں سے بہت فاصلے پر تھا۔ اور وہ کب سے آئی ہوئی تھیں۔ دانش اپنے گھر سے دیر سے نکلا۔

گھر عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ مونا گھبرائی ہوئی تھی۔ کسے کہاں بٹھائے۔ کچھ پڑوسنوں نے جو ہر جگہ سے واقف تھیں۔ الماری سے چادریں نکالیں۔ کسی نے گدے بچھائے۔

انسہ نے پہنچنے کے بعد سب کو آرام سے بٹھانے کا انتظام کیا۔ صبر۔ ضبط کی تصویر۔ مردوں کے لیے ڈرائنگ روم میں کرسیاں رکھوا دیں۔ کچھ لوگ گلی میں کھڑے تھے۔ کچھ دانش کو مشورے دے رہے تھے۔

تین راتوں کی جاگی ہوئی انسہ' رمشہ کے پاس بیٹھ گئی۔ خالہ قمر نے باقی کا انتظام سنبھالا۔ رخسانہ اور مونا خواتین کے درمیان بیٹھی تھیں۔ پھر تمام خواتین انسہ اور رمشہ کے گرد آ بیٹھیں۔ اماں کی تمام محلے والیوں سے بہت دوستی تھی۔ کتنا خوش ہوتی تھیں وہ۔ ان لوگوں کے آنے سے۔ آج تمام ایک ساتھ آئی تھیں اور... اماں نہ تھیں۔

رمشہ کے سسرال والے بھی آگئے۔ خالہ امی کب آئیں' انسہ کو پتہ نہ چلا۔ وہ آکر لپٹ گئیں تو آنسوؤں کے نکلنے کے راستے مل گئے۔ رمشہ کی ساس نے بھی بے حد شفقت کا اظہار کیا۔ رمشہ کے پاس بیٹھی سمجھاتی رہیں۔ ظہر کے بعد جنازہ اٹھا تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ مرنے والی کا غم تو الگ۔ دو لڑکیوں کے بے سائبان ہونے کا دکھ سب کو تھا۔ خالہ نے سمجھایا۔

"اب تم نماز پڑھ کر ماں کے لیے دعا کرو۔ تمہارے آنسوؤں سے سمیرا کی روح کو اذیت پہنچے گی۔"

رمشہ کی ساس کھانا لائی تھیں۔ انسہ کی تو بھوک

[illegible] کے ساتھ چلی گئی تھی۔ مگر خالہ قمر یہاں بھی [illegible] روح کا واسطہ دے کر اسے تھوڑا سا کھانے پر مجبور [illegible]۔

[illegible] تھا۔ سوگوار۔ اجڑا ویران۔ رمشہ اور انسہ کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ وہ روح میں اترتے سناٹے سے ناواقف گم صم ایک جگہ بیٹھی تھیں۔ نہ جانے اماں کے بغیر دن رات کیسے گزریں۔

خالہ اسی شام کو چلی گئیں۔ گھر خالی ہو گیا۔ خالہ قمر کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"بڑی بہن تھی۔ بھانجیوں کے پاس رکنا چاہیے تھا۔ کیسا خون سفید ہوا ہے لوگوں کا۔ توبہ۔ میاں نے بلوایا تابعداری سے چل پڑیں۔ واہ۔"

"خیر۔ خالہ امی نے تو پھر بھی بہت محبت کا اظہار کیا تھا۔ خالو بہو کے رشتے سے ہی انسہ کے پاس آجاتے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے۔ مگر..."

شام ہوتے ہی خالہ نے دونوں کو بٹھا کر خوب نصیحتیں کیں۔ اور انہیں جلد سونے پر مجبور کیا۔

"تمہاری امی تو بیمار پڑیں تو تم دونوں نے دیکھ بھال کرے گا۔ اب غم تو زندگی کے ساتھ رہے گا۔ تم دونوں کو اپنا خیال خود کرنا ہوگا۔ چاہنے والی۔ خبر رکھنے والی تو اب نہیں رہی۔ عشاء کی نماز پڑھو۔ اور سو جاؤ۔"

وہ خود دونوں کو بستر پر سلانے آئیں۔ بلکہ خود بھی ان کے قریب ہی سو گئیں۔ رات میں انسہ بے چین ہوتی۔ خواب میں ہسپتال کے مناظر آتے۔ اس کی جنبش کے ساتھ خالہ فوراً' اس کا ہاتھ تھپکتیں۔

"سو جاؤ۔ سو جاؤ۔ فجر کے وقت اٹھاؤں گی۔"

ہر بار وہ اسے چمکارتیں اپنے جاگنے کا اشارہ دیتیں۔ تین دن ماں بیٹی ان کے ساتھ رہیں۔ رخسانہ کو اپنے گھر جانا تھا۔ ان کے جانے کے بعد سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

"دانش کو واپس جانا تھا۔ رامس کے پیر میں پلاستر تھا۔ وہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ مونا نے کہا۔

"دانش چلے جائیں گے۔ میں ابھی یہیں آپ کے پاس رہوں گی۔ آخر میں بھی اس گھر کی فرد ہوں۔ مجھے بھی اماں کا بہت صدمہ ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتی ہوں۔" مونا بڑی لگاوٹ سے کہہ رہی تھی۔

"یہ بھی بتا دو۔ رامس کے پلاستر اترنے تک رہنا ہے۔ وہاں اکیلی اسے کیسے سنبھالو گی۔ کیسا اماں کا صدمہ۔ اور کہاں کے ہم پہلے بھی سب چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔" رمشہ سے رہا نہ گیا۔

انسہ اشارے سے منع کر رہی تھی۔ "کیوں کہ اماں کے ٹیسٹوں کے بل دیتے میں تو بھائی کو مہنگا ہسپتال لگ رہا تھا۔ رات کو ہی رامس کو سب سے مہنگے کلینک لے کر گئے۔ اور اس بل سے زیادہ رامس کا بل دے آئے۔ تب انہیں کوئی سستا ہسپتال نظر نہ آیا۔ بیٹے کی تکلیف کے آگے لاکھوں کی رقم ہیچ ہے۔ ماں کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔"

نہ جانے رمشہ کو کیا ہو گیا تھا۔ مونا بھی شرمندہ تھی۔ "وہ اصل میں قریب تھا اس لیے وہاں چلے گئے تھے۔ رو رہا تھا بہت۔ گھبراہٹ میں تھے تو...!"

"گھبراہٹ تو ہونی چاہیے۔ اولاد بڑی نعمت ہے۔ اس کی تکلیف کا احساس ضروری ہے۔ ماں کا کیا ہے۔ اسے تو مرنا ہی جانا چاہیے۔ اتنی لائق اولاد کی موجودگی میں۔ اللہ نے بھائی کو اخراجات سے بچا لیا۔ چار دن اور زندہ رہتیں تو بھائی دیوالیہ ہو جاتے۔ چہ چہ۔ اچھا ہوا کہ رامس کے پلاستر کے لیے رقم تو بچا گئیں۔"

"اف رمشہ!" انسہ نے اس کو پکڑ کر بٹھایا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ انسہ اسے کمرے میں لے گئی۔

"رمشہ! پلیز۔ خود کو سنبھالو۔ دل دکھانے والی باتوں کا موقع نہیں ہے۔ وہ بھی ماں ہے۔ اس کا بچہ بھی کوئی غیر نہیں۔ ہمارا اپنا ہے۔"

"آپا! ناانصافی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔ اماں کیا بھائی کی کچھ نہیں تھیں۔ ان کے علاج کے لیے کتنا غصہ کر رہے تھے۔ اور بیٹے کو لے گئے اس کلینک میں جو شہر کا سب سے مہنگا کلینک ہے۔ اتنا فرق ہے۔"

"اچھا۔ اب چپ رہو۔ بہت ہے۔ اپنے کمرے میں بھائی بھی تھے۔ سن لیا ہوگا تو کتنا افسوس ہوا ہوگا انہیں۔"

"کس بات کا افسوس؟ انہیں تو ماں کی وفات کا ہی افسوس نہیں۔ اگر ہوتا تو جوں ہی فون سنا تھا بھاگ کر آتے، مگر نہیں جی، نیند خراب ہوتی، خالہ کیسے فوراً آگئی تھیں۔ وہ تو رات کو ہی آجاتیں اگر انہیں رات میں فون کیا ہوتا۔"

رمشہ کی صاف گوئی، وہ کمرے میں بھی اتنی زور سے بول رہی تھی کہ یقیناً لاؤنج میں بیٹھی موناؔ نے ضرور سن لیا ہوگا۔ اور اب۔۔۔ دانش تک ایک ایک لفظ پہنچے گا۔ نہ جانے کس طرح، رمشہ مصلحت سے ناواقف، نادان اور کھری، اس دور کی لڑکی۔

موناؔ کا موڈ کئی دن خراب رہا۔ دانش بھی جاتے ہوئے خاصا خفا تھا۔ خالہ بھی آگئی تھیں۔ شاید ان کی مروت میں کچھ بولا نہیں۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ جلد ایک نیا منصوبہ لے کر آگئیں۔ قدرے ہچکچاتے ہوئے۔

"رمشہ کی ساس میرے پاس آئی تھیں۔" انہوں نے دبی زبان سے کہا۔ "کہہ رہی تھیں۔ اب لڑکیاں کیسے رہیں گی بغیر کسی حفاظت کے تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ سادگی سے چار آدمیوں کو لا کر رخصتی کرالیں، موقع تو نہیں، مگر مجبوری میں سادگی سے لڑکیاں اپنے گھر کی ہو جائیں۔ ماں کی روح کو سکون ملے گا۔ بھائی بھی بے فکری سے۔۔۔ اب۔۔۔ اصل میں ہمدردی اور محبت میں یہ تجویز دی ہے انہوں نے۔ دانش نوکری چھوڑ کر تو آئے گا نہیں، پھر تم دونوں کیسے رہو گی، آج کا دور بہت خطرناک ہے۔"

انسہ حیرت سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ موقع تو نہیں، مگر پھر بھی کیا کہہ رہی ہیں خالہ۔ ابھی تو آنسو بھی خشک نہیں ہوئے۔ وہ بے اختیار سسکنے لگی۔

"دیکھو بیٹا! جو تم پر گزر رہی ہے، اس کی سنگینی سے کسی کو انکار نہیں، سب کے اپنے مسائل ہیں۔ موناؔ بھی اپنا گھر چھوڑ کر کب تک رہے گی۔ دانش روز آ نہیں سکتا۔ یہ احساس مجھے بھی ہے اور ساجدہ کو بھی، اسی لیے انہوں نے رخصتی کی تجویز دی ہے۔ وہ بہت ہمدرد اور مخلص خاتون ہیں، اچھا ہاں، حمیرا آپا نے کچھ بتایا، طارق کب آ رہا ہے؟"

انسہ نے محض سر ہلا کر انکار کا اشارہ دیا، کیا کہتی طارق نے فون پر محض افسوس کیا، ایک بار بھی نہیں کہا۔

"میں بہت جلد آ کر تمہارے سب دکھ سمیٹ لوں گا۔ انتظار کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں یا اسی قسم کے الفاظ۔" خالہ نے کچھ غور کیا، پھر گردن ہلائی۔

"ہوں۔ میں جاؤں گی آپا کی طرف، کتنی بھی دور سہی، ان کے لیے کہیں بھی جانا کیا مشکل ہے، تین تین گاڑیاں دروازے پر کھڑی ہیں۔ بہن کو بہن نہیں سمجھتی، تو بہو کی ماں کا رشتہ ہی سمجھ کر ہمدردی کو آجاتیں۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے یہ بے رخی یا بے نیازی کیا سمجھوں اسے؟"

رشتے دار تو اور بھی تھے، آتے بھی رہے، ایک خالہ امی نے ہی شروع کے دو دن آنے کے بعد۔۔۔ پھر شکر نہ دکھتی، اور خالہ قمر کمال سے دوستی بھی نبھا رہی تھیں، رشتے داری کا بھرم بھی، لڑکیوں پر شفقت بھی نچھاور کرتیں۔ ان کا بھلا کیا فائدہ ہے؟ انسہ نے خود سنبھالا ہوا تھا، وہ رمشہ کے آنسو پونچھتی۔ موناؔ کی بھی کرتی۔ رامس کو بہلاتی۔ خود اس کے دکھ بانٹنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ خود بخود سب کی بزرگ بن گئی تھی۔

دانش کی موجودگی میں رمشہ کے اسٹوڈنٹ آئے۔ موناؔ نے حیرت ظاہر کی۔ دانش نے حیرت ظاہر کی نہ ناگواری۔ بلکہ شاید اسے تو اطمینان ہوا تھا۔ موناؔ کے پوچھنے پر رمشہ نے اپنی تلخی کا اظہار بھی کیا۔

"جب بھائی بے درد اور بے حس ہو جائیں تو عزت سے زندگی گزارنے کے لیے۔ بہنوں کو خود کفیل ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ۔۔۔ شاید فاقوں کی نوبت آجاتی، شکر ہے اماں، ابا نے ہمیں اس قابل بنا دیا کہ بھائی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے، ان کا احسان نہیں لیتے۔"

موناؔ تو سوال کر کے شرمندہ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

شاید خالہ قمر نے ان کے گھر کو کچھ شرمندہ کیا تھا کہ خالہ امی آگئیں۔ شام کا وقت تھا۔ لائٹ بھی چلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ رمشہ موم بتی لینے چلی گئی۔ وہ انسہ کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ انسہ کو اس دن بخار تھا۔ لیٹی تھی، انہیں دیکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی کوئی مجبوری بیان کرنے لگیں۔ اپنے نہ آنے کی۔ انسہ کو زکام تھا، کان بھی بند ہو رہے تھے۔ کچھ سنا، کچھ نہیں، پھر انہوں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ پیار کرنے لگیں، انسہ کو بڑی تقویت ہوئی۔ خالہ، آخر خالہ ہوتی ہے، ماں جیسی، رمشہ ان کے لیے چائے لائی تو بولی۔

"آہا، خالہ امی، بہو بہت پیاری ہے۔ ادھر دیکھیں، ادھر بھی، تو بڑے ہیں راہوں میں۔ ارے بھابھی ہی سمجھ لیتے لگیں۔"

خالہ امی چائے پینے لگیں۔ پھر رمشہ سے کہا۔ "ڈرائیور کو بھی چائے بھیج دو۔"

رمشہ چلی گئی۔ چائے پی کر کب سے ، مگر خالہ امی چپ نہ تھیں۔ شاید طارق کا ذکر انسہ سے کرنے میں تامل ہی تھیں، انگلیاں مسل رہی تھیں۔

باہر سے رمشہ نے پکارا۔ "خالہ امی ڈرائیور چائے پی کر آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

"فوراً" اٹھ گئیں۔ انسہ بھی پلنگ سے اترنے لگی تو روک دیا۔ "رہنے دو، بخار ہے تمہیں، آرام کرو۔" پھر لفافہ پرس سے نکال کر انسہ کو دیا۔

"خط ہے۔ طارق نے بھیجا ہے۔"

وہ لفافہ تکیے کے نیچے رکھ کر ان کے پیچھے آئی۔ انہیں خدا حافظ کہنے کے بعد کمرے میں آئی۔ چونکہ موم بتی کی روشنی کافی نہ تھی۔ اسے خیال ہوا کہ خالہ کسی چیز سے ٹکرا نہ جائیں، کمرے میں آکر لیٹ گئی سر چکرا رہا تھا۔ آخر کار۔۔۔ طارق کو اس کا خیال آیا۔ شاید تصویریں بھی ہیں۔ کافی بھاری لفافہ ہے۔ امکان ہے کچھ رقم ہو۔

رمشہ اس کے لیے کھانا لے آئی۔ کمزور اتنی تھی کہ اس سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ رمشہ نے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ دوا دی، برتن لے کر چلی گئی۔

لائٹ آگئی تھی۔ اس نے لفافہ نکالا، بڑے شوق سے کھولا، نہ تصویر، نہ رقم، اور موٹے کاغذ پر جو تحریر تھی۔ پہلی لائن پڑھتے ہی اس کی جان پر بن گئی۔ نقاہت، بخار کی تھی۔ لیکن۔۔۔ تحریر میں آگ کے شعلے تھے جو اسے بھسم کرنے اس کی طرف لپک رہے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اتنے عرصے بعد خالہ امی اس کے لیے کون سا تحفہ لے کر آئی ہیں۔

طارق نے انگلینڈ میں اپنی پسند سے شادی کر لی تھی۔ وہاں کے قانون کے تحت دو بیویاں رکھنا جرم ہے۔ اس لیے انسہ کے مستقبل کی خاطر، تاکہ وہ بھی اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرلے۔ اسے طلاق دے رہا ہے۔

خط کے مضمون نے اسے پسینے میں نہلا دیا۔ بخار اتر گیا۔ کمزوری بڑھ گئی۔ رمشہ نے گھبرا کر خالہ قمر کو فون کیا، وہ آگئیں۔

آتے ہی انسہ کی خوب خبر لی۔ جس نے اپنا یہ حال کر لیا تھا کہ اب بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ کھڑا ہونا محال، موناؔ کو اس کی غذا کے لیے لیکچر دیا۔ پھر اپنی داستان سنائی۔ کئی دن کے بعد آئی تھیں۔

"ارے بھئی، وہ شمائلہ، میری نیچے والی کرائے دار بیمار، اس کا میاں بیمار، دونوں کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ان کے لیے پرہیزی کھانے، دوا کھلانی مصیبت، شمائلہ کے نخرے، گولی بھی حلق سے نہیں اترتی۔ ابکائی لے کر نکال دیتی، توبہ، اب وہ ٹھیک ہے، خیر چار دن پہلے حمیرا کی طرف گئی۔ خوب سنا کر آئی ہوں، آئی تھیں؟"

انسہ نے لفافہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ خالہ نے پڑھا۔ ان کے تاثرات اس قدر واضح اور گہرے تھے۔ صدمہ، تعجب، بے چارگی، تاسف، غصہ سر پر ہاتھ مار کر بس اتنا کہا۔

"یہ کیا ہو گیا؟" انسہ آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی۔ اس سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا نہیں گیا۔ پھر

انہوں نے اسے زور سے چمٹا لیا۔ کیا نہیں تھا ان کے اس التفات میں۔ ہمدردی، افسوس، محبت، قربت کی آنچ، ماستا کی گرمی۔

وہ اس رات گھر نہیں گئیں۔ ہمدردی، دلداری اور تعاون، انسہ کے نصیب میں ہر سمت گرم ہوا کے بگولے اڑ رہے تھے۔ خالہ اسے کن کن خطروں سے بچائیں گی۔ خالہ کے چہرے پر اداسی اور غم کی زردی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ صحیح معنوں میں اب انسہ کو اپنے اجڑنے کا ادراک ہوا۔ جب خالہ کے انکشاف کے بعد موٹا اس سے لپٹ کر روئی۔ اور رمشہ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"ہیں؟ وہ اس دن؟ خالہ امی یہ گل کھلانے آئی تھیں، ڈرائیور کو چائے بھیج دو۔" (منہ بگاڑ کر، نقل کی) زہر نہ دے دوں کمبخت کو، مرتا تا پھر دیکھتی خالہ کیسے جاتیں، پڑی رہتیں ہمارے گھر میں، اندھیرے میں۔"

انسہ کو ہنسی آ گئی۔ خالہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ بھی شرمندہ ہو گئی۔

"بعد از مرگ واویلا تو سنا ہے۔ رمشہ نے زندہ جانے دینے کا واویلا ایجاد کر لیا۔"

کچھ دیر خاموشی کے بعد انسہ نے کہا۔ "خالہ! آپ ہی تو کہتی ہیں۔ اللہ مددگار ہے کیا میری مدد نہیں کرے گا؟"

خالہ نے بڑے رشک سے اسے دیکھا۔ "آفرین ہے میری بچی! بے شک، اللہ ہی مددگار ہے۔ اللہ مہربان ہے، اللہ تمہیں ہمت دے۔ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسی لیے تم اس بڑے نقصان سے بچ گئیں۔ جو رخصتی کے بعد تمہیں ہوتا۔ اللہ نے ہی بچایا ہے بیٹا!"

خالہ کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ انسہ بھی رو دی، پھر افسردگی سے بولی۔

"خالہ! مجھے امید تھی خالہ امی میرا بہت خیال رکھیں گی۔ لیکن... اماں کے بعد... ان کی طرف سے کوئی ہمدردی کا اظہار بھی کم ہوا... میں حیران تھی اور حیرت تو مجھے اس وقت بھی بہت تھی، جب خالہ امی نے یہ بے جوڑ رشتہ خوشی خوشی جوڑا اور اس وقت بھی جب ابا نے اسے منظور کیا۔ آخر اس کا مقصد کیا تھا؟"

"بیٹا جی۔ سب اللہ کے حکم پر ہوتا ہے۔ اب اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی اس کی، اصل میں ہم تو رشتوں کو اہم سمجھتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اسے نہیں مانتے۔ حمیرا نے اپنی غرض کے لیے رشتہ جوڑا تھا۔ باقی گھر والوں کو اختلاف تھا۔ طارق کو لندن جا کر وہاں کی زندگی پسند آ گئی۔ چلو۔ جان چھوٹی، شادی کے بعد بھی یہ ہی ہوتا۔" خالہ کو تو جیسے اب اطمینان ہوا۔

"لیکن۔ خالہ! کہتے ہیں رشتے آسمانوں پر یعنی جوڑے آسمان پر بنتے ہیں تو پھر..."

"ٹوٹتے بھی آسمان پر ہیں ستاروں کی طرح۔"

خالہ اسے تسلی بھی دیتی رہیں۔ مگر ظاہر ہے افسوس انہیں بھی تھا۔ بھانجی کی بے قدری پر۔ حمیرا کی [illegible] پر۔ ان دونوں جب تم کے سامنے ابھی تم سے [illegible] نہیں ہوئے تھے۔ یہ زیادہ تھا، انسہ [illegible] چاہتی [illegible] [illegible] کی نظروں کا تاسف، رمشہ کے آنسو، بے کل کر دیتے جس کو بھی خبر ملی افسوس کے ساتھ حیران ہوتا۔ دانش بھی آ گیا اور خالہ نے اسے بھی رمشہ کی [illegible] پیغام پہنچایا۔ وہ پریشان ہو گیا، انسہ کے اس واقعے کے بعد۔

"دیکھو۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ بہتری ہوگی اس میں بھی۔ موقع نہیں ہے، مگر فرض ادا کرنا ہے، دھوم دھڑکے کی ضرورت نہ گنجائش، انسہ کا بھی ہو جاتا اگر یہ خبر... سوچ لو ان کا بیٹا آنے والا ہے اور چار، چھ لوگوں کو بلا کر تم یہ فرض ادا کر سکتے ہو۔ ساجدہ نے خود کئی بار اصرار کیا ہے۔"

دانش کا تو فائدہ ہی تھا۔ اخراجات میں کفایت، مگر انسہ کی وجہ سے ہچکچا رہا تھا۔ جب انسہ نے خود بھی کہا۔ اور رمشہ کے کپڑوں پر کام بننے کو دیا۔ موٹا کے ساتھ وہ کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ رامس بھی پلاستر اترنے کے بعد نارمل ہو گیا۔

[illegible] آیا، دانش اور انسہ سے بہت ہی شائستگی اور [illegible] انداز میں افسوس کیا، دونوں کو پسند آیا۔

☆ ☆ ☆

خالہ قمر اور رمشہ کی ساس نے ہی سب پروگرام طے کر لیا۔ چند لوگ ادھر سے آ گئے۔ ادھر سے بھی [illegible] عزیز اور پڑوسی، نکاح بھی ہو گیا۔ رخصتی بھی۔ [illegible] ایک مہینے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے ولیمہ بیس دن [illegible] کر دیا گیا۔ پھر چند دن بعد رمشہ نے کہا۔

"[illegible] کچھ سوچا ہے اب تم کہاں رہو گی؟" انسہ نا سمجھی سے دیکھنے لگی۔ "دبھئی بھائی اور موٹا تو [illegible] جا رہے ہیں۔ انہوں نے تمہیں ساتھ لے [illegible] کی پیش کش نہیں کی۔ حالانکہ اخلاقاً بھی [illegible] ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا اور ان کا فرض بھی [illegible]۔"

"[illegible] [illegible] گے تو تمہارا ساتھ لے جائیں گے کیا؟ میں [illegible] [illegible]"

"[illegible] [illegible] نہیں [illegible]"

[illegible] تب تک تم نہیں جاتیں دبئی، یہیں آ جایا کرنا [illegible] جانے کے بعد۔"

"[illegible] کر۔ میں اب سسرال میں ہوں۔ ساس کی [illegible] کر کے ان کا دل جیتنے کی پوری کوشش کروں [illegible] کے جانے کے بعد ہی تو موقع ملے گا۔"

[illegible] اور عادل سیر و تفریح کے لیے نتھیا گلی چلے [illegible] انسہ کا اسکول شروع ہو گیا۔ اور پھر اسے پتہ چلا [illegible] گھر فروخت کر کے پنڈی میں گھر لینا چاہتا ہے۔ [illegible] سانس رکنے لگا۔ یہ بھی اسے جب علم ہوا جب [illegible] لوگ گھر دیکھنے آئے، دانش نے اسے کچھ بتایا [illegible] صحیح معنوں میں تو اب اکیلی ہوئی تھی وہ۔ بھائی [illegible] حسی۔ خود غرضی اس پر اچھی طرح عیاں [illegible]

[illegible] کے سوا کس سے پوچھتی۔ میرا قصور کیا ہے؟ [illegible] ہو گئیں۔ دانش سے پوچھا۔ ٹال گیا۔ "مگر [illegible] ملی تو..."

"نتھیا گلی تو نہیں ہو دانش! اماں کے مرتے ہی۔"

"خالہ! نوکری بہت اچھی ہے۔ چھوڑ نہیں سکتا۔"

"جب یہاں رہنا نہیں تو فائدہ؟"

"اچھا! ابھی نہ سہی۔ چار سال بعد، جب پھر ٹرانسفر یہاں کا ہوا۔ تو پنڈی کا گھر بیچو گے۔ یہاں کرائے پر رہو گے؟ نوکریوں کا کیا بھروسا۔ آج یہ حکومت ختم ہوئی، دوسری آئی، وہ سب کو فارغ کر کے اپنی پسند کے لوگ رکھ لیں گے۔ ایسا ہی ہوتا ہے، تم جیسے لوگ، نہ گھر کے، نہ گھاٹ کے اور پھر اس گھر کی جو قیمت ملے گی اس میں دونوں بہنوں کا بھی حصہ ہو گا۔" خالہ نے شرعی حصے کی بابت دانش کو بتایا، اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"اب تک بھی تم نے انہیں کیا دیا، اپنا بوجھ خود اٹھاتی رہیں۔ اب انسہ پر اتنا ظلم نہ کرو بیٹا! پیسہ کام نہیں آتا انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔"

خالہ نے دانش کو اور بھی بہت کچھ سنایا، سمجھایا، بارے کچھ سمجھ میں آ گیا اور طے ہوا کہ گھر کرائے پر دے کر لوگ پنڈی جائیں، ایک کمرے میں ضروری سامان، فرنیچر وغیرہ رہ دیں اوپر کا حصہ بھی کرائے پر دے دیں۔

خالہ نے تو کہا تھا کہ انسہ کو ساتھ لے جاؤ۔ مگر انسہ نے اختلاف کیا۔ وہ بھائی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا اسکول بہت اچھا تھا۔ اور تنخواہ بھی قابل قدر، بھائی کا رویہ کب بدل جائے، یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اماں کی بیماری میں اندازہ ہو تو گیا تھا۔ آزمائے ہوئے کو اور کتنا آزمایا جائے۔

"انسہ میرے پاس رہے گی۔ میرے ساتھ..." یہ خالہ کا حکم تھا۔ انسہ نے سر جھکا لیا۔

وہ بھی بار بار آزمائی گئی تھیں، سو فیصد کامیاب، جس دن وہ اپنا گھر چھوڑ کر خالہ کے گھر آ رہی تھی۔ بہت رنجیدہ تھی۔ اماں کا بسا بسایا گھر، خالی ہو گیا تھا، کس بے دردی سے سامان بیچا نہیں گیا، بلکہ پھینکا گیا تھا۔

دانش کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ اوپر کا حصہ بھی کرائے پر دے دیا۔ ایک کمرے میں کچھ فرنیچر۔ اور

چند بکس جن میں کچھ برتن، کپڑے اور آرائشی اشیاء تھیں، رکھ کر لاک کر دیا، خالہ بھی افسردہ تھیں۔
حالات انسان پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ انسان تو بے بس ہے، مگر بہتری کے لیے کوشش اور امید سلامت رکھنی چاہیے۔
کوشش کیسے سلامت رکھ سکتے ہیں؟
مضبوط قوت ارادی، اور مسلسل جدوجہد۔
طارق کی بے وفائی اور خالہ امی کی بے رخی، انسہ کتنی لاچار اور تنہا ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا ہوا، کیسے ہوا اور کیوں؟

☆ ☆ ☆

خالہ کا گھر چھوٹا تھا مگر دل بڑا تھا، نیچے کے دو کمرے انہوں نے ایک چھوٹی فیملی کو کرائے پر دے رکھے تھے، پہلے تو وہ نوبیاہتا جوڑا تھا۔ مگر اب، ایک بچے کے اضافے نے مکمل فیملی بنا دی تھی۔ اوپر کا حصہ، پہلے بھی کرائے پر تھا۔ اور خالہ نے انصاف کے ساتھ وہ رخسانہ کے نام کر دیا تھا۔ کرایہ بھی رخسانہ کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ خالہ کا بیٹا امریکہ میں تھا۔ وہ رقم بھیجتا تھا۔ خالہ اسے جمع کر رہی تھیں۔ انہیں ضرورت نہ تھی۔ اپنی تنخواہ اور نیچے کے کرائے سے گزارا ٹھیک ٹھاک ہو جاتا تھا۔
پہلا دن کسی طور سامان رکھنے میں گزر گیا۔ رات، اجنبیت کا سناٹا روح میں اتر گیا تھا۔ نیند بھلا کیسے آتی، خالہ بھی تھکی ہوئی تھیں۔ سو گئیں، مگر تھکن کے باوجود انسہ سو نہ پائی، صبح خالہ نے بتایا۔
”میں نے خواب میں سمیرا کو دیکھا، بہت خوش تھی۔ میرے اسی کمرے میں بیٹھی تھی، لگتا ہے، تمہارا میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ اسے اچھا لگا“ کہتے ہی، ”اگلی دنیا سدھار جانے والے خواب میں اصلی کیفیت میں نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ پاک جگہ میں ہیں۔“
”خالہ! مجھے تو نیند آئی ہی نہیں۔“
”بیٹا! پہلا دن تھا، عادی ہو جاؤ گی، دل کو سنبھالو، تمہارے لیے اللہ نے کچھ بہتر فیصلہ کر رکھا ہے۔ اگر دانش کے ساتھ چلی جاتیں، مجھے بہت فکر رہتی، اور تمہاری ماں کی روح پر بھی بوجھ ہوتا، وہ دانش سے... خیر چھوڑو اب اسکول کی تیاری کریں۔“
ایک آسانی یہ بھی تھی کہ اس کا اسکول خالہ کے سینٹر کے راستے میں تھا۔ گھر سے بھی زیادہ فاصلہ نہ تھا، خالہ رکشہ میں جاتی تھیں۔ انسہ ان کے ساتھ جاتی۔ راستے میں اتر جاتی، واپسی میں بھی خالہ اسے اسکول سے لے لیتیں۔ وہ عادی ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور ہو بھی گئی۔
عادل اور رمشہ واپس آئے تو خالہ نے ان کی دعوت کی۔ رمشہ کے ساس، سسر، نند، دیور سب کو بلایا۔ رخسانہ صبح سے آ گئی تھی۔ مدد کے لیے، بہت اچھی دعوت ہوئی، چونکہ اگلے دن چھٹی تھی۔ رمشہ نے ساس سے اجازت لی۔ رات رکنے کی، رخسانہ بھی تھی، رات دیر تک باتوں کا سلسلہ رہا۔ رمشہ اپنے خوشگوار سفر کے واقعات سنا رہی تھی۔ وہ خوش تھی۔
”دیکھو بیٹا! ایک بات گرہ میں باندھ لو، کبھی بھی دولہن ہو کر ساس کے سامنے عادل کی برائی نہ کرنا، یوں لگ رہا ہے جیسے تم چھوٹے بدھو بھائی کا ذکر کر رہی ہو۔ یا کسی نوکر چاکر کا۔“
”جی؟ خالہ! پھر...“ رمشہ بھونچکی ہو کر خالہ کو دیکھنے لگی۔
”بھئی، اب پہلا زمانہ تو ہے نہیں جب یہ وہ ان سے کام چلایا جاتا تھا۔ مگر ابھی ہم اتنے ایڈوانس بھی نہیں ہوئے کہ دھڑلے سے نام لے لے کر پکاریں۔ کوئی چھوٹا سا نام رکھ لو یا پھر صاحب کہا کرو، کم سے کم ساس کے یا اور بزرگ لوگ جو ہیں، ان کے سامنے۔“
رمشہ کی ہنسی چھوٹ گئی، خالہ کی بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ حیران ہو گئیں۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔
”ارے بھئی، میں نے کون سا مذاق کر دیا ہے، جو تم ہنس رہی ہو۔“
”خالہ! میں عادل کو بتاؤں گی، تو یقیناً وہ بھی بہت ہنسیں گے۔“ وہ مسلسل ہنستی رہی۔

”ہاں، انہیں عزت سے بلاؤ، تو وہ ہنسیں گے [illegible] اب صاحب کہنے کا رواج بھی نہیں [illegible] ان کی طرح۔“
رخسانہ نے انگڑائی لے کر کہا۔ ”میں تو بھئی۔ اپنے میاں کو صاحب ہی کہتی ہوں، عمر میں بڑے بھی ہیں۔ نام لینا اچھا نہیں لگتا، اماں کی نصیحت بھی تھی۔“
دراصل خالہ کو نصیحتیں کرنے کا شوق بھی تھا۔ انسہ کو یاد آیا۔ کبھی کبھار اماں ان کو ناصح زمانی بیگم کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ خالہ نے دانش سے کہا تھا کہ گھر کے اوپر جو لوگ آئے ہیں۔ ان سے کرایہ لے کر انسہ کو دیا کرے۔ وہ اس کی مستحق ہے۔ رمشہ نے بھی اس تجویز کو سراہا اور انسہ سے کہا۔
”آپا! نوکری چھوڑ دو، کرائے سے کام چلاؤ۔“ مگر انسہ ایسا کوئی خطرہ مول لینے کے حق میں نہ تھی۔ دانش کا اعتبار بھی معقول تھا، [illegible] دانش نے دونوں سے کرایہ وصول کر لیا۔ انسہ کو کچھ نہیں دیا۔ پھر خالہ نے فون کرنے پر کہا کہ
”ابھی تو میں ہی مالک ہوں۔ جب حصہ دینے کا وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔“
وہ اب پنڈی میں تھا۔ آنکھ اوٹ، پہاڑ اوٹ، خالہ سے منہ در منہ بحث نہیں کر سکتا تھا۔ مگر دور بیٹھ کر تو کہہ سکتا تھا۔
”انسہ کو ضرورت بھی کیا ہے، اچھی بھلی تنخواہ ہے اس کی۔“
”تم ضرورت مند ہو؟ یہ تو اب بتایا تم نے، واقعی انسہ سے کہوں گی وہ زکوٰۃ تم کو ہی دے دیا کرے۔ اسکول کے چپراسی کو خواہ مخواہ دیتی ہے۔ وہ تو پھر بھی کماتا ہے اور دونوں وقت کی روٹی بھی اس کی تنخواہ سے پوری ہو جاتی ہے۔“ خالہ غصے میں آگ بگولہ تھیں۔ نہ جانے دانش نے کس طرح برداشت کیا ہو گا۔
”حق کہنے میں کبھی ہچکچانا یا ڈرنا نہیں چاہیے۔“ انہوں نے انسہ کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر کہا۔
”میرا سامنا ہوا تو بیٹوں کی بھی ڈرتی نہیں ہوں۔“
خالہ کو غصے کے ساتھ افسوس بھی تھا۔ انسہ کو محسوس ہوا، جیسے اماں کی روح خالہ میں سما گئی ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو انہیں اتنا ہی غصہ آتا۔

☆ ☆ ☆

رخسانہ بہت دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ مقصد انسہ کو خوش کرنا، غم و فکر سے توجہ ہٹانا ہوتا۔ ایک روز آئی رات کو رہ گئی، اس کے شوہر جب دورے پر جاتے اسے یہاں چھوڑ جاتے۔ رات کو نماز سے فارغ ہو کر لیٹی اماں سے کہا۔
”اماں! آپ نے انسہ کو ماموں جان کے عشق کا قصہ بھی سنایا کہ نہیں۔“
خالہ وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ بول پڑیں۔ ”ہوں، ہوں فضول باتیں، خبردار۔“
”واہ۔ یہ کیا بات ہوئی؟ ماموں جان کی داستان محبت سے انسہ کو کیوں بے خبر رکھا؟“
”کون۔ کون ماموں جان؟“ انسہ نے کبھی کسی ماموں کا ذکر نہیں سنا تھا۔
”بھئی، ہمارے ماموں جان۔ اماں کے بھائی جان، ان کو...“
”رخسانہ! چپ، آگے کچھ نہ کہنا، بیٹا پیٹھ پیچھے بات کرنا غیبت ہوتی ہے، گناہ ہے۔“
”جی ہم غیبت نہیں، داستان سنا رہے ہیں، جس کا تعلق انسہ کی اماں مرحومہ سے بھی ہے۔“
”کیا؟“ انسہ رخسانہ کی بات پر دنگ ہو گئی۔
”ہاں جی۔ ہمارے ماموں کو تمہاری اماں سے محبت ہو گئی۔ انہوں نے رشتہ بھیجا۔“
”ہوں ہوں۔ رخسانہ مرنے والوں پر تہمت لگانا سخت گناہ ہے۔“ خالہ جائے نماز پر تھیں۔ ورنہ اٹھ کر رخسانہ کا منہ بند کر دیتیں۔
”پتا ہے، مگر میں مرنے والی پر تہمت نہیں لگا رہی۔ استغفار، بلکہ زندہ ماموں کی بات بتا رہی ہوں۔“ ”اب انسہ کو دلچسپی ہوئی یہ کیا قصہ ہے۔“
”اور ہماری سمیرا خالہ! آہا! اتنی بہادر، صاف انکار

کردیا' اپنی اماں سے کہا کہ یہ بہت ہی بد مزاج ہیں۔ شادی خوش مزاج آدمی سے کرنی چاہیے اور ان کو تو تمہارے ابا مل گئے' بہت ہی نفیس مزاج اور زندہ دل۔"

انسہ کے سوالات اور رخسانہ کے جواب۔ خالہ پہلے تو خفا ہوئیں۔ پھر بتانے لگیں۔

"ہماری اماں ہمارے بچپن میں فوت ہوگئی تھیں۔ ابا نے دوسری شادی کرلی۔ دوسری اماں کا سلوک مجھ سے تو بہت اچھا رہا' مگر بھائی جان بڑے تھے۔ ان کو ابا کی شادی پر غصہ تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی بھڑکایا' نئی اماں سے ہروقت لڑتے جھگڑتے' وہ ابا سے شکایت کرتیں۔ ابا دھنا دھن ان کی پٹائی لگاتے۔ بس غصہ بڑھتا گیا۔ بد مزاجی عروج پر' بڑے ہوکر بھی عادت پختہ ہوگئی۔ ذرا سی مرضی کے خلاف بات ہوتی۔ ہاتھ آئی چیز زمین پر دے مارتے۔ برتن ٹوٹتے' پیتل' تانبے کے برتنوں میں گومڑے بن جاتے۔ اتفاق سے نئی اماں حمیرا' سمیرا کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ تو تمہاری نانی' میری خالہ سے ان کی دوستی بھی تھی۔ سمیرا اپنی اماں کے ساتھ ہمارے گھر اکثر آتی۔ وہ بھائی جان کے جلال اور تخریب کاری کو دیکھتی۔ اماں سے سنتی بھی۔ اس لیے انکار کردیا۔ بھائی جان نے مجھ سے کہا' سمیرا کو سمجھاؤں۔"

"اماں! ڈنڈی نہ ماریں' بتائیں' ماموں جان نے کس طرح انہیں ساری زندگی خوشیاں دینے اور اپنا غصہ ختم کرنے کا عہد کیا۔ شاعری بھی کرنے لگے۔"

"اس زمانے میں سارے مرد شاعری کرتے تھے۔ یہ کمال نہیں' مصروفیت تھی۔"

"خیر۔ ماموں جان تو پہلے سمیرا خالہ کی محبت میں شعر کہتے تھے۔ بعد میں ناکامیٔ عشق ان کی شاعری کا موضوع بن گیا۔"

"رخسانہ! کہاں سے یہ خبریں مل گئیں تم کو' توبہ' میں نے تو یہ تفصیل کبھی نہیں بتائی تھی۔ اور شاعری میں ہوتا بھی یہ ہی کچھ ہے۔" خالہ بوکھلائیں۔

"زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ اماں! سارا خاندان جانتا ہے۔" [illegible]

انسہ بھی حیران تھی۔ اس نے تو کبھی ایسی کوئی بات کسی سے سنی ہی نہیں تھی۔ خالہ آتی تھیں۔ اور اماں کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں۔ صلاح مشورے کرتی تھیں۔

"تو اب' وہ ماموں' کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں۔ اصل میں سمیرا کی شادی ہوگئی۔ بھائی جان دل برداشتہ' مجھ سے خفا کہ میں نے کوشش نہیں کی۔ پھر ابا نے ان کی شادی انجم سے کردی۔ میم بھابھی سے' بھائی کی بد مزاجی اور بڑھ گئی۔ میری شادی کے بعد ابا فوت ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی بھائی جان کا غصہ بھی کم ہوگیا۔ مگر بد مزاجی انجم کے لیے رہ گئی۔ کمال یہ ہوا کہ ابا کے بعد وہ نئی اماں کے ساتھ ہی رہے اور ان سے جھگڑے بھی ختم۔"

"تو اب کہاں ہیں۔" انسہ کا شوق بڑھتا جارہا تھا۔

"پتا نہیں' مجھ سے ناراضی قائم تھی' تعلق ہی ختم کردیا۔"

"اماں! سیاسی بیان نہ دیں۔ حقیقت بتائیں۔" رخسانہ چہکی۔ "یہ بتائیں کہ کس طرح تاریخ نے اپنے کو دہرایا۔ بھئی انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ میں بھی سمیرا خالہ کی بھانجی ہوں۔ صاف انکار کردیا۔ مجھے بھی ماموں جان سے ڈر لگتا تھا۔ ان کا مامی سے سلوک بہت ہتک آمیز تھا' میں سمجھتی تھی ان کے گھر کا یہی دستور ہوگا۔"

عجیب قسم کے انکشافات ہورہے تھے۔ دراصل خالہ جب گھر آتی تھیں انسہ گھر کے کاموں اور رمشہ پڑھنے میں مصروف ہوتی۔ ہاں رخسانہ کی شادی اوکاڑہ میں ہوئی تھی۔ اماں' ابا اس کی شادی میں اوکاڑہ گئے تھے۔ کیونکہ رخسانہ کی ساس اس کی پھوپھی تھیں۔ بیماری کی وجہ سے بارات لاہور نہ لاسکیں۔ خالہ لوگ خود اوکاڑہ چلے گئے۔ وہیں رخسانہ کی رخصتی ہوئی۔ اب کچھ عرصے سے رخسانہ کے شوہر کی ملازمت لاہور میں ہوگئی تو وہ لاہور میں رہائش پذیر ہوگئی۔ سسرال ابھی اوکاڑہ میں ہی تھی۔

"[illegible] سب [illegible] دل [illegible] کی صورت تم نے [illegible] رہتیں [illegible] سنا ہے [illegible] شادی کرلی' سننے میں آیا ہے کہ [illegible] بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں' بیگم بھی فوت ہوگئیں۔"

رخسانہ بہت افسردہ ہوگئی۔ خالہ نے سرد آہ بھری۔

"کہتے ہیں اولاد انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ شاید یہ درست ہے' رخسانہ کی پھوپھی نے رشتہ دیا۔ میری ان کی نند سے دوستی بھی تھی۔ اس لیے سمیرا کو تو ایک نیک نفیس شوہر مل گیا۔ رخسانہ بھی خوش ہے۔ میرا میکہ اجڑ گیا۔ جانے بھائی جان کہاں ہیں' میں تو انجم کی تعزیت بھی نہیں کرسکی۔" خالہ رو رہی تھیں۔

آج پہلی بار خالہ کو آنسوؤں سے روتا دیکھا۔ ورنہ وہ بہت مضبوط اعصاب کی خاتون تھیں۔

انسہ بھی افسردہ ہوگئی۔ دانش نے بھی شاید اسی طرح بہنوں سے چھوٹی انتقام کی ہے۔ مگر دونوں کے حالات میں بہت فرق ہے۔ کاش دانش نے گھر چھوڑ کر پنڈی جانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو شاید اماں اتنی جلدی ختم نہ ہوتیں' ان پر بہت اثر تھا' دکھ تھا' اور اتنا بے حس' کم از کم اماں کے بعد ہم ساتھ تو رہتے۔ یہ بدلائی یہ سب بھی' مستقبل اتنا تاریک نہ ہوتا۔ ہر سمت اندھیرا ہے' روشنی کی کرن تک نظر نہیں آتی۔

رخسانہ کے چلے جانے کے بعد اداسی نے گھیر لیا۔ خالہ تو عادی تھیں۔ انہیں محسوس نہیں ہوا۔ مگر انسہ بے بالکل اکیلی رہ گئی۔ خالہ اس کا بہت خیال رکھتیں تھیں۔ پھر رمشہ بھی دبئی چلی گئی وہاں سے اپنے اور اپنے "صاحب" کے قصے سناتی اور صاحب کہہ کر خوب ہنستی۔ انسہ ہر نماز کے بعد رمشہ کی خوشیوں کے لیے دعا کرتی اور شکر ادا کرتی کہ اللہ نے اسے محفوظ اور معقول گھرانہ عطا کیا۔

☼ ☼ ☼

رخسانہ کے گھر جانے اور رمشہ کے دبئی جانے کے بعد انسہ کو اصل معنوں میں تنہائی محسوس ہوئی۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے تھکن اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ہوتا اور یہ تھکن جسمانی نہیں' ذہنی تھی' کبھی کبھی وہ سوچتی' اب کیا کروں؟ اور کوئی جواب نہ سوجھتا۔ اسکول سے آکر خود کو گھر کے کام میں مصروف کرلیتی۔

اس نے خالہ کو کچن سے آزاد کردیا۔ پھر بھی جیسے زندگی میں کمی تھی' کہیں کوئی جذبہ' کوئی شوق نہ رہا' روکھی پھیکی زندگی' بے مقصد زندگی' پھر ایسا ہوا کہ خالہ کی کرائے دار شمائلہ نے اس سے دوستی کی ابتدا کی۔ وہ روز کوئی مسئلہ لے کر انسہ کے پاس آجاتی۔ شروع میں تکلفاً" پھر مروتاً" وہ شمائلہ کو وقت دیتی۔ اس کے بعد عادتاً" اس کے مسائل حل کرنے لگی۔ خاص کھانے کی ترکیب۔

"ہائے میرا میاں بڑا نخریلا ہے۔ روز ایک طرح کے کھانے کھا کر بے زار ہوگیا ہے' پلیز' مجھے چائنیز چاول بنانا سکھادیں۔"

اور کبھی۔

"پتا ہے' میرے میاں کو نئے فیشن کے کپڑے بہت پسند ہیں۔ میرا درزی وہی خاص گول گلے کی قمیص سی دیتا ہے۔ ذرا مجھے اپنی فلاں قمیص دینا' میں درزی کو دکھاؤں گی۔ اور ہاں' جو پرسوں قمیص آپ نے پہنی تھی۔ اس کے گلے کی کڑھائی مجھے سکھادیں اور اب تو کروشیے کا پھر فیشن ہوگیا ہے' وہ مجھے سکھادیں' آنٹی بتارہی تھیں کہ آپ کو سارے کام آتے ہیں۔"

وقت اب محدود ہوگیا تھا۔ شمائلہ نے اسے خوب مصروف کردیا۔ دونوں کی تنہائی رفع ہوگئی۔ وہ سوچنے کی زحمت سے بچ گئی۔ "اب کیا کروں۔" کا سوال باقی نہ رہا۔

اب تو "کل شمائلہ کے دوپٹے پر کنگورہ بنادوں گی۔ وہ بھلا کہاں اتنی جلدی سیکھ سکتی ہے۔ یا۔

"وہ کل سنگاپوری رائس کے لیے چیزیں لائی ہیں۔ شمائلہ کے میاں کی فرمائش ہے۔"

بھول ہی گئی کہ خالہ آخر کب تک اسے توانائی دیتی رہیں گی۔ خالہ اسے بتائے بغیر خالہ امی کے گھر جا پہنچیں' [illegible] کرتایا۔

"میں تو انہیں شرمندہ کرنے گئی تھی۔ خود شرمندہ ہو کر آگئی۔ میرے کسی سوال کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ ارے وہاں تو کوئی شرمندہ نہ تھا۔ بہو میں بھی بڑھ بڑھ کے بولیں کہ ان کی زندگی ہے۔ وہ اپنی پسند سے گزاریں گے۔ زبردستی کی شادیوں کا یہ ہی انجام ہوتا ہے۔ میں نے کہا خالہ کا بھی کچھ فرض ہوتا ہے کبھی بھانجی کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی تو بہو نے کہا۔

"امی جان تو گھر میں دو قدم چل کر ہانپنے لگتی ہیں۔ اتنی دور کیسے آسکتی ہیں۔ پھر میں نے حمیرا کے میاں کو لتاڑا۔ وہ گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ بے مروت لوگ، بے وفا، خوب ذلیل کر کے آئی ہوں۔ یاد کریں گے، نوکروں کے سامنے ہی خوب لتے لیے۔ میں نے کہا، جو ظلم تم نے معصوم پر کیا ہے، اس کا بدلہ اللہ تم کو دے گا۔ دنیا میں ہی سزا بھگتو گے۔ بے خطا بے قصور پر ناحق ظلم کبھی معاف نہیں کرتا اللہ۔"

خالہ غم و غصے سے بے حال تھیں، انسہ نے ان کا بازو پکڑا، سہلایا۔ "خالہ! کیوں گئیں آپ وہاں، وہ کیا سوچتے ہوں گے۔"

"جو مرضی سوچیں۔ میرا کام تھا آئینہ دکھانا، وہ دکھا آئی، آئینے میں ان کی شکلیں ڈائنوں جیسی ہو رہی تھیں۔ ایسے لوگوں کو ضرور شرمندہ کرنا چاہیے، تاکہ ان کا احساس جاگے، کسی اور پر ظلم زیادتی کرتے ہوئے کچھ غور کریں گے۔ انسان کے جذبات ہوتے ہیں زبان ہوتی ہے۔ اور یہ زبان کبھی ننگی زہریلی تلوار بن سکتی ہے۔ میں نے صرف انہیں احساس دلایا ہے کہ عزت کیا ہوتی ہے۔ کل وہ خود جان لیں گے۔ جب نوکر چاکر بھی انہیں غلط سمجھیں گے۔"

بمشکل انسہ اور شمائلہ نے انہیں چپ کرایا۔ ورنہ شاید رات تک بھڑاس نکالتی رہتیں۔ انسہ کو خوامخواہ شرم آرہی تھی۔ اس کی وجہ سے یہ معاملہ بڑھا۔ وہ لوگ کیا سمجھتے ہوں گے۔ اور خالہ قمر کو نہ جانے کس قدر برا بھلا کہہ رہے ہوں گے اور بے چاری خالہ امی۔

☼ ☼ ☼

انسہ کئی دن فکرمند رہی۔ چپ چپ، خالہ بھلا اس سے غافل رہتیں ...

"کیوں پریشان رہتی ہو۔ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں، سب سے بڑھ کر وہ مالکِ حقیقی ہے۔ جو دلوں کے اندر کے بھید جانتا ہے۔ اس سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھو۔"

"خالہ! وہ تو میں بھائی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ لگتا ہے ابھی تک میں اندھیرے میں تھی۔ اجالے میں اب آئی ہوں۔ رشتوں کے مصنوعی پن کو اب جانچا ہے میں نے، اس مصنوعی پن کی گہرائی جاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔" وہ اداس ہو گئی۔

"بیٹا! رشتے کبھی مصنوعی نہیں ہوتے، یہ ٹوٹتے نہیں ٹوٹ سکتے نہیں۔ ان سے زیادہ مضبوط زنجیر ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔ دریا سوکھ جاتے ہیں۔ رشتے اپنی جگہ قائم و دائم رہتے ہیں۔ ہاں ان کو برتنے والے کمزور، بزدل اور بے وفا ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی کو تنہائی کا احساس ہوگا، واپسی شروع، تنہائی بہت ظالم ہوتی ہے۔"

خالہ بڑے جذب کے عالم میں ایسی باتیں کرتی تھیں۔ رشتہ تو ان کو فلاسفر، ناصح اعظم اور ماہر نفسیات کرتی تھی۔ ان کے لہجے اور الفاظ میں یقین ہوتا تھا۔ عزم اور اعتماد۔

اس دن دونوں گھر آئیں۔ انسہ جلدی سے کچن میں گھس گئی۔ کھانا صبح تیار کر کے گئی تھی۔ اور ایک دن پہلے جو نئی ڈش بنائی تھی سب نکال کر گرم کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ خالہ وضو کر رہی تھیں۔ دروازے پر گھنٹی ہوئی۔

انسہ نے جھری سے جھانکا۔ بہت سنجیدہ معزز مدبر قسم کے صاحب تھے۔ تھوڑا دروازہ کھول کر اس نے ان کا نام پوچھا۔ وہ بھی اسے قدرے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ جیسے پہچان رہے ہوں، پھر مسکرائے، اور دروازہ کھول کر اس کے قریب سے گزر کر اندر آگئے۔ یہ تو وہ سمجھ گئی کہ خالہ کے جاننے والے ہیں۔ اب وہ صاحب آگے، انسہ ان کے پیچھے۔ ارے ارے کرتی ہوئی آئی، وہ بے تکلفانہ کمرے میں آگئے۔ اور وہاں تو عجیب

سین چل رہا تھا۔ جائے نماز پر کھڑی خالہ ان صاحب سے لپٹی ہوئی دھاڑوں دھاڑ رو رہی تھیں۔ تو یہ تھے انسہ کے ماموں جان۔ وہ کچن میں چلی گئی۔ کھانا گرم کرکے کمرے میں ایسی تو سین بدل چکا تھا۔

ماموں جان کرسی پر بیٹھے تھے۔ خالہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ایک اچھے میزبان کی طرح انسہ نے ان کو بھی دعوت دی۔ پھر نماز کے بعد خالہ آگئیں۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ ماموں کو بہت پسند آیا۔ خوش گوار ماحول، نہ کوئی شکوہ، نہ شکایت۔ معافی نہ تلافی، وہ برتن اٹھا کر کچن میں آگئی۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر برآمدے میں اسکول کی کاپیاں لے کر آگئی۔

رات کس جذبے کے زیر اثر خالہ نے وہ الفاظ ادا کیے تھے، تو ماموں اب تنہائی کے زہر سے نکل کر اپنوں کی تلاش میں آگئے تھے۔ دیر آید درست آید، کچھ دیر بعد خالہ آئیں سرگوشی میں بولیں۔

"لیجئے ہیں ہم چائے بنانے بیٹھی بولیں۔"

"ارے بھئی بناؤ، آپ بیٹھیں۔"

انسہ اٹھنے لگی۔ خالہ نے اسے روکا، خود کچن میں چلی گئیں۔ چائے پی کر ماموں جا رہے تھے۔ تو اس کے قریب سے گزرے، سر پر ہاتھ رکھا اور چلے گئے، خالہ کے چہرے پر روشنی پھوٹ رہی تھی۔ راستہ کھل گیا تھا۔ وہ اکثر آنے لگے۔ انسہ سے بہت شفقت سے پیش آتے۔

"میں نے اسے دروازے میں دیکھا۔ فوراً" پہچان لیا کہ یہ سمیرا کی بیٹی ہے۔"

انہوں نے ایک بار بتایا۔ خالہ نے انہیں بھی اس پر ہونے والے حادثے کا بتا دیا، افسوس کرنے لگے۔

"خالہ! آپ تو ان سے اس طرح مل رہی ہیں جیسے وہ کبھی کہیں گئے ہی نہیں تھے۔ آخر۔ ان کی واپسی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔"

"ضرور ہوگی، میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ میرا بھائی واپس آگیا۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔"

ان کا اطمینان قابلِ تعریف تھا۔ انسہ کا اضطراب بڑھ گیا۔

چھٹی کے دن وہ بہت سے کام کر لیتی۔ خالہ کے آرام کے لیے کپڑے دھونا، کچن صاف کرنا۔ کپڑوں پر استری کرنا، گھر کی تفصیلی صفائی اور کوئی نئی ڈش بنانے کا پروگرام، کچن میں وہ شمائلہ کو بھی بلا لیتی۔ اسے بھی نت نئی ڈشیں بنانے کا شوق تھا۔

خالہ غسل کر کے آئیں۔

"چلو انسہ! کہیں چلتے ہیں۔ بہت دن سے کہیں گئے بھی نہیں۔"

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا، مگر آج انسہ کو سستی آگئی۔

"بہت کام ہیں خالہ! آج۔ اگلے ہفتے چلیں گے۔ پہلے سے پروگرام بنا کر، یا پھر کل اسکول سے آکر۔"

خالہ چپ ہو گئیں، پھر سوچ کر بولیں۔ "اچھا تم اپنے کام کرو، میں چلی جاتی ہوں شمائلہ کو بلا لو۔"

ان کے جانے کے بعد اس نے صحن میں کھڑے ہو کر شمائلہ کو آواز دی۔ پھر دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔ شاید خالہ کچھ بھول گئی ہیں۔ فوراً" آگئیں۔ جلدی سے دروازہ کھولا۔ لیکن اپنی جگہ جم گئی۔ یہ تو۔ کوئی صاحب تھے، بہت اسمارٹ اور وجیہہ خوب صورت۔ اس کے چہرے کی سراسیمگی پر مسکرانے لگے۔

انسہ ہوش میں آئی۔ "جی۔ فرمائیے؟"

"میں۔ زکریا ہوں۔ اپنی پھوپھو قمر سلطانہ بیگم کو لینے آیا ہوں۔ انہوں نے آج ہمارے گھر آنے کا کہا تھا۔ میں نے سوچا میں خود جا کر لے آؤں۔"

نہایت شیریں لب و لہجہ اور شائستہ انداز۔ مہذب طرز تکلم، انسہ تو کسی اور دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

"خالہ گھر پر نہیں۔ کہیں گئی ہیں ابھی۔"

"ابھی؟ اچھا۔ مجھے تو وہ نظر نہیں آئیں، اچھا زحمت کے لیے سوری۔" وہیں سے مڑا، اور گلی میں غائب۔

"اچھا۔ تو خالہ آج ماموں کے گھر گئی ہیں۔ لیکن مجھ سے پوشیدہ اور یہ صاحب۔ غالباً" ماموں جان کے

صاحبزادے ہیں۔"

دل ہی دل میں شان دار شخصیت کی تعریف کرتی اندر آئی۔ آج نام معلوم ہوا، کبھی سننے کا اتفاق نہیں ہوا، خالہ نے بھی کبھی ذکر نہیں کیا۔

شمائلہ آگئی۔ اور کپڑوں کی دھلائی شروع ہوئی، چادریں، پردے، تولیے، اپنے اور خالہ کے ہفتہ بھر کے اتارے ہوئے سوٹ۔ پھر کچن میں مصروفیت۔ شمائلہ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔ آج ناریل کا حلوہ اور قیمے کی بریانی بنائی۔ شمائلہ بھی اپنے اور میاں کے لیے لے گئی۔ خالہ کے آنے تک وہ صبح پہننے والے کپڑوں کی استری کر چکی تھی۔

خالہ آئیں تو خاصی تھکی ہوئی تھیں۔ پہلے انہیں چائے دی۔ پھر وہ بھی آرام کرنے لیٹ گئی۔

"آج کہاں کی سیر کی؟" اس نے معلوم کرنا چاہا۔

"شبانہ کی طرف گئی تھی۔ موا راستہ ہے کہ شیطان کی آنت، توبہ تھکا دیا۔"

"خالہ! آپ ماموں جان کی طرف نہیں گئیں۔ ان کے شاید بیٹے تھے آپ کو لینے آئے تھے۔"

"ہائیں۔ ارے، لو بھول گئی اور چلی گئی شبانہ کی طرف۔ وہ ایک نئی کمیٹی ڈال رہی ہے، اسی کے مشورے۔۔۔ اے لو۔۔۔ میرا بچہ خود آیا۔ ہائے۔ توبہ فون کر لوں گی۔"

لو جی۔ یہ ایک نئی خبر۔ خالہ اور ماموں جان کے گھر جانا بھول جائیں اور نکل جائیں، شبانہ کی طرف۔

انسہ نے حیرت کا اظہار کیا تو لاپروائی سے۔

"ارے، ہو جاتی ہے بھول چوک۔" کہہ کر لیٹ گئیں۔

واقعی تھک گئی تھیں۔ انسہ ان کا سر دبانے لگی۔ اگر خالہ نہ ہوتیں۔ کون پرسان حال تھا۔ واقعی اللہ نے جیسے اسی کے لیے ان کو پیدا کیا تھا۔

"دنیا میں فرشتہ رحمت ہوتے ہیں۔ جو مظلوموں کی مدد کے لیے عرش سے اتارے جاتے ہیں اور میری خالہ، یقیناً "فرشتہ رحمت ہیں۔" اس نے محبت سے سوچا تھا۔

وہ ان کی باتیں ملانے لگی۔ "تھک گئی ہیں۔ بے چاری، بیٹا امریکہ میں ڈالر کما رہا ہے۔ بھیجتا ہے تو بینک میں رکھ دیتی ہیں، تاکہ وہ اگر کوئی کاروبار کرے، خود پیدل ماری ماری پھرتی ہیں۔ ٹیوشن ڈال کر نوکری کر کے۔ آدھا گھر کرائے پر دے کر گزارا کرتی ہیں۔ بیٹے سے شکوہ نہیں کہ تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ بڑھاپا بھی ہے۔ اگر انہیں کچھ ہو جائے۔ اف توبہ، نہیں نہیں، اللہ انہیں لمبی زندگی دے۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ ہائے۔ میں کیسی اکیلی ہو گئی۔" سسکی نکل گئی۔ خالہ کی سماعت بھی قابل رشک تھی، فوراً "مڑ گئیں۔

"ہائیں۔۔۔ انسہ، بیٹا کیا ہوا؟" وہ ضبط نہ کر سکی۔ ان سے لپٹ گئی۔

"خالہ! آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہے، میں کیسے اتاروں گی، آپ میری محسن ہیں۔ میں۔۔۔ میں تو اکیلی رہ گئی اور۔۔۔"

خالہ نے اسے پیار کیا۔ "ہائے۔۔۔ بیٹا، انسہ ایسا نہ کرو۔ اکیلی کیوں ہوتی، میں جو ہوں خالہ نہیں، میں تمہاری ماں ہوں اور۔۔۔ بیٹا میں نے تو میری تنہائی میں حصہ بٹایا ہے، میری خدمت کرتی ہو، دیکھو اس وقت بھی تم میرے زخم کا مرہم بن گئیں۔ اپنی تھکی ہوئی تھی، بغیر کہے تم نے میرے درد کو اپنی ہتھیلیوں سے کھینچ لیا۔ تمہارا بھی مجھ پر احسان ہے، تم میری بہت عزیز دوست کی بیٹی ہو۔ مجھے رخسانہ سے زیادہ پیاری۔ رخسانہ سے میرا ایک رشتہ ہے، تم سے کئی رشتے ہیں، بھانجی ہو، دوست کی بیٹی ہو، میرے دکھ کی ساجھی، انسان کو ہمیشہ دوسرے انسان کی ضرورت ہوتی ہے، یہ کسی کا کسی پر احسان نہیں ہوتا، سب سے بڑھ کر تم سے احساس کا، انسانیت کا رشتہ ہے۔"

خالہ کی محبت بھری باتیں۔ ان کی تسلی، دلاسوں میں بڑی تقویت طمانیت تھی۔ نئے سرے سے امید آس کی ڈوری پکڑ کر دنیا کے کام میں لگ جاتی۔ انہوں نے اس کے چند منٹوں کے پیر دبانے پر کئی بار کہا۔

"ہائے ہائے کیسی شفا ہے انسہ کے ہاتھوں میں۔ انسہ بیٹی کیا اچھا ہوتا اگر تم ڈاکٹری پڑھ لیتیں۔ ذرا سا ہاتھ لگا، باتیں، بیماری بھاگ جاتی ہے۔"

☆☆☆

انسہ رات کو خوش ہوئیں، خالہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ بہت خوش تھیں۔ فون بند کر کے بتایا۔

"ناظم کا فون تھا۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر آ رہا ہے مستقل۔ سب کام ختم کر کے، یہیں کوئی کام کرے گا، کہہ رہا تھا اماں، اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپ کی خدمت کر سکوں۔ سرمایہ جمع کر لیا ہے، اگر کوئی ہوٹل وغیرہ بنا دوں گا۔"

انسہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ بیوی، بچوں سمیت، مستقل، پھر یہاں کیسے رہیں گے سب۔ اور میں، خالہ کو اپنی خوشی میں خیال ہی نہ آیا کہ انسہ یک لخت چپ ہو گئی ہے۔ بلکہ کئی دن وہ فکر میں مبتلا رہی۔

خالہ کی بھی مصروفیات بڑھ گئیں۔ [illegible] انسہ سمجھ تو رہی تھی کہ انہیں بھی اس کی فکر ہو۔ فی الحال بیٹے کی رہائش کے لیے کسی کوشش میں تھیں اور انہوں نے شائستہ سے کہہ دیا تھا۔ شمائلہ کے پاس دو کمرے تھے۔ نام کے تین بچے اور بیوی، سامان۔ خالہ کی ہنسی اور مستقل ادھر ادھر کی آمد و رفت بھی خاصی پراسرار تھی۔ انسہ کو رونا آنے لگا اپنی کم نصیبی پر۔

"نہ جانے ناظم بھائی کس مزاج کے ہوں۔ بیوی کس قماش کی۔ اس کی موجودگی انہیں ناگوار ہوئی، تو کہاں جائے گی، اس سے پہلے کہ وہ لوگ آکر اسے گھر سے چلے جانے کا کہیں۔ اسے اپنا انتظام کر لینا چاہیے، گھر تو ہے، ایک کمرہ بھی ہے، سامان ایک طرف ٹھکانے سے لگا کر اپنی رہائش کا بندوبست کر سکتی ہوں۔ دانش سے مشورہ کرنا ہوگا۔"

وہ ایک دن اسکول سے گھر چلی گئی، چابی اس کے پاس تھی، کرائے دار خاتون کافی مہذب اور بے تکلف تھیں۔ کمرہ کھول کر دیکھا۔ نظروں میں جانچا، کیا چیز کہاں رکھی جائے۔ جو ایک پلنگ کے لیے جگہ بن جائے۔ پھر اطمینان ہو گیا۔ انسان چاہے تو سب ہو سکتا ہے ہمت مرداں مدد خدا۔

"اف۔ میں اس دن خالہ کی تنہائی پر دل گرفتہ تھی۔ بیٹے کو الزام دے رہی تھی کہ ماں کی پروا نہیں۔ اپنی چیز، دولت اور اب، جبکہ وہ آ رہے ہیں تو یہ فکر کہ مجھے نکال دیں گے۔" کچھ اطمینان ہوا، واپس آئی تو خالہ گھر میں نہ تھیں۔ انہیں علم نہ ہوا کہ انسہ گھر گئی تھی۔ ان کے سوالوں سے بچ گئی۔ خالہ آئیں تو گنگنا رہی تھیں۔ واہ۔

"انسہ! تمہارا جو بے کار سامان ہے، اسے دے دلا دو کسی کو، بس کام کی ضروری چیزیں رہنے دو۔"

انسہ کو دھچکا لگا۔ "کیا؟ میرا فالتو سامان کون سا، اچھا بیٹا آ رہا ہے تو میرا سامان کھٹکنے لگا۔ اسٹور میں ایک طرف رکھا ہے۔ شاید بیٹے کا سامان رکھنے کے لیے گنجائش نکالنی ہے۔ واہ خالہ! اب کیسی بیٹی اور کون سا رشتہ، سب بھول گئیں۔" وہ دل گرفتہ ہو گئی۔

"ارے میں اس سامان کا کہہ رہی ہوں، جو تمہارے گھر میں ہے، پرانا فرنیچر بک سکتا ہے۔" وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

"اب بات سمجھ میں آئی۔ خالہ منہ سے اپنے گھر جانے کا کہہ نہیں سکیں۔ مطلب یہ کہ بھئی تم اپنے گھر جاؤ۔ سامان کم کرو، وہیں رہو نہ۔۔۔ یہ وہ خالہ ہیں جن کی محبت مروت کی مثال دیتی تھی میں۔ سارے لوگ ان کی طبیعت مزاج کے مدح خواں۔ بیٹے کی آمد نے ساری محبت مروت ہوا میں اڑا دی۔ کیا دنیا ہے، پل پل بدلتا موسم۔" آج اسے اپنی ذات فالتو۔ فضول بے مقصد لگی۔ آخری سہارا بھی چھننے کو تھا۔ وہ رونے کے لیے کونہ تلاش کر رہی تھی۔

"تم کیوں پریشان ہو، کیا ہوا، کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

کہاں چلی جاؤں ان کی نظروں سے دور۔ "نہیں کوئی بات کیا ہوئی۔"

"اچھا سنو، اوپر والے گھر خالی کر کے جا رہے ہیں۔ تبادلہ ہو گیا ہے ان کا۔ شمائلہ سے میں نے کہہ دیا۔ وہ

اوپر چلی جائے۔ دیکھو اللہ کیسا مسبب الاسباب ہے۔ بغیر کچھ کہے انتظام ہوگیا۔ اب مجھے رائے کی ضرورت بھی نہیں۔ کل وہ اوپر جائیں گے۔ پھر صفائی کرالینا۔"

"واقعی اللہ مسبب الاسباب ہے۔ مگر ان کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہوں' میرا بھی اللہ ہی انتظام کرے گا۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

"خالہ۔ میں سوچ رہی ہوں' اپنے گھر چلی جاؤں' کمرہ تو...؟"

"کیا؟ غیروں کے درمیان؟ دماغ صحیح ہے۔ دانش کبھی نہیں مانے گا۔"

"مگر۔۔۔ ناظم بھائی' ان کو تنگی ہوگی۔ میرا جانا ہی بہتر ہے۔" (اور آپ تو مانیں گی نا۔)

"پاگل ہو۔ تم نے سوچا بھی کیسے۔ تمہاری وجہ سے کیا تنگی ہوگی' کہیں نہیں جاؤ گی تم' ہاں' جب اللہ تمہارے لیے بھی کوئی سبب پیدا کرے گا' میری کیا بساط کہ روکوں۔" عجیب الجھی ہوئی سی بات کررہی تھیں۔

"بھائی کی وجہ سے میں یوں دربدر ہوئی' ورنہ...!"

"نہ بیٹا! ایسا نہیں کہتے' تم دربدر نہیں ہو تمیں۔ اللہ نہ کرے' تم تو میرے گھر میں چاندنی بن کر آئی تھیں۔ اجالا کرنے' مجھے بڑی تقویت ہوئی۔ پہلے جو راتیں جاگ کر پریشانی میں گزرتی تھیں کہ جانے رات میں میرا دل بند ہوگیا تو' سانس رک گیا تو' پڑوسی کے نامحرم ہاتھوں سے اسپتال لے جائی جاؤں گی' نہ جانے کیا انجام ہوگا' تمہارے آنے کے بعد پوری نیند لی' آرام کیا' میری تنہائی کا مداوا بن گئیں۔"

خالہ آبدیدہ ہوگئیں۔ مگر انسہ کے دل نے کہا۔ یہ سب ظاہری باتیں ہیں۔ خالہ عادی ہیں۔ ہر کسی سے اسی قسم کی گفتگو کرنے کی۔ دل کو فتح کرلیتی ہیں۔ گرویدہ بنالیتی ہیں۔

"تم پریشان نہ ہو۔ ہم ہیں تمہاری فکر کرنے والے' خود کو کبھی اکیلا نہ سمجھنا۔ اللہ ساتھ ہوتا ہے۔ یہی تو میری طاقت تھی کہ سونے دن کالی راتیں گزار دیں۔

خوف آتا اندیشے ستاتے۔ کبھی رخسانہ آجاتی۔ کبھی شائلہ میاں کے کسی دوسرے شہر جانے پر۔ پھر تم آگئیں۔ تو مجھے اللہ پر یقین ہوگیا۔ سب کائنات سب کا وارث وہی ہے۔"

انسہ اب ان کی باتوں سے اکتانے لگی۔ وہ صحن میں مزدور کو درمیانی دیوار گراتے دیکھ رہی تھی۔ "کس طرح یہاں سے نجات ملے گی۔ میرے اللہ! میرا بھی کوئی سبب بنادے۔ اچھا صبح بھائی کو فون کروں گی۔ اپنے گھر کے اس کمرے میں رہنے کی۔" لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی دانش کو دیکھ کر حیران ہوگئی۔

سلام دعا کے بعد خالہ' دانش کو ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ نہ جانے کیا مشورے ہورہے تھے۔ وہ چائے بنانے میں لگی رہی۔ اب خالہ بھائی سے کہہ رہی ہوں گی۔

"بھئی اپنی بہن کو اپنے ساتھ لے جاؤ میں کب تک رکھوں گی اسے۔ میرے بچے آرہے ہیں۔ جگہ بھی کم ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ بہن کی ذمے داری اٹھاؤ۔"

"ہاں فرائض یاد دلانے میں خالہ کا ثانی کوئی نہیں۔ اف کس قدر دنیادار خاتون ہیں۔ پل میں ہرن جانے والی۔" یہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ جو کافی فراخ اور وسیع ہوگیا تھا۔ شائلہ کے لیے پارٹیشن لگا کر آدھا کیا تھا۔ اب پارٹیشن ہٹ گیا تھا۔ صحن کی دیوار ختم ہونے سے گھر خاصا روشن ہوچکا تھا۔ دانش نے بغور انسہ کو دیکھا۔

"خالہ! آپ انسہ سے تو پوچھ لیں۔" انسہ کا دل رکنے لگا۔

"میں ہرگز پنڈی نہیں جاؤں گی۔" سوچ کر کچھ ہمت سے آگے بڑھی۔

"وہ۔ ایسا ہے کہ...؟" دانش ہچکچا رہا تھا۔ ظاہر ہے اسے یہ تجویز کیوں پسند آئے گی۔

"انسہ! خالہ کے بھائی ہیں نا! تم مل چکی ہو ان سے ماموں سلطان' ان کا بیٹا زکریا سلطان تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ چاہتی تو خالہ بھی ہیں بلکہ خالہ نے ہی

سلسلہ شروع کیا تھا۔ زکریا نے تم کو دیکھا نہ تھا۔ پھر ماموں نے بھی اس رائے سے اتفاق کرلیا۔ مجھے بھی پسند آیا۔ بہت سلجھا ہوا۔ خوش مزاج اور خوبصورت ہے۔ میں نے اقرار تو کرلیا ہے اس سے بہتر رشتہ کہاں ملے گا۔ اپنے لوگ ہیں۔ اور ماموں کی یہ شدید خواہش ہے۔ انہیں تم بہت پسند ہو۔"

انسہ کے دل نے وہ شور مچایا کہ ہاتھ میں پکڑی پیالی سنبھالنا مشکل ہوگئی۔ کس قدر سختی سے وہ زکریا کے تصور سے جان بچارہی تھی۔ کتنا اپنا اپنا سا لگا تھا۔ اچھا اچھا' دل میں اترنے والی آواز اور انداز۔

"وہ تو خالہ کی پراسرار کارروائیاں...!"

"ناظم بھائی کے آتے ہی نکاح اور رخصتی طے کی ہے۔ اگر تمہیں اعتراض ہو تو بتاسکتی ہو۔ خالہ نے اس لیے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا کہ رخسانہ ماموں کے بارے میں کچھ فضول باتیں تمہیں بتاچکی ہے۔ اس بات کو بنیاد بنا کر تم شاید اختلاف کرو۔"

دانش تفصیل بتارہا تھا۔ اور خالہ سر نیچا کیے مسکرا رہی تھیں۔

انسہ... کسی دوسری دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ امیدوں کی دنیا۔ جو خالہ نے اس کے لیے سجائی۔ "اور میں۔ بدگمان ہوکر۔ اس حسین دنیا سے دور جارہی تھی۔ خالہ سے۔ اللہ کا وعدہ کتنا سچا ہے۔ وہ انسان کی برداشت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ تو میری تکلیفوں پریشانیوں کا خاتمہ ہونے کو ہے۔ خالہ کی بدولت' وہی تو اس کا سبب بنیں۔"

وہ ان کے پاس بیٹھ کر ان کے کندھے سے ماتھا ٹکا کر رونے لگی۔ خالہ مسکرانے لگیں' دانش اٹھ کر چلا گیا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اسے جواب مل گیا تھا۔

"اس دن زکریا آیا تھا۔ تمہیں دیکھنے اسے معلوم تھا میں گھر پر نہیں ہوں۔ بس اسی دن اس نے رضامندی ظاہر کی۔ اس کی شرط ہی یہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر جواب دے گا۔ میں جانتی تھی۔ تم کو اختلاف ہوگا اس لیے۔ بس وہ آیا خود ہی اور ایک نظر میں۔ اور میں نے اس سے کہا بھی تھا تم ایک نظر کے بعد انکار نہیں کروگے۔"

"اب بھی۔ پہلی نظر کی محبت ممکن ہے؟ اب... اس دور میں۔ ترقی یافتہ ایڈوانس دنیا میں۔" انسہ سوچ رہی تھی۔ "جیسے میں۔ پہلی نظر میں اسیر ہوگئی۔"

"خالہ!" اس نے سر اٹھایا۔ ان سے نظر ملائے بغیر کہا۔ "آج سے میں آپ کی مرید۔ آپ میری پیر ہیں۔ سچ مچ کی پیر۔"

خالہ نے قہقہہ لگایا۔ دیکھا۔ "اور میں نے زکریا سے کہا تھا۔ تم بھی اس کو پہلی نظر میں پسند آؤ گے۔ کیونکہ وہ شفاف آئینہ' دل کی مالک ہے۔ اور پہلی بار تم ہی اس کے آئینے میں اپنا عکس چھوڑو گے۔ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے انعام ہو۔ جلدی سے جھپٹ لو۔"

اب انسہ کو ناظم کا شدت سے انتظار ہے۔ ان دونوں کے آنے کے بعد ہی وہ اپنا انعام وصول کرے گی۔ پہلی نظر کا انعام۔

یہ زندگی' جہاں زندگی کے لاکھوں رنگ ہیں۔ دکھ سکھ' تفریں۔ خوشیاں یہ دنیا جہاں تغیر ہے۔ موسموں کا۔ انسانوں کا' بدلتے موسم کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے۔ نفع نقصان سے غافل مگر کوئی راہبر ہو' کوئی ناصح ہو۔ ہمدرد ہو۔ خیر خواہ ہو۔

زندگی آسان۔ دنیا خوش رنگ ہوسکتی ہے۔ مگر یقین بھی ہو...

عتیقہ محمد بیگ
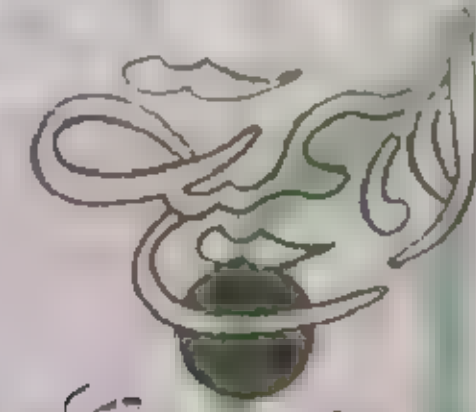
"اباجی مجھ سے پیار نہیں کرتے۔" سحر نے افسردہ ہو کر اپنی اماں جی سکینہ حیات سے کہا۔
سکینہ جو بھینسوں کو چارہ ڈال رہی تھی۔ یک دم اپنی بیٹی کی بات پر ہڑبڑا سی گئی۔۔۔ اور سحر کو گھور کر کہا۔
"پگلی تو نہیں۔۔۔ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔" سکینہ نے چارہ ڈالتے ہوئے کہا۔
اماں جی! اباجی کے دل میں صرف "منی" کے لیے پیار ہے۔" سحر نے تلخی سے کہا۔
"فضول کی باتیں نہ کر۔۔۔ اور چل پانی کی بالٹی بھر کر جلدی سے لادے۔" سکینہ نے بھینسوں کے لیے بھرے ہوئے پانی کے گندے ٹب کو گراتے ہوئے کہا تھا۔
سحر نے بچوں کی طرح اصرار کرتے اپنی اماں سکینہ سے پوچھا۔
"اماں جی! بتاؤ ناں۔۔۔ اباجی کے دل میں منی کے لیے کیوں پیار ہے؟"
سکینہ نے سر پکڑ لیا۔ منی کی رنگت کالی، آنکھیں موٹی موٹی اور قد و قامت دیو جیسی تھی۔ جب سے وہ رضا حیات کی زندگی میں آئی تھی۔۔۔ اس نے رضا حیات کے کاروبار میں اضافہ کر دیا۔ رضا حیات نے اس کی صحت کا خیال بچوں کی طرح رکھنا شروع کر دیا۔ اس لیے گھر کے افراد نے مل کر اسے اباجی کی منی کہنا شروع کر دیا۔
دو من کی بھینس کو منی کا نام ملا تو سحر جل اٹھی۔
"اباجی کی منی تو میں ہوں۔" سحر نے بہنوں میں سے چھوٹا ہونے کا شرف حاصل کرنے پر اپنا حق مانگا

۔۔۔ تو سحر کو بدلے میں اپنی اماں جی کی ہنسی ملی۔۔۔ مگر آج پھر اباجی نے گھر سے نکلنے سے پہلے منی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو سحر کی آنکھوں میں وہ منظر منجمد ہو گیا۔ بس پھر وہ سکینہ کے پیچھے ہی پڑ گئی۔
"اماں جی! اباجی منی کو اتنا پیار کیوں کرتے ہیں؟ جبکہ دوسری بھینسیں بھی ہیں۔"
سکینہ جو بھینسوں کو چارہ ڈال کر اب باورچی خانے میں کھڑی دودھ ابال رہی تھی۔ پیار سے کہنے لگی۔
"سحر! مجھے کام تو کر لینے دے۔۔۔ فرصت ملنے پر تمہارے سارے سوالات کا جواب دوں گی۔"
۔۔۔ دودھ میں ابال آنے کے بعد سکینہ دودھ سے بالائی اتار کر برتن میں رکھنے لگی جو وہ کافی دنوں سے جمع کر رہی تھی۔۔۔ کیونکہ رضا حیات نے اس سے کہا تھا کہ سردیوں میں دیسی گھی کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ سردیوں میں لوگوں کی بھوک میں اضافہ ہوتا تو رضا کی جیب کا وزن بھاری ہو جاتا۔۔۔ کیونکہ سردیوں میں دیسی گھی کے پراٹھوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر گھر سے آتی تھی۔
اس لیے جب وہ مارکیٹ میں دیسی گھی لے کر جاتا تو دکان دار ہاتھوں ہاتھ منہ مانگے دام دے کر لے لیتے۔۔۔ تو رضا حیات ہنسی خوشی گھر میں داخل ہوتے ہوئے اپنی بیوی سکینہ سے کہتا۔
"کھیر بنا لے میٹھا کھانے کو دل کر رہا ہے۔" تو سکینہ سمجھ جاتی کہ جیب کا وزن بھاری ہے۔ جس دن رضا حیات کھیر کا مطالبہ کرتا تو سکینہ اس سے پیسوں کا مطالبہ کرتی۔ رضا حیات ہنس کر کہتا۔

"میری جیب ہلکی کرنے پر خوش ہوتی ہے۔" سکینہ اسے گھور کر کہتی۔
"بچے آپ کے ہیں۔۔۔ باہر۔۔۔ بکواس تو نہیں کی ہوں۔۔۔ مدیحہ کو اسکول کے نئے بوٹ دلانے ہیں۔ اور اسماء کو شال لے کر دینی ہے اور باقی بچی سحر اس کی فرمائشیں تو ختم ہی نہیں ہوتیں۔"
تو رضا حیات خوشی خوشی بچیوں کے لیے پیسے دے دیتا۔ سحر کو اپنے اباجی سے پیسوں کی شکایت کبھی نہیں رہی تھی۔ بس اس کے دل میں اک حسرت تھی کہ رضا حیات اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیرے۔ اس کا خیال رکھے، اس سے باتیں کرے۔ اس کو باپ کی شفقت کا احساس دلائے۔ مگر رضا حیات کی شفقت منی کو ملتی تو سحر دل ہی دل میں جلتی رہ جاتی۔
اور آج وہ اماں جی سے منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔۔۔ کہ وہ اس کی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی۔
سکینہ دودھ کی بالائی اتار اتار کر برتن میں ڈال رہی تھی اور پھر سکینہ کی نظر سحر پر پڑی جو منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ سکینہ نے پیار بھرے لہجے سے سحر کو کہا۔
"وہم ہو گیا ہے پگلی تجھے بھلا اپنے بچوں سے بڑھ کر رضا حیات کے لیے کوئی ہے۔ وہ تم سب سے بہت پیار کرتے ہیں اور منی تو پالتو جانور ہے اور سحر! تیرا منی سے یوں حسد کرنا۔۔۔ ایک نہ ایک دن منی کو بیمار نہ کر دے۔" سکینہ نے فکرمندی سے کہا تھا۔
"اماں جی۔۔۔ اباجی کو تو ہر وقت منی کی فکر رہتی ہے۔ اس کا کھانا پینا، اس کی مالش، اس کو نہلانا۔۔۔ ان کا سارا وقت اس کو سنبھالنے اور نخرے اٹھانے میں گزر جاتا ہے۔" وہ بسوری۔
"منی دوسری بھینسوں سے زیادہ دودھ دیتی ہے۔ اس لیے تمہارے اباجی اس کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ بیمار نہ ہو جائے۔ کمزور نہ ہو جائے۔ زیادہ دودھ دینے سے آمدنی ہوتی ہے وہ تم تینوں بہنوں کی ضروریات پہ خرچ ہوتی ہے۔ بس اپنی بیٹیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ منی سے پیار کرتے ہیں۔"
سکینہ نے جلدی سے آنچ دھیمی کی کیونکہ دودھ میں ابال آنے پر تھوڑا دودھ گر گیا تھا۔
سحر جو اپنی اماں جی کی بات پر غور کر رہی تھی اس کی اگلی بات پر چونک کر متوجہ ہوئی جو فرش پر گرے ہوئے دودھ کو صاف کر رہی تھی۔
"دیکھ لے سحر! آنچ کا خیال نہ رکھنے پر دودھ زمین پر گر گیا نا۔ اور منی سے پیار اور اس کا خیال تمہارے اباجی بھی اس لیے کرتے ہیں کہ وہ بیمار نہ پڑ جائے اور اگر وہ بیمار پڑ گئی تو تمہاری بہنوں کا جہیز اور تمہارے لیے جہیز تیار کرنے میں رضا حیات کا کون سہارا بنے گا؟ بس آمدنی کا واحد سہارا منی ہے۔" سکینہ حیات کی آواز بھرا سی گئی تو سحر خاموشی سے باورچی خانے سے نکل کر صحن میں بندھی منی کے سر پر پیار کرنے لگی۔ سحر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔۔۔ اس نے منی کو دیکھ کر سوچا۔
"اباجی کا سہارا کون۔۔۔ بھینس یا میں؟۔۔۔ تو اباجی کی محبت کا حق دار کون۔۔۔ بھینس یا میں؟"
تو سحر کا دل چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔ "بھینس بھینس بھینس۔"

مریم عزیز

مکمل ناول

سمیر کی چوتھی پکار پر اس نے جلدی سے صابن سے بچے منہ پر پانی پھینکا اور باہر نکلی۔

"کیا ہوا؟" اس نے گھبرا کر سمیر سے پوچھا۔

"امی بلا رہی ہیں' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس کی گھبراہٹ کے جواب میں بڑی تسلی سے جواب آیا تھا۔

"سمیر کے بچے!" وہ دانت پیس کر اس کی طرف لپکی' لیکن وہ اس سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

"امی! اسے دیکھیں۔ ٹھیک سے منہ بھی نہیں دھونے دیا۔ ابھی بھی سارا صابن گردن پر لگا ہے۔" اس نے گردن پر ہاتھ پھیر کر ان کے سامنے کیا۔

"میں نے ہی سمیر کو تمہیں بلانے کو کہا تھا۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور تم جو واش روم میں گھستی ہو تو باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔"

"امی! میرا خیال ہے فرشتوں نے غلطی سے باجی کو انسانوں والی شکل دے دی' ورنہ انہیں تو کوئی مچھلی ٹائپ چیز ہونا چاہیے تھا۔"

"اور آپ بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' شکل دیکھی ہے اپنی جوہڑ کے مینڈک جیسی۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

"زینب! چپ کر کے کھانا کھاؤ۔"

ان دونوں کو چونچ لڑاتا دیکھ کر انہیں ٹوکنا پڑا۔ فون کی گھنٹی پر حمیرا اٹھنے لگیں' جب زینب نے انہیں روک دیا' وہ تیزی سے اٹھی تھی۔ پھر جس تیزی سے وہ گئی تھی اسی تیزی سے واپس آئی تھی۔

"زینب آرام سے کھاؤ' کس چیز کی جلدی ہے۔"

اسے تیزی سے منہ میں نوالے ڈالتا دیکھ کر انہیں ٹوکنا پڑا۔

"مجھے عمارہ کی طرف جانا ہے۔" اس نے پانی کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"عمارہ کا گھر یہیں ہے' کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ سارا دن کالج میں اکٹھا گزار کر آتی ہو' پھر بھی تم دونوں کو چین نہیں آتا۔" ان کی جھنجلاہٹ کا دوسری طرف کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ دوپٹہ لیتی ہوئی باہر کی طرف نکل رہی تھی۔

"جلدی آ جانا۔" نکلنے سے پہلے اس نے حمیرا کی آواز سنی تھی۔

دو گھر چھوڑ کر تیسرا گھر عمارہ کا تھا۔ بیل بجانے کا تکلف پہلے بھی نہیں کرتی تھی اور اس وقت تو گیٹ کھلا تھا۔ مطمئن انداز میں چلتی ہوئی سیدھی اندر آ گئی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو سارا لاؤنج سنسان پڑا تھا۔ اس نے حیرت سے اردگرد نظریں دوڑائیں۔

"عمارہ!" اس نے ایک کے بعد دوسری' پھر تیسری آواز دی' پانچویں صدا پر آواز اس کے حلق میں ہی رہ گئی۔ اس کے بالکل سامنے کھڑا شخص ناگوار تاثر لیے اسے گھور رہا تھا۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟" وہ منہ میں بڑبڑائی' جانتی تھی اب اسے تمیز پر ایک لمبا لیکچر ملنے والا ہے۔ اپنی بے زاری چھپانے کے لیے اس نے سر جھکا لیا۔

"انسان میں ذرا سی تو عقل ہونی چاہیے' اتنی زور سے چلاتے ہیں، تمہیں کیا لگتا ہے یہاں رہنے والے بہرے ہیں' اندر میرے دوست بیٹھے ہیں' کیا سوچ رہے ہوں گے۔"

"آپ کے دوست ہیں۔ ان کو سوچنا کیا خاک آتا ہو گا۔" وہ دل میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"کب عقل آئے گی تمہیں؟"

"کبھی نہیں۔" دل میں جواب دے کر بڑی مشکل سے اس نے اپنی ہنسی کو روکا تھا۔

"ہادی!" ڈرائنگ روم سے آئی پکار پر اس نے سر موڑ کر پیچھے دیکھا اور اسے ایک گھوری سے نوازنے کے بعد واپس مڑ گیا۔ جبکہ اتنی جلدی جان چھوٹ جانے پر گہرا سانس لے کر جھکا سر اٹھاتے ہوئے اس کی پشت کو دیکھ کر منہ چڑایا۔

"کہاں دفعان ہو گئی تھیں مجھے بلا کر اور جھوٹ کیوں بولا کہ اکیلی ہو؟" عمارہ کو دیکھا وہ برس پڑی۔

"جھوٹ کب بولا' اکیلی ہی تھی' ابھی تمہیں فون کر کے بیٹھی ہی تھی تو بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ آ گئے' لیکن تم بتاؤ بھائی نے کچھ کہا؟"

"کہنا کیا ہے' قسمت ہی خراب ہے' تمہیں بلانے کے لیے آواز دی تھی' تمہارے بجائے ہٹلر صاحب سامنے آ گئے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"چلو تمہارے لیے ایک مزے کی چیز رکھی ہے۔" وہ زینب کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچن میں لے آئی' فریزر سے دو پیالیاں نکال کر اس کے سامنے رکھیں۔ "بھائی اپنے دوستوں کے لیے لائے تھے' میں نے دو یہیں اڑا لیے' سوچا دونوں کھائیں گے۔"

آئس کریم دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ "بڑا زبردست سوچا ہے۔" وہ آئس کریم منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ویسے آنٹی کہاں ہیں؟"

"امی عالیہ آپی کی طرف گئی ہیں اور ابو آفس۔"

"عالیہ آپی کا پروگرام نہیں آنے کا؟" زینب کے پوچھنے پر عمارہ نے برا سا منہ بنایا۔

"آپی جتنی دیر سے آئیں اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک تو آپی کے آنے سے ویسے ہی کام بڑھ جاتا ہے' تمہیں پتا ہے نا' مجال ہے جو ذرا سا ہاتھ لگا کر کام کر لیں۔ اور دوسرا ان کے دو شیطان قسم کے بچے گھما کر رکھ دیتے ہیں۔" عمارہ کے کانوں کو ہاتھ لگانے پر زینب نے غصے سے اسے گھورا۔

"کتنی ظالم خالہ ہو۔ اتنے پیارے بچے ہیں۔"

"جی نہیں' بڑے شرارتی بچے ہیں۔ ویسے بھی ان کی فیورٹ خالہ تم ہو۔ اسی لیے تم جل رہی ہو۔ مجھے کیا جل کر اپنا رنگ خراب کرنا ہے۔ اگر رنگ خراب بھی ہو گیا تو کیا' ہیر اینڈ ہولی ہے نا!" زینب کے اسٹائل سے کہنے پر پہلے عمارہ پھر ساتھ وہ خود بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

باتوں کے دوران اس کی نظر سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی تو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"بس کر جانا بھائی گھر پر ہی ہیں۔" عمارہ نے پیچھے سے آواز دی تھی۔

☆ ☆ ☆

کالج سے آ کر وہ سوئی تھی' جب آنکھ کھلی تو مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ وہ تیزی سے بستر سے اٹھی' منہ ہاتھ دھو کر جب وہ باہر آئی تو حمیرا ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھیں۔ لیکن ان کا دھیان ٹی وی کی طرف نہیں تھا۔ اس کے بیٹھنے پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں تمہیں ہی اٹھانے والی تھی۔ عصر بھی تمہاری قضا ہو گئی' مغرب کی بھی اذان ہونے والی ہے۔"

"سمیر کدھر ہے؟" اس نے اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"ہادی کے پاس گیا ہے کہہ رہا تھا کچھ میتھس کے سوال حل کروانے ہیں۔"

"سمیر کا ٹیوٹر پھر نہیں آیا۔" زینب کے پوچھنے پر انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"فیس بڑھانے کی بات کر رہا تھا۔ مہنگائی نے تو

مشکل کر دیا ہے۔"

اور پھر وہی چیزوں کی قیمتوں میں اضافے کی باتیں۔ باتیں تو حمیرا تقریباً روز اس سے کرتی تھیں' لیکن آج وہ اسے معمول سے زیادہ پریشان لگی تھیں۔

"کوئی بات ہوئی ہے امی؟" وہ جو اسے بجلی کے بل کے بارے میں بتا رہی تھیں' اس کے سوال پر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"آج پانچ تاریخ ہے' لیکن تمہارے تایا کا دور دور تک کوئی پتا نہیں' پچھلے کئی سالوں سے انہوں نے خرچے کی جو رقم مقرر کی ہوئی ہے اس میں ایک ہزار کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ کل کو تمہاری شادی بھی کرنی ہے۔ کیسے ہو گا سب کچھ؟" وہ کہہ کر رونے لگیں تو زینب جو ہونٹ چباتے ہوئے انہیں سن رہی تھی' ایک دم اٹھ کر ان کے قریب آ گئی اور انہیں بازو کے حصار میں لے لیا۔

"امی! آپ پریشان ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولی تو انہوں نے اسی طرح روتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا زینب! اور کس سے ہم امید رکھیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا' سمیر ابھی بہت چھوٹا ہے' اس کا فیوچر کیا ہو گا' میں نہیں جانتی اور پتا نہیں اس کے کمانے تک میں زندہ بھی رہوں گی یا نہیں۔ باپ تمہارا ہے نہیں' اگر ہوتا بھی تو بھی کچھ خاص فرق نہ پڑتا' جتنی دیر وہ زندہ رہا' زندگی اجیرن ہی رکھی' آج جو ہم تکلیف میں ہیں' تمہارے باپ کی وجہ سے ہیں۔ ایک انتہائی غیر ذمہ دار انسان جس نے کبھی مجھے یا تم دونوں کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھا۔ اپنی عیاشیوں کے لیے اس نے اتنا قرض لے رکھا تھا کہ تمہارے دادا کی طرف سے جو جائیداد ملی تھی وہ بھی بک گئی' الٹا اور قرض بڑھ گیا۔ اس کو اتارنے کے چکر میں آج تک گھن چکر بنی ہوئی ہوں۔"

حمیرا جو کچھ اسے بتا رہی تھیں' وہ بچپن سے جانتی تھی' جب کبھی کوئی خاص بات ہوتی تھی تب حمیرا ماضی ان کے سامنے دہراتی تھیں' ضرور آج پھر کوئی بات ہوئی تھی۔

"کیا ہوا امی؟ کوئی بات ہوئی ہے؟" وہ پریشان کھوجتی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

انہوں نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر انہوں نے بات بدل دی۔ "ایسے ہی بس خرچے کی وجہ سے پریشان تھی' تم بتاؤ دال کے ساتھ چپاتیاں ڈال لوں یا چاول بنا لوں؟"

"چاول بنا لیں۔" وہ سر ہلاتی کچن کی طرف مڑ گئیں' جبکہ وہ کتنی دیر تک کچن کے دروازے کو دیکھتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ صوفے پر اوندھے منہ لیٹی زمین پر رکھے نوٹس کو رٹنے میں مصروف تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ٹی وی اسکرین پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ جبکہ اس کے بالکل قریب بیٹھا سمیر بھی کتاب آگے رکھے کچھ رٹنے میں مصروف تھا' تب ہی گیٹ کھلنے کے ساتھ شانی اور سدرہ کی آواز آئی تھی۔

"آ گئے یہ جوج ماجوج۔" سمیر نے برا سا منہ بنایا' جبکہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"زینب خالہ!" وہ دونوں شور مچاتے بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے تھے۔

"ان کا نام زینب ہے' یہ چیخ کر اعلان کرنا ضروری ہے۔" سمیر کے ڈانٹنے پر ان دونوں کے منہ اتر گئے تو اس نے سمیر کو گھورتے ہوئے ان دونوں کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

"زینب خالہ! آپ کو عمارہ خالہ بلا رہی تھیں۔" شانی کے پیغام پر اس نے دزدیدہ نظروں سے دائیں طرف دیکھا' جہاں حمیرا پالک کاٹنے میں مصروف تھیں۔

اس نے مدد طلب نظروں سے سمیر کو دیکھا' جس

نے اس کا مطلب سمجھ کر سر تقریباً کتاب میں گھسا لیا۔ اس نے بے بسی سے شانی اور سدرہ کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی اتنی چلچلاتی دوپہر میں عمارہ نے اسے کیوں یاد کیا ہوگا۔ کیونکہ عالیہ آپی کی سواری اپنے دو عدد بلونگڑوں کے ساتھ تشریف لا چکی تھیں اور عالیہ آپی کو تو وہ جیسے تیسے سنبھال لیتی تھی، لیکن ان کے شانی اور سدرہ کو سنبھالنا اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ عمارہ ان کی سگی خالہ تھی۔ لیکن وہ اس سے عمارہ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور وہ بھی ان سے بہت پیار کرتی تھی۔

"امی! میں ذرا عمارہ کی طرف جا رہی ہوں۔"

"تمہیں اتوار والے دن بھی چین نہیں۔ کتنے کام ہیں، کپڑے دھونے والے ہیں، صفائی باقی ہے۔"

"صفائی میں نے کر دی ہے امی! اور مشین میں شام میں لگاؤں گی، ابھی گرمی بھی بہت ہے۔"

"کرنی تو تم نے اپنی ہے، پھر پوچھتی کیوں ہو۔"

"تو میں پھر جاؤں؟" اس نے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا، ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، جس کا مطلب ان کی رضامندی تھی۔ وہ شانی اور سدرہ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئی اور اس کے پیچھے سمیر بھی۔

☼ ☼ ☼

اتنی سخت گرمی میں وہ پچھلے پندرہ منٹ سے مسلسل دیوار پر ٹنگی تھی۔ پسینہ تو بہہ ہی رہا تھا۔ چہرہ الگ دہک رہا تھا۔

"زینب خالہ! میرے لیے بھی۔" نیچے کھڑی سدرہ ٹھنکی تو اس کا دل چاہا جوتی اتار کر اسے دو لگائے۔

"کچھ میرے لیے بھی رہنے دو ذلیلو! کب سے تو جامن اتار رہی ہوں۔ ٹھونس ٹھونس کر پیٹ نہیں بھرا تم لوگوں کا۔ ذرا اس دیوار پر کھڑے ہو کر دیکھو تو پتا چلے ستیاناس ہو گیا ہے میرا۔" اس نے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا، جبکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے درخت کی شاخ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا سن بالک اگا کر چڑھنا۔" عمارہ کی آواز میں بھی ساف محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہیں تو میں اتر کر دیکھتی ہوں۔ سمیر! سیڑھی پکڑو۔" ابھی اس نے سیڑھی پر ایک قدم رکھا تھا، جب سدرہ نے منہ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے گھبرا کر ساتھ والوں کے گھر کی طرف دیکھا۔

"اس کا تو بھونپو بند کرواؤ۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"یار! تھوڑے اور اتار دو۔"

عمارہ کی التجا پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"نیچے سے آرڈر دینے سے بہتر ہے خود آ کر اتار لو۔ مجھے تمہاری طرح بندریا والے اسٹیپ نہیں آتے۔ احسان فراموش۔" اس کے چیخنے پر عمارہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر اپنے الفاظ واپس لیے تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔

"اب باہر کا دھیان رکھنا، یہ نہ ہو کوئی آ جائے۔" اس نے درخت پر چھڑی مارنے سے پہلے محتاط نظروں سے کلیم انکل کے بند دروازے کو دیکھا اور دوسری نظر دیوار کے بالکل پاس سوئے ان کے خوف ناک کتے کو دیکھا اور پھر ٹھوک کر چھڑی زور سے شاخ پر ماری، کچھ جامن ٹوکری میں اور کچھ نیچے گرے تھے۔

"خالہ! ہادی ماموں آ گئے۔" شانی جس کی ڈیوٹی گیٹ پر لگائی تھی، اتنی زور سے چلایا کہ بوکھلاہٹ میں اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹوکری نیچے سوئے کتے پر جا گری۔ وہ بھی ہڑبڑا گیا اور جو اس نے بھونکنا شروع کیا تو وہ رونے والی ہو گئی، اس سے پہلے کہ وہ اترتی ہادی اپنی بائیک سمیت اندر تھا۔

گھبراہٹ میں اس نے سیڑھی سے اترنے کے بجائے چھلانگ لگا دی۔ نتیجہ حسبِ معمول تھا۔ اس کے گھٹنوں اور کہنیوں پر بری طرح چوٹ لگی۔ لیکن وہ پھر بھی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ عمارہ نے افسوس سے اس کی چھلی ہوئی کہنیاں دیکھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگتی، ہادی ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ جن کے ہونٹ جامنی ہو رہے تھے۔ اس نے عمارہ پر ایک تفصیلی نظر ڈالی۔ تو وہ سٹپٹا کر سر جھکا گئی۔

زینب کب سے منتظر تھی کہ وہ اسے ڈانٹنے اور جائے، ہادی کی نظر سدرہ اور شانی سے ہوتی ہوئی اس پر رکی جو حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ تب ہی دیوار کے اس پار کتا پھر بھونکا تھا اور وہ اچھل پڑی۔ ساکت ماحول میں ہلچل ہوئی اور سدرہ کی زبان میں کھجلی۔

"ہادی ماموں! جامن کھائیں، زینب خالہ نے وہاں سے اتارے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ہادی جو اندازے لگا رہا تھا، اس کی سدرہ نے گواہی دے دی۔

"یہ کیا تماشا ہے۔" آخر کار اس کا منہ کھل ہی گیا۔ "کوئی طریقہ ہے۔ اتنی گرمی میں دوپہر کے وقت دیواروں پر چڑھ کر بندروں والے کرتب کیے جا رہے ہیں۔"

"ہادی بھائی! بندر نہیں بندریا والے!" سمیر کے کہنے پر زینب نے اسے گھورا۔

"دوپہر کو لوگ سو رہے ہوتے ہیں، اگر کلیم انکل یا ان کا کوئی بیٹا باہر نکل آتا تو؟ تمہیں خود کوئی احساس نہیں۔" وہ زور سے بولا تو اسے بھی بولنا پڑا۔

"آپ ہمیشہ مجھے ہی ڈانٹتے ہیں۔ یہ بھی تو میرے ساتھ تھے۔ انہیں تو آپ نے کچھ نہیں کہا۔"

"دیوار پر کون چڑھا تھا؟" وہ ماتھے پر تیوری ڈال کر اسے دیکھنے لگا۔

"انہوں نے مجھے جامن اتارنے کو کہا تھا۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"وہ بچے ہیں، تم تو بچی نہیں۔" اب کی بار اس نے منہ سختی سے بند کر کے سر جھکا لیا۔

"بھائی! وہ..." زینب پر مسلسل برستے دیکھ کر عمارہ کو درمیان میں کودنا پڑا۔

"تم چپ رہو، تم اسے منع نہیں کر سکتی تھیں۔ دیکھو اس کا حلیہ۔" ہادی نے اس کے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ "آئندہ اگر تم نے یوں بندروں والی حرکتیں کیں تو میں آنٹی سے تمہاری شکایت بعد میں کروں گا، پہلے خود تمہیں دیکھ لوں گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا تھا۔

"اور بھاگو تم لوگ۔" سدرہ اور شانی کو کہہ کر وہ اندر کی طرف مڑ گیا۔

"یہ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔" زینب نے قہر آلود نظروں سے جاتے ہوئے ہادی کی پشت کو گھور کر کہا۔ "میں کیا شوق سے چڑھی تھی دیوار پر۔ تم نے کہا تھا اور ڈانٹ بھی مجھے پڑی۔"

ایک تو اتنی گرمی اوپر سے درد دیتی چوٹیں اور مزید اتنی ڈانٹ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"چھوڑو یار!" عمارہ نے دل جوئی کے لیے اس کا ہاتھ تھاما جسے اس نے جھٹکے سے کھینچا تھا۔

"تم تو بات مت کرو مجھ سے۔" وہ دھپ دھپ کرتی وہاں سے نکل گئی، جبکہ وہ چاروں حیران و پریشان کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

☼ ☼ ☼

وہ صوفے پر نیم دراز ڈراما دیکھ رہی تھی جب سمیر بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا اس نے ناراضی سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"آج اتنی دیر لگا دی۔" حمیرا نے سمیر سے پوچھا جو آتے ہی پھر رجسٹر کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

"کل میتھس کا ٹیسٹ ہے۔ سر بھی نہیں آئے تو میں ہادی بھائی کے پاس چلا گیا تھا اور باجی! آپ نے مجھے اس دن جو سمری لکھ کر دی تھی میں نے ہادی بھائی کو چیک کروائی اتنی غلطیاں نکلی ہیں اس میں سے۔"

"ہاں تو مجھے نہ کہا کرو۔ اپنے جینئس ہادی بھائی سے پڑھ لیا کرو، ہادی بھائی کا چمچہ!"

اس کے منہ بنانے پر سمیر نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"باجی! آپ دوپہر سے اب تک اسی بات کو لیے بیٹھی ہیں؟"

"تمہیں اتنی چوٹیں لگیں تو پھپھو بجائے میری حمایت میں تم بولتے الٹا تم نے مجھے بندر بنا دیا۔" اس کا انداز اتنا جلا ہوا تھا کہ سمیر کے ساتھ حمیرا کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"میں نے تو صرف ہادی بھائی کی کریکشن کی تھی۔ وہ آپ کو بندر کہہ رہے تھے، جبکہ آپ تو مونث ہیں۔"

"بڑے آئے تم اردو دان اور تمہارے ہادی بھائی کی تو..." آخری لفظ وہ منہ میں ہی بدبدا کر رہ گئی۔

"اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو زینب؟ اس نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی تمہیں ڈانٹا تھا۔ تم جانتی ہو حکیم صاحب کے بیٹے کیسے ہیں، یوں ہی کوئی غلط سلط الزام لگا دیتے تو۔ ویسے بھی تمہیں خود احساس ہونا چاہیے۔ تم بی اے کی اسٹوڈنٹ ہو ایک لڑکی ہو کر یوں دیواروں پر چھلانگیں لگانا اچھا لگتا ہے۔"

بات کے اختتام پر انہوں نے غور سے اس کا جھکا ہوا سر دیکھا، لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکیں تو انہیں دوبارہ ٹوکنا پڑا۔

"عمارہ بھی تو تمہاری عمر کی ہے کتنی سلجھی ہوئی ہے۔" وہ جو سر جھکائے انہیں سن رہی تھی جل کر بولی۔

"بہن کس کی ہے۔" اس کے انداز پر حمیرا ہنس پڑی تھیں۔

"تم... خوامخواہ ناراض ہو رہی ہو، ہادی نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اس کی جگہ تمہارا بھائی ہوتا تو وہ بھی ایسا کرتا۔"

"شاباش امی! بجائے میری چوٹوں پر افسوس کرنے کے آپ دونوں ہادی بھائی کے وکیل بن کر بیٹھ گئے ہیں۔" اس سے پہلے کہ حمیرا مزید کچھ کہتیں۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"خالہ! خالہ..." اگلے ہی پل سدرہ اور شانی بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں کافی سارے غبارے تھے۔

"یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔" شانی نے چاکلیٹ اس کے آگے کی تو اس نے جتاتی نظروں سے سمیر کو دیکھا۔

"دیکھو... اسے پیار کہتے ہیں، اتنا سا بچہ اپنے پیسوں سے میرے لیے چاکلیٹ لایا ہے اور تم اپنی سگی بہن کو چھوڑ کر دوسرے کے گن گا رہے ہو۔"

"خالہ ہادی ماموں نے ہمیں یہ چاکلیٹ اور بلون لے کر دیے ہیں، میں ان میں سے ایک آپ کے لیے لایا ہوں۔"

اور چاکلیٹ کھانے کے لیے کھلا اس کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ سمیر کا قہقہہ بے ساختہ تھا، اس نے چاکلیٹ ٹیبل پر پٹخی اور اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

عمارہ نے کچھ حیرت سے انہیں اکیلا آتے دیکھا۔

"زینب خالہ کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں آئیں۔" شانی کے کہنے پر اس نے ناسمجھی سے دونوں کو دیکھا۔

"خالہ! وہ زینب خالہ کو غصہ تھا۔ وہ کمرے میں چلی گئیں اور سمیر بھائی کہہ رہے تھے، وہ ہادی ماموں سے ناراض ہیں۔"

"پتا نہیں بھائی کو زینب سے مسئلہ کیا ہے۔" اپنی بے حد پیاری دوست کی ناراضی کا خیال ہی اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ "وہ جب بھی آتی ہے بھائی وجہ بے وجہ اسے ڈانٹ دیتے ہیں، میری ایک ہی دوست ہے، اس سے بھی بھائی دوستی ختم کروائیں گے۔" عمارہ روہانسے انداز میں بولی۔

ڈور بیل کی آواز پر جہاں باتوں کا سلسلہ رکا۔ وہیں شانی بھاگتا ہوا باہر گیا تھا، واپسی پر اس کے ساتھ ہادی تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے باآواز بلند سلام کیا تھا۔

"ارے یہ کیا ہوا؟" صوفے پر بیٹھتے ہی اس کی نظر ان کے منہ پر بارہ بج رہے تھے۔

"ماموں! عمارہ خالہ کو غصہ آ رہا ہے کیونکہ زینب خالہ ناراض ہو گئی ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا جان چھوٹی۔" ہادی نے بڑے مطمئن انداز میں کہہ کر سدرہ کو گود میں اٹھا لیا۔ جبکہ عمارہ نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"ہادی! تم کیوں اس بے چاری بچی کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔"

"وہ کہاں کی بے چاری ہے، شیطان بھی اس کے سامنے آنے سے پہلے ایک بار ضرور سوچتا ہوگا۔" زینب کو بے چاری کہے جانے پر وہ اچھا خاصا بدمزہ ہوا تھا۔

"آپ اپنے تو نہ کہو ہادی! وہ بہت اچھی بچی ہے، دل کی بہت اچھی ہے، رونق لگ جاتی ہے، بس تھوڑی سی شرارتی ہے۔"

"امی کو بھی وہ عمارہ کی طرح عزیز تھی۔ اس لیے ماں بول پڑی۔ "تھوڑی شرارتی نہیں کافی بدتمیز ہے۔"

"ہادی!" ثمینہ نے اونچی آواز میں اسے جھڑکا۔ "وہ عمارہ کی دوست ہے اور شرارتی ہونا کوئی عیب نہیں۔"

ہادی نے باری باری سب کی شکل دیکھی اور سب کے چہروں پر اس کے لیے ناراضی تھی اور ہمیشہ زینب سے ٹاکرا ہونے کے بعد اسے ایسی ہی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا یوں زینب کے لیے اس کی چڑ میں پہلے کی نسبت اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنے کندھے یوں جھٹکے جیسے کہہ رہا ہو میری طرف سے وہ بھاڑ میں جائے۔

"اب یہاں زینب نامہ ہی چلتا رہے گا یا مجھے کوئی چائے کا بھی پوچھے گا۔" وہ عمارہ پر ایک غصیلی نظر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

وہ کپڑے استری کر رہی تھی، جب سمیر اندر داخل ہوا۔

"باجی! امی بلا رہی ہیں، تایا ابو آئے ہیں۔" وہ جس تیزی سے اندر آیا تھا اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے ایک نظر کپڑوں پر ڈالی جنہیں اس نے استری کرنا تھا، پھر سوئچ آف کر کے باہر آ گئی۔ وہاں تایا جی، حمیرا کے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔ وہ زور سے سلام کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ان سب نے ایک ساتھ اسے دیکھا تھا، وہ نجم صاحب کے ساتھ بیٹھ گئی، جبکہ نظریں سامنے بیٹھے شخص پر تھیں اس کی نظروں کے تعاقب میں نجم صاحب نے بھی دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔

"پہچانا، کون ہے؟" اس نے اب غور سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا، بڑی بڑی آنکھیں جو قدرے سرخ تھیں، بڑی بڑی مونچھیں کثرت سگریٹ نوشی سے سیاہ پڑتے ہونٹ بھرا ہوا چہرہ شکل کچھ جانی پہچانی تھی، اسے یوں گھورتا پا کر سامنے بیٹھا شخص مسکرا دیا تو اس نے نظریں گھما لیں۔

"نہیں پہچانا؟" تایا جی نے دوبارہ پوچھا تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"یہ ناظم ہے تمہارا کزن۔"

"اوہ!" اس کی اوہ بے ساختہ تھی۔ "سوری بھائی! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ دراصل کافی سال پہلے آپ کو دیکھا تھا۔"

"ہاں تب تو یہ گڑیا بہت چھوٹی تھی اور بہت شرارتی بھی۔" نجم صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ہاں، لیکن اب تو بڑی ہو گئی ہے اور خوب صورت بھی۔" ناظم اس پر نظریں جمائے بولا۔ اپنی تعریف پر وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ جبکہ ان کی باتیں سنتی حمیرا نے کچھ چونک کر ناظم کو دیکھا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟" ناظم اب بھی اس سے مخاطب تھا۔

"میں فورتھ ایئر میں ہوں۔"

"آگے کیا کرو گی؟"

"میں ایم اے میں ایڈمیشن لوں گی۔"

"اتنا پڑھ کر کیا کروگی۔ کرنا تو وہی ہانڈی روٹی ہے نا!" ناظم کے کہنے پر اس نے بے بھر کے لیے اس کی شکل دیکھی۔ جانتی تھی اس کے تایا کے بچوں کو پڑھنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے تعلیم کی افادیت پر انہیں لیکچر دینا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ سو انہیں جواب دیے بغیر وہ تایا کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ابھی اس نے تائی کا حال احوال ہی پوچھا تھا' جب حمیرا بولیں۔

"زینب! جاؤ تایا جی اور بھائی کے لیے چائے بنا لاؤ۔"

"ایک منٹ امی!" اس کا مزید باتیں کرنے کا موڈ دیکھ کر انہیں غصہ آگیا۔

"زینب! سنا نہیں تم نے۔" زینب نے کچھ حیرت سے ماں کا بگڑا موڈ دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر کچن میں آگئی۔

چائے کا پانی رکھ کر اس نے کباب فرائی کیے۔ چائے سرو کرکے وہ بیٹھنے لگی تھی کہ حمیرا پھر بولیں۔

"زینب! کپڑے استری کرلو ابھی بجلی چلی جائے گی۔"

زینب نے کچھ حیرت سے ماں کو دیکھا' اس سے پہلے وہ کچھ کہتی ناظم بول پڑا۔

"لگتا ہے سارا کام زینب کرتی ہے۔ اتنی ننھی سی تو جان ہے' اتنا کام نہ کروایا کریں۔"

"تو اور کیا ناظم بھائی! میں کیا بھلا کام کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔" شہہ ملتے ہی وہ بھی اٹھلا کر بولی تو ناظم کھل کر مسکرایا۔

"تو زینب رانی! تم ہمارے ساتھ چلو' شہزادیوں کی طرح تمہیں رکھوں گا' پانی بھی پینا ہوگا تو نوکر حاضر ہوگا۔"

وہ تو شاید جانے کے لیے ہاں ہی کردیتی کہ حمیرا نے پھر اسے ٹوک دیا۔

"زینب!" ان کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

کپڑے استری کرتے ہوئے وہ حمیرا کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"باجی! تایا جی آپ کو بلا رہے ہیں۔" سمیر کے پیغام پر وہ باہر نکل آئی۔ وہ دونوں جانے کے لیے تیار تھے۔ تایا جی نے پہلی بار اسے ہزار کا نوٹ تھمایا تھا۔

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا' اسے نوٹ پر نہیں بلکہ ان کے رویے پر حیرت ہوتی تھی' کیونکہ پہلے وہ جب بھی آتے کھڑے کھڑے آتے' اس کی ماں کو پیسے تھماتے اور بس۔ جبکہ آج وہ بیٹھے بھی تھے' ان سے باتیں بھی کیں اور سب سے بڑی بات ناظم بھائی۔ وہ پہلی بار ان کے گھر آئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ناظم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا' جسے اس نے مسکرا کر تھام لیا۔

"اچھا تو زینب رانی پھر جلد ہی ملاقات ہوگی۔" ناظم کے ہاتھ کا دباؤ اس کے ہاتھ پر بڑھا تھا۔

حمیرا رات کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں چلی گئیں' جبکہ وہ اور سمیر لاؤنج میں بیٹھ کر جانے والے مہمانوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ وہ سونے کے لیے جب کمرے میں آئی تو سمیر سو چکا تھا۔ حمیرا ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ وہ ان کے پہلو میں آکر لیٹ گئی۔

"امی! آج تایا جی کتنے چینج لگ رہے تھے اور اچھے بھی اور ناظم بھائی' وہ بھی کتنے اچھے ہیں' میں نے پہلی بار ان کو ان کی شادی پر دیکھا تھا۔ تب کتنے پتلے تھے' اب تو کافی خوف ناک ہوگئے ہیں۔" وہ کہہ کر خود ہی ہنس پڑی۔ جبکہ حمیرا بالکل خاموش تھیں۔

"اور ان کی وائف' وہ کتنی پیاری تھیں۔ ان کو بھی دیکھے کتنا عرصہ ہوگیا ہے۔"

وہ شاید ماضی کے ان لمحوں کو سوچنے لگی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ کروٹ بدل کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"امی! میرا بہت دل کرتا ہے' ہمارے بہت سے رشتہ دار ہوں۔ لیکن آپ بھی اکلوتی تھیں۔ بچپن میں تھوڑا سا یاد ہے' نانو تھیں۔ نانا کو بھی نہیں دیکھا۔

ماموں' خالہ بھی نہیں' پاپا بھی بہت تھوڑے یاد ہیں' صرف ایک تایا ہیں' ان سے بھی بس ایسے تعلقات ہیں' ہم کبھی ان کے گھر نہیں گئے' وہ بھی بہت کم آتے ہیں' آج پہلی بار میں ناظم بھائی سے ملی ہوں اور جو تایا جی کی تین بیٹیاں ہیں مجھے تو پتا ہی نہیں وہ کیسی ہیں۔" اس کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"امی! ناظم بھائی کتنے خلوص سے ہمیں دعوت دے کر گئے ہیں' ہم چلیں ان کے گھر؟" وہ بڑی آس سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"سو جاؤ زینب!" اس کے سوال کے جواب میں انہوں نے اسے مشورہ دے کر آنکھیں بند کرلیں۔

"امی! آپ کے" اس نے حیرت سے انہیں پکارا۔

"آپ ایسے بی ہیو کیوں کررہی ہیں' آپ ہی کہتی تھیں کہ تایا جی کو ہمارا خیال نہیں۔ کوئی ہماری خبرگیری نہیں کرتا' اب جب وہ اتنی اچھی طرح ملے ہیں تو آپ!" وہ الجھ کر انہیں دیکھ رہی تھی' ان کی مسلسل خاموشی پر چپ رہ گئی۔ "امی!" اس کا دوبارہ بات کرنے کا موڈ دیکھ کر حمیرا نے آنکھیں کھول دیں' وہ ان کی آنکھوں میں واضح طور پر غصہ دیکھ سکتی تھی۔

"زینب! لوگ ہمیشہ وہ نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں' کبھی فطرت بھی بدلتی ہے' تمہارے وہ تایا جنہوں نے سالوں ہماری خبر نہیں لی جو کبھی آئے بھی تو پل دو پل کے لیے' کبھی جو تمہارے یا سمیر کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا ہو تو پھر آج یہ سب کیوں؟"

ان کی "کیوں" پر وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تو انہیں جواب دینے کے بجائے سر جھٹک کر خود کو مزید بولنے سے روکا۔

"اور ہاں ایک بات اور اگر اب تمہارے تایا اور خاص طور پر ناظم آئے تو تمہیں وہاں بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ ان سے پوچھنا تو بہت کچھ چاہتی تھی' لیکن ان کا سخت انداز دیکھ کر خاموش رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"اچھا ہوا تم آگئی' میں تمہاری طرف ہی آرہی

تھی۔" اسے دیکھ کر عمارہ بے ساختہ بولی تھی۔

"خیریت!" زینب نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"امی نے کڑھی بنائی تھی' وہی لے کر آرہی تھی۔"

"کڑھی!" زینب نے چٹخارہ لے کر اسے دیکھا۔ ایک باؤل میں کڑھی ڈال کر میرے لیے علیحدہ رکھ دو اور امی کے لیے پلیٹ میں ڈال کر لے آؤ۔"

وہ دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتی ہوئی کچن میں رکھے ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"بھوکی ندیدی!" کڑھی پلیٹ میں ڈالتے ہی عمارہ نے اسے چڑایا' لیکن اس نے بالکل بھی برا نہیں مانا۔

"نیور مائنڈ' کڑھی کے لیے تمہاری جلی کٹی بھی منظور ہے۔" اس کے کہنے پر عمارہ نے مسکراتے ہوئے ایک پلیٹ اس کے سامنے اور دوسری اپنے آگے رکھی۔

"کڑھی تو چلو قسمت سے مل گئی' ویسے میں انگلش کے نوٹس لینے آئی تھی۔"

عمارہ نے فریج سے بوتل نکال کر گلاس اور پانی کی بوتل دونوں اس کے سامنے رکھے۔

"آنٹی گھر پر نہیں؟"

"گھر پر ہی ہیں' فون پر مصروف ہیں' غالیہ آپی نے کوئی لڑکی پسند کی ہے بھائی کے لیے۔"

اور زینب کو پانی پیتے ہوئے زبردست اچھولگا تھا۔ عمارہ نے اٹھ کر اس کی پشت نہیں سہلائی' کیونکہ وہ جانتی تھی' وہ کیا کہنے والی ہے۔ آخر کار زینب نے بڑی مشکل سے خود کو نارمل کیا۔ لیکن ساتھ ہی اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"میں وجہ پوچھ سکتی ہوں تمہاری اس ڈریکولا والی ہنسی کی؟"

"میرا خیال ہے ہنسنے والی ہی بات ہے۔ شادی وہ بھی ہادی بھائی کی؟"

"کیوں اس میں مزاحیہ کیا ہے؟" عمارہ نے ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔

"یہ چھوڑو' مجھے بتاؤ' وہ کون مظلوم و قابل رحم، قابل ہمدردی بلکہ دنیا کی فضول ترین لڑکی ہے' جس کی قسمت تمہارے بھائی سے پھوڑی جارہی ہے۔"

"اے مائنڈ یور لینگویج۔" عمارہ نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی۔ "خبردار جو میرے بھائی اور میری ہونے والی بھابھی کی شان میں کوئی گستاخی کی۔ بلکہ وہ خوش قسمت ترین لڑکی ہوگی' جس کی شادی میرے بھائی سے ہوگی۔"

"اچھا!" زینب کا اچھا کافی لمبا اور طنزیہ تھا۔

"کیوں' تمہیں کوئی شک ہے؟"

"شک نہیں یقین ہے' تمہارا بھائی دنیا کا سڑیل ترین' مغرور' بد دماغ' ان رومانٹک' حس مزاح سے کوسوں دور بھاگنے والا بندہ ہے۔ دل کی جگہ پتھر فٹ ہے' جس لڑکی کی شادی ان کے ساتھ ہوگی بے چاری اس دل نما پتھر سے سر پھوڑ پھوڑ کر ہی مر جائے گی تمہارے بھائی صاحب تو اس کے سانس لینے پر بھی پابندی لگا دیں گے۔ یہاں مت بیٹھو' وہاں مت جاؤ' اگر وہ دروازے پر ہوں تو موصوف اسے جھڑک دیں گے' وہ ہنسے گی تو تمہارے بھائی اسے گھور گھور کر ہی اس کا خون جلا دیتا ہے' لڑکیاں ایسی چیزوں کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"تم اگر میری دوست نہ ہوتیں تو میرے بھائی کی شان میں اتنی گستاخی کرنے کے بعد یہاں زندہ نظر نہ آرہی ہوتیں۔"

"کسی نے سچ ہی کہا ہے' سچ بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی۔

"اپنے بھائی تو سب کو چاند ہی نظر آتے ہیں' ذرا کسی اور کی نظر سے۔"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ دروازے کے بالکل درمیان میں ہادی کھڑا اسے ہی گھور رہا تھا۔ ایک پل کے لیے اس کی سانس سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی' پھر اس نے تھوک نگل کر نظروں کے زاویے کے ساتھ رخ بھی بدل لیا۔

"عمارہ! میرے اور امی کے لیے چائے لان میں لے آنا۔" خاموشی پر اس نے ڈرتے ڈرتے مڑ کر دیکھا' وہ جا چکا تھا۔ اس نے بے چارگی سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے پر عمارہ کا زبردست قہقہہ ابلا تھا اور وہ روہانسی ہو گئی۔

"پتا نہیں کیا سنا اور کیا نہیں سنا۔" وہ ہاتھ مسلتی پریشانی سے بولی۔

"اب جو بھی ہو' تم نے تو اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔"

"عمارہ! اب کیا ہوگا؟" چائے میں پتی ڈالتے ہوئے عمارہ نے زینب کا چہرہ دیکھا جو ستا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ہوتا یار! اگر بھائی نے سنا ہوتا تو تم صحیح سلامت یہاں کھڑی نہ ہوتیں' تمہیں پتا تو ہے انہیں تو پہلے ہی موقع چاہیے تم پر غصہ کرنے کا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" سمجھ میں آنے پر اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس لیا۔

"تم بیٹھو میں آتی ہوں۔" عمارہ ٹرے باہر لے جاتے ہوئے بولی تو وہ بھی اس کے پیچھے نکل آئی۔

"نہیں میں بھی جارہی ہوں۔" وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر آگئی۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے ہی دھیان میں چلی جارہی تھیں' جب ان کے بالکل قریب ایک بائیک آکر رکی تھی۔ انہوں نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور وہ جو کچھ سخت کہنے کا ارادہ کر رہی تھیں ہادی کو دیکھ کر مسکرادیں۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام' جیتے رہو۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کہاں جارہی ہیں آنٹی؟"

"یہ بس مارکیٹ تک جارہی تھی۔"

"پیدل!" اس نے کچھ حیرت سے انہیں دیکھا' کیونکہ مارکیٹ کافی دور تھی۔

"نہیں۔ آگے سے کوئی رکشا لیتی ہوں۔"

"چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے بائیک کو کک لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا! تمہیں دیر ہو جائے گی' مجھے مارکیٹ سے پہلے بل جمع کروانے بینک جانا ہے' پھر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

ہادی نے اب قدرے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"چلیں پھر میں پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

اب کی بار حمیرا ہنس دیں۔ "کوئی بات نہیں بیٹا! میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں آنٹی! آپ بیٹھیں۔" وہ حتمی انداز میں بولا تو حمیرا متذبذب ہو گئیں۔

"بیٹا! ڈاکٹر کے پاس دیر ہو جائے گی' بینک بند ہو جائیں گے۔ بل کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔"

"کوئی پرابلم نہیں آنٹی! پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس چھوڑ دوں گا' پھر بل جمع کروا کر آپ کو پک کرلوں گا' وہاں سے مارکیٹ لے جاؤں گا۔"

اس کی تفصیل سن کر وہ خاموش ہو گئیں' ان کو خاموش ہوتے دیکھ کر وہ دوبارہ بولا۔

"آنٹی! اگر آپ کو بائیک پر بیٹھنے سے ڈر لگ رہا ہے تو میں گاڑی لے آتا ہوں۔" وہ کھل کر مسکرا دی تھیں۔

"اب تم اپنی آنٹی کو شرمندہ کر رہے ہو' چلو۔" وہ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئیں۔

ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کر جب وہ باہر آئیں' وہ بائیک پر بیٹھا یقیناً ان ہی کا منتظر تھا۔ اتنی شدید گرمی میں کھلے آسمان کے نیچے۔ جب سورج آگ برسا رہا تھا' پتا نہیں وہ کب سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انہیں بے ساختہ اس پر پیار آیا تھا۔ ان کو آتا دیکھ کر وہ سیدھا ہو گیا۔

اس کے قریب پہنچنے پر انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا' صاف رنگ بری طرح دہک رہا تھا اور سفید ٹی شرٹ بری طرح بھیگی تھی۔

"ہادی بیٹا! آپ اندر آجاتے۔" وہ شرمندگی سے بولیں۔

"کوئی بات نہیں آنٹی! آپ یہ بتائیں ڈاکٹر نے کیا کہا؟"

"کچھ خاص نہیں بی پی ہائی تھا۔"

"آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے اور یہ کام آپ کے کرنے والے نہیں، آپ سمیر سے کیوں نہیں کہتیں؟"

"وہ ابھی چھوٹا ہے۔" ان کے کہنے پر وہ سر جھٹک کر بولا۔

"اتنا بھی چھوٹا نہیں آنٹی! میٹرک کا اسٹوڈنٹ ہے۔ گروسری اور بل وغیرہ کا کام تو کر سکتا ہے۔"

اس کی بات پر وہ خاموش ہو گئیں تو وہ اپنے جذباتی انداز پر خود کو سرزنش کر کے رہ گیا۔

"خیر وے آنٹی! آئندہ آپ بل و گروسری یا کوئی کام ہو مجھ سے کہیں، آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ارے نہیں بیٹا! آپ کو آفس بھی تو جانا ہوتا ہے۔"

"مجھے کوئی پرابلم نہیں، گھر کے بل بھی میں جمع کرواتا ہوں، آپ کے بھی لے جاؤں گا تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتیں۔"

اسے ایک دم سنجیدہ ہوتا دیکھ کر وہ بوکھلا کر جلدی سے بولیں۔

"ایسا نہیں ہے ہادی! میں نے تو ہمیشہ آپ کو اپنا بیٹا سمجھا ہے۔"

"پھر بس آنٹی! بیٹے کو منع نہیں کرتے۔ اس کی بات مانتے ہیں۔" اب کی بار انہوں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور مسکرا کر اس کے پیچھے بیٹھ گئیں۔ ڈور بیل کی آواز پر وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر حمیرا پر پڑی، اس سے پہلے وہ کچھ کہتی دوسری نظر حمیرا کے پیچھے کھڑے ہادی پر پڑی۔

"راستہ تو دو، بت بن کر دروازے میں ہی کھڑی ہو گئی ہو۔" حمیرا کے گھرکنے پر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی تو حمیرا کے پیچھے ہادی اِدھر اُدھر دیکھے بغیر دونوں ہاتھوں میں شاپرز لیے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بھی حیران ہوتی ہوئی اندر آئی جہاں وہ ڈائننگ ٹیبل پر شاپرز رکھنے کے بعد سمیر سے کہہ رہا تھا۔

"تم اب بچے نہیں ہو، بڑے ہو گئے ہو اور اس گھر میں تم واحد مرد ہو، کیا یہ اچھا لگتا ہے تمہارے ہوتے ہوئے آنٹی باہر جا کر لائنوں میں لگ کر بل جمع کروائیں۔"

اس نے دیکھا سمیر جو اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اکثر و بیشتر اسے اور حمیرا کو زچ کر کے رکھ دیتا تھا، آج ہادی کے سامنے بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔

"ہادی بھائی! اکثر اسکول سے لیٹ ہو جاتا ہوں، پھر اسکول کے بعد ٹیوشن چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے بھی لیٹ آتا ہوں اور دوسرا امی نے مجھے کبھی کہا بھی نہیں۔"

"یہ کام نہ کرنے کے بہانے ہیں اور اگر آنٹی تمہیں نہیں کہتیں یہ تمہارا احساس کرتی ہیں تو بیٹا ہونے کے ناتے تمہارا بھی فرض ہے کہ تم ان کا احساس کرو۔"

سمیر نے مدد طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"ہادی بیٹا! تم بیٹھو۔ اتنی گرمی میں کھڑے رہے ہو، میں تمہارے لیے شربت لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی! میں چلتا ہوں ویسے بھی مجھے دیر ہو گئی ہے۔" وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔

"صرف دو منٹ لگیں گے۔" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے زینب کو آواز دی۔ جو دیوار کے ساتھ کھڑی تھی وہ فوراً آگے آئی۔

"جاؤ، بھائی کے لیے شربت لے آؤ جلدی۔"

جب وہ لیمن اسکواش لے کر آئی تو وہ سمیر سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ٹرے اس کے سامنے کی تو اس نے زینب کی طرف دیکھے بغیر گلاس تھام لیا، ابھی وہ ٹرے کچن میں رکھ کر نکلی ہی تھی کہ وہ جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"لگتا ہے کچھ زیادہ ہی گرمی لگ رہی تھی۔" خالی گلاس دیکھ کر اس نے سوچا۔

"آنٹی! آپ کو کوئی کام ہو آپ بس مجھے فون

... حمیرا سے کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑ ... اس کے پیچھے دروازہ بند کرنے آ رہی تھی۔ ... ہادی کے دروازہ کھولتے ہی ناظم کی شکل دکھائی ... ہادی نے ناظم کو اور ناظم نے ہادی کو دیکھا۔ ... نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ آگے بڑھ آئی۔

"یہ ناظم بھائی ہیں، میرے تایا کے بیٹے۔" تعارف ... نے پر ہادی نے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی ... بڑھایا، جیسے بڑے تکلف کے بعد تھام لیا گیا ...

"آئیں ناظم بھائی!" ہادی کی پشت کو مسلسل ... نے پر اسے ناظم کو متوجہ کرنا پڑا۔

"ہاں ایک منٹ!" اس نے چونک کر پہلے زینب کو ... اور پھر واپس مڑ گیا، جب وہ واپس آیا اس کے ہاتھ ... کئی شاپرز تھے۔ وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ... تو حمیرا نے حیرت سے ناظم کو دیکھا۔ اس کے ... جواب بھی انہوں نے اسی حیرت سے دیا۔

"میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ سے ملتا ... " حمیرا کی حیران شکل دیکھ کر اس نے کھسیا کر ... تو حمیرا بمشکل سے مسکرائیں۔

"آؤ بیٹا! بیٹھو۔" وہ شاپرز ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر ... گیا۔

"یہ میں آپ لوگوں کے لیے لایا تھا۔" اس نے ... طرف اشارہ کیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگتا چچی!" اس نے کہہ کر ... کی طرف دیکھا جو صوفے کے پیچھے کھڑی حمیرا اور ناظم کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں زینب پر ... محسوس کر کے حمیرا نے اسے وہاں سے ہٹانا چاہا۔

"زینب! جاؤ بھائی کے لیے کچھ ٹھنڈا لے آؤ۔"

"نہیں چچی! اس کی ضرورت نہیں۔ زینب! تم بیٹھو۔"

اس کے کہنے پر وہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی وہ بھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھ کا اشارہ ... کر وہ مزید کوئی بات کیے بنا اندر کی طرف مڑ گئی۔

سمیر وہ شاپرز اندر لے آیا تھا جن میں کیک، پیٹیز اور جوسز تھے۔ اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے وہ سب چیزیں شاپرز سے نکال کر کاؤنٹر پر رکھیں۔

ایک ہفتے میں یہ اس کا دوسرا چکر تھا۔ اوپر سے اتنا مہربان انداز تایا جی تو مہینوں بعد چکر لگاتے تھے اور وہ بھی کھڑے کھڑے، بچپن سے اپنوں اور رشتوں کی اپنائیت اور چاہت کے لیے ترسی اس کی زندگی میں یہ تبدیلی بہت حیران کن تھی لیکن کوئی چیز تھی جو اسے روک رہی تھی۔

چائے کو ابلتا دیکھ کر اس نے چونک کر چولہا بند کیا۔ وہ چائے کپوں میں ڈال رہی تھی جب سمیر اندر داخل ہوا۔

"امی نے کہا، آپ اندر جائیں۔ ٹرے میں لے جاؤں گا۔" اس نے حیرت سے سمیر کو دیکھا۔

"لیکن کیوں؟" اس نے کہا تو سمیر نے کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کل اس کا ٹیسٹ تھا۔ لہٰذا سب کچھ بھول کر اس نے کتاب کھول لی۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھوں میں تین تصویریں تھیں جن کو وہ بار بار دیکھ رہی تھی۔ وہ ساتویں بار تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جب عمارہ نے تصویریں اس کے ہاتھ سے چھین لیں۔

"میں نے تصویریں دیکھنے کو کہا تھا۔ ان کا پوسٹ مارٹم کرنے کو نہیں۔"

"ہاں تو تم نے دیکھنے کو کہا تھا دیکھ تو رہی ہوں۔" زینب نے معصومیت سے اسے دیکھا۔ عمارہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھ کر بتانا بھی ہے۔ زیادہ خوب صورت کون ہے۔"

"ان کا مقابلہ حسن ہونے والا ہے؟" زینب نے ایک بار پھر حیرت سے ان تینوں تصویروں کو دیکھا۔ عمارہ نے محاورۃً نہیں حقیقتاً اپنا ماتھا پیٹ

لیا۔

"ان تینوں میں سے کوئی ایک میری مستقبل کی بھابھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں۔" زینب نے حیرت سے عمارہ کو دیکھا۔

"اچھا!" پھر تصویروں کو دیکھ کر بولی۔ "تمہیں ان میں سے کس کی گردن پتلی نظر آرہی ہے؟"

"کیا مطلب؟" عمارہ نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"میرا مطلب ہے تمہیں ان میں سے زیادہ کون پسند ہے۔" عمارہ نے تین تصویروں میں جو سب سے اوپر تھی اس پر ہاتھ رکھا۔ لڑکیاں تینوں ہی اچھی تھیں۔

"یہ ہیں کون؟"

"یہ دونوں عالیہ آپی کے سسرال میں سے ہیں اور تیسری رشتہ کروانے والی نے دکھائی ہے۔"

"اچھا!" زینب نے سر ہلایا۔ "تمہیں کون سی پسند ہے؟"

"یہ سوال تمہیں ہادی بھائی سے پوچھنا چاہیے تھا۔ آخر شادی تو انہوں نے کرنی ہے تو لڑکی بھی ان کی پسند کی ہونی چاہیے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے ہم نے پوچھا نہیں ہوگا میں نے امی نے آپی نے حتیٰ کہ پاپا نے بھی پوچھا کہ انہیں کوئی لڑکی پسند ہو تو بتادیں لیکن انہوں نے یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے میرے بھائی کتنے شریف ہیں۔" عمارہ نے بڑے مان اور پیار سے اپنے بھائی کا ذکر کیا تھا۔

ہادی سے لاکھ اختلاف ہونے کے باوجود وہ برملا یہ اعتراف کرتی تھی کہ وہ واقعی ایک شریف انسان ہے۔ دل میں تو اس نے ہادی کی شرافت کا اقرار تو کرلیا تھا مگر عمارہ کو تنگ کرنا بھی ضروری تھا۔

"یہاں بات شرافت کی نہیں جذبات اور حس لطافت کی ہے جو آپ کے برادر محترم میں ہے ہی نہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" عمارہ حسب عادت بھڑک اٹھی تھی۔

"مطلب یہ کہ کوئی لڑکی پسند کرنے کے لیے دل کا ہونا ضروری ہے اور دل بھی وہ جو امنگوں سے بھرا ہو۔ تمہارے بھائی کا دل..." زینب نے منہ بنا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ میرا ہی دماغ خراب تھا جو بھائی کے دشمن سے مشورہ مانگنے آگئی۔" عمارہ غصے سے کھڑی ہوگئی تو زینب نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ناراض کیوں ہو رہی ہو میں تو مذاق کررہی تھی۔" عمارہ نے پہلے تو ناراضی سے اسے دیکھا لیکن اس کی مسکراتی شکل دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

"مجھے تو تمہاری ہونے والی بھابھی سے ابھی سے جیلسی ہو رہی ہے تم تو میری جگہ بھی اسے دے دو گی۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہاری جگہ کبھی بھی کوئی نہیں لے سکتا۔" زینب ہنستی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں تو ثمینہ، حمیرا سے انہی تصویروں کے متعلق باتیں کررہی تھیں۔

وہ عمارہ کو وہاں بٹھا کر خود کچن میں آگئی۔ جب وہ ٹرالی لے کر اندر آرہی تھی تو اپنا ذکر سن کر اس کے قدم رک گئے تھے۔

"آپ کی نظر میں کوئی اچھا سا لڑکا ہو زینب کے لیے، تو مجھے بتائیں یا پھر کوئی اچھا رشتہ کروانے والی ہو۔"

زینب نے اپنی ماں کو کہتے سنا تھا۔ اور یہ بات اس کے لیے کافی حیران کن تھی کیونکہ آج سے پہلے گھر میں کبھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی اور حمیرا بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی سوچ کو زبان ثمینہ نے دی تھی۔

"اتنی جلدی آپ زینب کی شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"اتنی جلدی تو نہیں بی۔ اے میں پڑھ رہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ تو جانتی ہیں زینب اور عمارہ دونوں کا ارادہ ایم۔ اے کرنے کا ہے۔"

"ہاں وہ کرلے ایم اے لیکن شادی کے بعد۔" ثمینہ کے ساتھ عمارہ بھی ناسمجھی سے حمیرا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی حیرت ان کے چہرے سے وہ بھی پڑھ رہی تھیں۔

"شادی تو آخر کرنی ہی ہے۔ چاہے اب ہو یا دو سال بعد تو بہتر یہی ہے کہ وقت پر میرے سامنے میری زندگی میں ہو جائے۔ زینب کا کون ہے میرے سوا نہ باپ نہ کوئی سگا ہمدرد رشتے دار اور سمیر بہت چھوٹا ہے۔ اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔" حمیرا کے کہنے پر باہر کھڑی زینب کے ہونٹ بڑے بے ساختہ انداز میں بھینچ گئے تھے۔

"کیسی باتیں کررہی ہو حمیرا! اللہ تعالیٰ بچوں پر آپ کا سایہ سلامت رکھے اور ناامیدی تو کفر ہے۔ آپ زینب کی فکر نہ کریں ان شاء اللہ عمیر کی بھی شادی کرنی ہی ہے اور ایک دو اچھے رشتہ کروانے والی کو میں بھی جانتی ہوں اور اگر آپ کی مرضی اور خوشی زینب کی شادی میں ہے تو آپ بے فکر رہیں۔ میں ہادی کے پاپا سے بھی بات کرتی ہوں ان کے کوئی جاننے والوں میں وہ دیکھیں اور باقی رشتہ کروانے والی تو ہے نا!"

زینب نے ایک نظر ٹرالی پر ڈالی اور گہرا سانس لیتے ہوئے اندر آگئی۔

☆ ☆ ☆
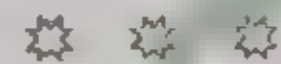
آج تایا جی کے ساتھ تائی جی بھی آئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی لیکن چند لمحوں کے بعد وہ خوشی پریشانی میں بدل گئی تھی۔ اسے ابھی تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا، جو اس نے سنا تھا۔ وہ کچن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی تھی جہاں سے باہر لاؤنج میں بیٹھے تینوں لوگوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد باہر خاموشی چھاگئی تھی جسے نجم صاحب کی آواز نے توڑا تھا۔

"تم سوچنا چاہو تو سوچ سکتی ہو ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

"بڑی معذرت کے ساتھ بھائی صاحب! سوچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میری زینب کا آپ کے بیٹے کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں، دوسرا میں زینب کا رشتہ طے کرچکی ہوں۔" اس نے اپنی ماں کی بڑی پرسکون اور مضبوط آواز سنی تھی۔

"ابھی کچھ دن پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی، دو دنوں میں تم نے رشتہ بھی طے کرلیا۔" نجم صاحب کی طنزیہ آواز سنائی دی تھی۔

"حمیرا! کیوں بحث کررہی ہو۔ گھر کا بچہ ہے اور پھر ہم اتنی چاہت سے زینب کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ ناظم نے خود زینب کا نام لیا ہے۔ وہ بڑا خوش رکھے گا اسے۔"

تائی جی کی بات سن کر زینب کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"بھابھی! مجھے کم از کم آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ آپ بیٹیوں والی ہو کر ایسی بات کررہی ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ عمروں کا بہت فرق ہے اور سب سے بڑی بات ناظم شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی بھی موجود ہے۔"

"تو کیا آدمی دوسری شادی نہیں کرسکتا اور اس کے پاس تو وجہ بھی موجود ہے۔ اولاد نہیں ہو سکتی اس کی بیوی سے اور ہمارا ایک ہی بیٹا، اتنی جائیداد کا وارث۔ آخر کوئی تو ہونا چاہیے اس کا نام چلانے والا۔ اتنی بڑی جائیداد کو سنبھالنے والا۔" تائی جی کی تلملاتی ہوئی آواز آئی تھی۔

"آپ کو جو ٹھیک لگتا ہے آپ کریں۔ وہ چھوڑ چار کروائیں میری بلا سے، لیکن زینب کے بارے میں سوچیے گا بھی مت۔" اس کی ماں کی آواز میں ایسا کچھ تھا کہ اس کے آنسوؤں میں کمی آگئی تھی۔

"یہ تم اچھا نہیں کررہی حمیرا! پچھتاؤ گی۔"

نجم صاحب کی دھمکی کے جواب میں کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے اور پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ ابھی بھی اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ اپنی ماں کی روک ٹوک کی وجہ اسے ابھی

ابھی معلوم ہوئی تھی۔

"زینب!" حمیرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور بے اختیار ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"پگلی روکیوں رہی ہو؟" وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے بولیں۔

"امی! کوئی انسان اتنا برا بھی ہو سکتا ہے انہیں ایسی بات کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔"

حمیرا نے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کیے اور گہرا سانس لے کر بولیں۔

"بعض لوگ ہوتے ہیں بیٹا! بیمار ذہنیت کے جو رشتوں کے تقدس کو ہی نہیں سمجھتے۔ میں اس کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن چکی تھی لیکن جب پہلی بار وہ یہاں آیا اور جس طرح وہ تمہیں دیکھ رہا تھا برا تو مجھے تب بھی لگا تھا۔ اس لیے تو میں نے تمہیں منع کیا تھا اس کے سامنے آنے سے۔"

"امی! آپ مجھے صاف صاف کہتیں، میں کبھی ان کے سامنے تو کیا تایا جی کے سامنے بھی نہ آتی۔"

"چلو دفع کرو، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے اس کا چہرہ تھپتھپایا لیکن وہ کتنے دن تک اس سوچ سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ لیکن اگلے آنے والے دنوں میں جب دوسری طرف خاموشی رہی تو وہ بھی مطمئن ہو کر اپنی روٹین میں مگن ہو گئی۔

✲ ✲ ✲

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جہاں تین بج رہے تھے۔ اب تو اس کے انتظار کی حد ہو گئی تھی۔ وہ اضطرابی انداز میں کھڑی ہوئی۔ سمیر دو بجے تک آجاتا تھا اب تو تین بج رہے تھے۔ عجیب طرح کے وہم اسے ستا رہے تھے۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ کتنی دیر تک گیٹ کے سامنے چکر لگاتی رہی پھر تنگ آکر گیٹ کھول کر باہر آگئی۔ گرمیوں کی دوپہر تھی سب لوگ آرام کر رہے تھے اور دور تک نظر آتی سڑک بالکل سنسان پڑی تھی۔ اس نے مضطرب نظروں سے اس طرف دیکھا جہاں سے سمیر اور حمیرا کو آنا تھا۔

خاموشی میں دروازہ کھلنے کی آواز بڑی واضح تھی۔ اس نے آواز کی سمت میں سر گھمایا عمارہ کے گھر کا گیٹ کھلا پھر گیٹ سے گاڑی نکلی تھی جو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قریب آرکی تھی۔ اور شیشہ نیچے کر کے جب ہادی نے منہ نکالا تو اس کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟" سوال پر اسے غصہ تو بہت آیا لیکن اس وقت وہ کسی بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔

"سمیر کا ویٹ کر رہی ہوں۔"

"ویٹ ہی کرنا ہے تو اندر جا کر کرو۔ آنٹی کہاں ہیں؟"

"وہ بازار گئی ہیں۔"

وہ ابھی بھی دروازے میں جمی تھی اور وہ بھی نہیں جا رہا تھا۔ زینب نے پھر گردن گھما کر سڑک کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔

"سمیر کتنے بجے تک آتا ہے۔" پھر ایک سوال آیا تھا۔

"دو بجے۔" اس نے بھی جیسے ہر سوال کا جواب دینے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے کہنے پر ہادی نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی جہاں ساڑھے تین ہو رہے تھے۔

"تم اندر چلو۔ میں اس کے اسکول جاتا ہوں۔"

زینب نے کچھ چونک کر اسے دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ہادی کو گئے پندرہ منٹ ہوئے تھے جب اس نے گیٹ پر ہارن کی آواز سنی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور سمیر پر نظر پڑتے ہی اس نے گہرا سانس لیا لیکن غور سے دیکھنے پر اس کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ سمیر کے اندر داخل ہوتے ہی ہادی کی گاڑی بھی چلی گئی تھی وہ گیٹ بند کر کے سمیر کے پیچھے آئی۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" اس نے سمیر کی پھٹی ہوئی شرٹ اور پھٹی ہوئی پینٹ اور چہرے پر زخم کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بیگ صوفے پر رکھ کر شرٹ اتار رہا تھا۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں؟" اب کے وہ غصے سے بولی تو سمیر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"اسکول میں کچھ لڑکوں کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔"

اس نے کچھ حیرت سے سمیر کو دیکھا کیونکہ وہ تو لڑائی سے کوسوں دور بھاگنے والا بچہ تھا۔

"تم لڑے تھے؟" وہ اب بھی حیران تھی۔

"میں نہیں وہ کلاس میں کچھ لڑکے ہیں جو ہر ایک کو تنگ کرتے ہیں کافی عرصے سے وہ مجھے بھی تنگ کر رہے تھے میں اگنور کر دیتا تھا لیکن آج ایک تو انہوں نے میری فیس چھین لی۔ دوسرا مجھے گالی بھی دی۔" بتاتے ہوئے اس کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔

"تم نے پرنسپل سے شکایت کی؟"

"کی تھی لیکن کوئی ایکشن نہیں لیتا۔ میرے سے پہلے میرے کلاس فیلو نبیل کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ اس کے ابو نے آکر سب کے سامنے ان کی بے عزتی کی تب سے وہ اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ میرے تو ابو ہیں اور نہ بھائی میں کسے لے کر جاؤں۔"

اس کے سوال پر وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی تو وہ بیگ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سوال جو اس کے اندر بیدار ہو کر اسے بے چین کرتا تھا آج وہ اس کے بھائی کی زبان پر آیا تھا۔ وہ احساس محرومی ایک بار پھر اس میں بیدار ہونے لگا۔

✲ ✲ ✲

وہ خاموشی سے سمیر کو ناشتا کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے اس سے بات کرے۔ جبکہ اس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔

"سمیر!"

"جی۔" وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم امی کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ پرنسپل سے بات کریں گی۔"

"میں نے امی کو نہیں بتایا کیونکہ وہ پریشان ہو جائیں گی۔ دوسرا میں آج ہادی بھائی کو لے کر جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" زینب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ انہوں نے خود مجھ سے کہا وہ میرے اسکول آئیں گے۔"

زینب نے اب کی بار کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جانتی تھی ہادی نہیں آئے گا۔ کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑائے۔

ہارن کی آواز پر سمیر تیزی سے کھڑا ہوا تھا اور وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے آئی تھی گیٹ کھلتے ہی اسے ہادی کا چہرہ نظر آیا اور وہ جہاں تھی وہی کھڑی رہ گئی۔ سمیر نے اللہ حافظ کہہ کر گیٹ بند کر دیا۔

وہ چہرہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن وہ ابھی بھی گیٹ کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ وہیں موجود ہو۔

✲ ✲ ✲

وہ اپنے کمرے میں تھی جب اس نے سمیر کی آواز سنی۔ اس سے پہلے وہ باہر نکلتی سمیر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟"

"آج بہت مزا آیا۔" اس کے پوچھنے پر سمیر چٹخارہ لے کر بولا۔

"صبح جب میں ہادی بھائی کے ساتھ گیا۔ پہلے ہم پرنسپل کے آفس گئے۔ ایک تو ہادی بھائی کی پرسنالٹی اتنی شان دار ہے اور پھر ان کا مشہور زمانہ غصہ جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو پرنسپل کی بولتی بند ہو گئی۔ پھر سر نے ان غنڈوں کے گینگ کو بلایا۔"

جوش سے بتاتے ہوئے سمیر اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"اور پھر ہادی بھائی نے ان کی ایسی عزت افزائی کی

کہ ان کے منہ دیکھنے والے تھے۔ اور میرا دل چاہ رہا تھا ہادی بھائی کو گلے لگالوں۔" جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "مجھے پہلے بھی ہادی بھائی اچھے لگتے تھے۔ لیکن آج میری نظروں میں ان کی عزت اور دل میں ان کی محبت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔"

جوش میں بولتے بولتے اس نے زینب کا چہرہ دیکھا جو بالکل خاموش تھی۔

"میں جانتا ہوں ہادی بھائی کے لیے میری تعریف آپ کو اچھی نہیں لگ رہی ہو گی لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا۔ وہ بہترین انسان ہیں۔" سمیر کہہ کر باتھ روم میں چلا گیا تھا جبکہ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کوئی پریشانی ہے؟"

"ہوں!" زینب نے کچھ چونک کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں تو۔"

"تو پھر چپ چپ کیوں ہو؟" عمارہ کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"تمہارا وہم ہے۔"

"کیا بات ہے، آج کلاس نہیں لینی؟" اسے بڑے مطمئن انداز میں کوک پیتے دیکھ کر عمارہ نے پوچھا۔

"نہیں یار! آج کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" زینب کے انداز کے ساتھ باتوں سے بھی بے زاری جھلک رہی تھی۔

"آج گھر کیسے جانا ہے۔ وہ وین والا تو نہیں آئے گا؟"

"میں بھائی سے کہہ کر آئی تھی۔ چھٹی میں ہمیں پک کر لیں۔ اگر لنچ ٹائم میں وہ فری ہوئے تو لینے آجائیں گے اگر نہ آئے تو ٹیکسی اور رکشے تو ہیں نا!"

عمارہ نے چٹکی بجا کر مسئلہ حل کر دیا تو اس نے سر ہلا کر اسٹرا دوبارہ ہونٹوں سے لگا لی۔

"اچھا ایک اہم بات تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔" عمارہ کی پرجوش آواز پر اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اس دن جو تصویر ہم نے پسند کی تھی وہ باقی سب کو بھی پسند آئی ہے۔ اگلے ہفتے ہی امی ابو ان کے گھر جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسے انگوٹھی بھی پہنا آئیں۔"

زینب کو بڑے زور کا اچھو لگا تھا۔ عمارہ گھبرا کر بے ساختہ اٹھی۔ اور اس کی پشت سہلانے لگی۔ ارد گرد بیٹھی لڑکیوں نے بھی مڑ کر اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ کھانسی رکتے ہی وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی جبکہ عمارہ اب بھی متفکر نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی پشت سہلا رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" سانس بحال ہونے پر وہ بڑی دقت سے بولی تھی۔ عمارہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کھوجتی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ کھانسی تو رک گئی تھی لیکن آنکھوں کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ خود پر عمارہ کی کھوجتی نظریں محسوس کر رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھ رہی تھی کہ اسے کوئی وضاحت دے سکے۔ اس نے بڑی سختی سے اپنی آنکھوں کو رگڑ کر خشک کیا۔

"چلو۔" وہ کہہ کر اٹھی تو مجبوراً عمارہ کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔ وہ خاموشی سے زینب کے پیچھے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے زینب سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کوئی نہ کوئی پریشانی تو ضرور ہے ورنہ زینب اور خاموشی دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی زینب اس سے کچھ چھپائی نہیں۔ ابھی نہ سہی پھر سہی لیکن وہ بتائے گی ضرور۔ پاس سے گزرتی ہوئی لڑکی کا کندھا اس سے ٹکرایا تو اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ کالج آف ہو چکا تھا اور گیٹ پر لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ اس نے گردن گھما کر اپنے دائیں طرف کھڑی زینب کو دیکھا جو غائب دماغی سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ عمارہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور ہجوم کو چیرتی ہوئی اسے گیٹ کے باہر لے آئی۔ وہ متلاشی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی پھر مایوس ہو کر زینب کی طرف مڑی۔

"ادھر تو بھائی کی گاڑی نظر نہیں آرہی دوسرے گیٹ کی طرف دیکھ کر آتی ہوں تم یہیں میرا ویٹ کرو۔"

زینب کے سر ہلانے پر وہ بارہ اندر چلی گئی تھی۔ وہ گیٹ سے کچھ ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

وہ پچھلے پندرہ سالوں سے ہادی کو جانتی تھی۔ جب وہ لوگ ان کے پڑوس شفٹ ہوئے تو وہ پانچ سال کی اور ہادی گیارہ سال کا تھا۔ وہ جتنی شرارتی تھی ہادی اتنا سنجیدہ اسے شروع سے ہی ہادی پسند نہیں تھا اور اس ناپسندیدگی میں اضافہ تب ہوا جب ایک دن معمولی سی شرارت پر اس نے اسے تھپڑ دے مارا۔ اس کے بعد جہاں ہادی کے لیے اس کی ناپسندگی میں اضافہ ہوا بلکہ وہ اس کے سائے سے بھی بھاگنے لگی۔ اس نے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور اگر کبھی شادی کے لیے کسی شخص کا خاکہ ذہن میں تراشا بھی تو وہ کم از کم ہادی تو نہیں تھا۔ پھر اچانک یہ کیا ہوا کہ وہ دنوں سے وہ جو ہادی کے لیے محسوس کر رہی تھی۔ اس جذبے کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ لیکن آج جب عمارہ نے اس کی شادی کی بات کی تو پہلا خیال جو اسے آیا وہ اسے کھونے کا تھا۔ اور یہ خیال اتنا زور آور تھا کہ اسے رلا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی اس کا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اسے پسند نہیں کرتا پسند تو وہ بھی نہیں کرتی تھی لیکن یہ اچانک؟

اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں ایک بار پھر جھلملا اٹھیں۔ اس نے آنکھیں جھپک کر آنسو اندر اتارنے کی کوشش کی۔ منظر صاف ہوتے ہی جو چہرہ اسے نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی پہلے حیرت اور پھر خوف اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔ وہ چلتا ہوا بالکل اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ زینب نے دزدیدہ نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سب اپنے اپنے دھیان میں تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"کیسی ہو زینب؟" اس کے پوچھنے پر زینب کو مجبوراً اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"یہاں سے گزر رہا تھا تمہیں یہاں کھڑے دیکھا تو خود کو روک نہیں سکا۔ یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"میری وین نہیں آئی۔" "چلو میں چھوڑ دیتا ہوں۔" زینب نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"نہیں میری فرینڈ میرے ساتھ ہے۔ وہ اندر گئی ہے۔" زینب دل میں عمارہ کے جلدی آنے کی دعا کرنے لگی۔

"چلو اسے بھی چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ کسی طور بھی ٹلنے کو تیار نہیں تھا۔

"ناظم بھائی! آپ جائیں ہم چلے جائیں گے۔" اب کے وہ جی کڑا کر کے کچھ سختی سے بولی اور رخ موڑ لیا۔ لیکن اگلا لمحہ اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا ناظم اس کے راستے میں پھیل کر کھڑا ہو گیا اور دیوار پر ہاتھ ٹکا کر اس کا راستہ روک دیا۔ زینب کا سانس سینے میں اٹک کر رہ گیا۔

"میں تم سے اب سیدھی بات کرتا ہوں۔ میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔ گھر آتا تو چچی تم سے ملنے نہ دیتیں۔ میں نے تمہارے لیے رشتہ بھیجا لیکن چچی نے انکار کر دیا تم نہیں جانتی مجھے کتنا غصہ آیا تھا۔ میرا ایک اصول ہے۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرو۔ چچی کے اس ناں کا جواب میں بڑی اچھی طرح دے سکتا تھا۔ تمہیں اغوا کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ ابھی بھی تمہیں یہاں سے لے جاؤں تو میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

زینب کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

"لیکن ایک تو تم میرے چچا کی بیٹی ہو اور سب سے بڑی بات میری پسند ہو۔ میں عزت کے ساتھ تمہیں اپنی بیوی بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں اگر فرزانہ کی فکر ہے تو بھول جاؤ۔ اس کی حیثیت میرے لیے کسی فرنیچر سے زیادہ نہیں۔ بیوی تو تم میری کہلاؤ گی۔ رانی بنا کر رکھوں گا تمہیں۔ اپنی ماں کو سمجھاؤ۔ اب ہم آئیں تو انکار نہیں ہونا چاہیے۔"

اس دوران وہ زمین پر نظریں گاڑے بالکل ساکت

کھڑی تھی۔

"زینب!" عمارہ کی آواز پر اسے لگا جیسے اس کے بے جان وجود میں جان پڑ گئی ہو۔ ناظم نے بھی مڑ کر اسے دیکھا تھا جبکہ عمارہ حیران نظروں سے ناظم کو دیکھتی ہوئی زینب کے قریب گئی تھی۔

"تو آپ ہیں زینب کی دوست؟" عمارہ نے سر اثبات میں سرہلا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں زینب کا کزن ہوں۔" عمارہ نے مسکرا کر سرہلایا اور زینب کی طرف دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گئی اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔

"چلو زینب! بھائی آگئے ہیں۔" عمارہ نے کہہ کر اس کا بازو بھی تھام لیا۔ جو بے حد سرد تھا۔ عمارہ نے ایک بار پھر زینب کو دیکھا اور پھر ناظم کو جو فٹ پاتھ کے کنارے پر کھڑی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ہادی بیٹھا تھا۔ ناظم کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ عمارہ مزید کوئی بات کیے بنا اسے کھینچتی ہوئی گاڑی تک لے آئی۔ ان کے بیٹھتے ہی کار اسٹارٹ ہوگئی تھی۔

"میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی تھی اور یہ کون سا کزن ہے تمہارا؟"

عمارہ کے پوچھنے پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عمارہ نے کچھ کہنے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اسے روتا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

"زینب! تم رو رہی ہو۔" زینب نے جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کر اسے بولنے سے روکا تھا۔ ہادی کی نظریں بے ساختہ ویو مرر کی طرف اٹھی تھیں۔ جہاں سے وہ زینب کو دیکھ سکتا تھا جس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر عمارہ کو مزید کوئی سوال کرنے سے روکا تھا۔

ہادی نے نظریں ایک بار پھر سامنے سڑک پر ٹکا دیں۔ گاڑی میں محسوس کی جانے والی خاموشی چھا گئی تھی۔ عمارہ نے زینب کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

گاڑی گیٹ کے آگے رکتے ہی وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے اتری تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیفارم بدل کر بمشکل چار لقمے اس نے کھائے اور زینب کی طرف آگئی۔ گیٹ سمیر نے کھولا تھا۔ لاؤنج میں اسے حمیرا آسیہ پڑھتی نظر آئیں۔

"آنٹی زینب!"

"وہ تو سو رہی ہے بیٹا!"

"اچھا۔" وہ کچھ مایوسی سے بولی۔

"تم چلی جاؤ بیٹا اور اسے جگا بھی دو کھانا کھائے بغیر سوگئی ہے۔"

وہ سرہلا کر تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھی جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ اوندھے منہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے قریب جاکر بیٹھ گئی۔ اس نے آواز دینے کے ساتھ کندھے پر ہاتھ رکھا تو اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ عمارہ گہرا سانس لے کر اسے دیکھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اب تم مجھے یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میرا وہم ہے۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی یوں روتے نہیں دیکھا۔ کوئی بہت بڑی بات ہے جو تم یوں رو رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

عمارہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے اور وہ جو بمشکل چپ ہوئی تھی اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

"آج تم کالج کے باہر میرے کزن سے ملی تھیں نا! انہوں نے میرے لیے پرپوزل بھیجا ہے۔"

"کیا؟" عمارہ چیخی تھی۔ "اس مونچھڑ سنگھ نے؟ اسے شرم نہیں آئی۔ تم اس کے ساتھ کھڑی اس کی بیٹی لگتی ہو۔"

"وہ نہ صرف عمر میں مجھ سے بڑے ہیں بلکہ شادی شدہ بھی ہیں۔" عمارہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"تو کون سا کیڑا کاٹا ہے اسے؟"

"تایا جی اور تائی جی آئے تھے۔ امی نے انکار کر دیا۔ تایا جی ہمیں دھمکی دے کر گئے اس کے بعد بھی فون آتے رہے۔ ہم نے کبھی سیریس نہیں لیا لیکن آج وہ ناظم بھائی کالج آگئے انہوں نے کہا اگر میں نے ہاں نہ

کی تو وہ مجھے اغوا بھی کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی تھی۔

عمارہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی لیکن بات واقعی پریشان کن تھی۔ عمارہ نے غور سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور بے ساختہ اس کا چہرہ تھاما۔

"تم بالکل بھی پریشان نہ ہو زینب! یوں زبردستی کسی سے شادی کرنا، اغوا کرنا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے عمارہ! ایسے لگتا ہے تپتی دھوپ میں سلگتی ریت پر ننگے پاؤں کھڑی ہوں، سہارے کے لیے کسی کا ہاتھ تھامنا چاہوں تو کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔" عمارہ نے زینب کو گلے لگایا تھا۔

"زینب! تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں، آنٹی ہیں، سمیر ہے، میرے پاپا تمہارے بھی پاپا ہیں، ماما ہیں، ہادی بھائی ہیں۔"

عمارہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے خود بھی رو رہی تھی۔

"عمارہ کیا میں تمہارے گھر میں نہیں رہ سکتی؟"

"کیوں نہیں، وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

"نہیں ایسے نہیں، میرا مطلب ہے ہادی بھائی اگر مجھ سے شادی کرلیں۔" اس نے بمشکل بات مکمل کی۔ عمارہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ جتنا وہ ہادی کو ناپسند کرتی تھی اور جتنی ہادی کو اس سے چڑ تھی ایسے میں ایسی بات سوچنا بھی حماقت تھی۔ عمارہ ایک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی جو شدت سے روتی ہوئی واقعی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔ اس لیے اس طرح اول فول بک رہی ہو، جب تمہارا دماغ ٹھکانے پر آجائے تب مجھ سے بات کرلینا۔"

عمارہ جھٹکے سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر دوبارہ اسے دیکھا اس کا خیال تھا۔ ابھی وہ مسکراتی ہوئی اس کے پیچھے آئے گی اور کہے گی میں نے تو مذاق کیا تھا ورنہ میں اور تمہارے اس سڑیل بھائی سے شادی کروں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی بھی سر جھکائے رو رہی تھی۔ عمارہ تیزی سے مڑی اور تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا دروازے میں ثمینہ کھڑی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے عمارہ! اس طرح کیوں لیٹی ہو؟" انہوں نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو قدرے تشویش سے دیکھا تھا۔ "اب اٹھو تمہارے پاپا اور بھائی بار بار تمہیں ہی پوچھ رہے ہیں۔"

"امی پلیز! آپ پاپا سے کہہ دیں، میں سو گئی ہوں۔" اس کے بے زار انداز کو ثمینہ نے غور سے دیکھا تھا۔

"عمارہ! کیا بات ہے خیریت تو ہے نا؟"

اور عمارہ نے جو آج دیکھا اور جو زینب نے اسے بتایا، وہ سب اس نے ثمینہ کو بتا دیا۔ ماسوائے اس جملے کے جس نے اسے بری طرح ڈسٹرب کر دیا تھا۔ ساری بات سن کر ثمینہ بھی پریشان ہوگئی تھیں۔

"اسی لیے حمیرا زینب کی جلدی شادی کرنا چاہتی تھی۔" وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔

"امی! زینب بہت پریشان ہے۔ میں نے اسے کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا۔ اسے اس طرح مجبور اور بے بس دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" کہنے کے ساتھ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ثمینہ نے بے ساختہ اسے ساتھ لگایا تھا۔

"عمارہ! یوں رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔"

"امی! تو آپ کچھ کریں نا۔"

"میں کیا کرسکتی ہوں بیٹا؟" وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بے چارگی سے بولیں۔ عمارہ کو ایک پل لگا تھا وہ بات کہنے میں، جسے وہ پچھلے پانچ گھنٹوں سے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ثمینہ کے سینے سے سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"امی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ہادی بھائی کی شادی زینب سے کروا دیں۔" ثمینہ نے اسے ایسے دیکھا

جیسے انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"کیا کہا تم نے؟" انہوں نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہادی بھائی کی شادی زینب سے ہو سکتی ہے؟"

"نہیں۔" اس کے سوال کا بڑا واضح اور دو ٹوک جواب آیا تھا۔ اسے معلوم تھا اسے یہ ہی جواب ملے گا۔ لیکن پھر بھی نا سن کر اسے برا لگا تھا۔

"لیکن کیوں؟"

"یہ بھی مجھے بتانا ہوگا' تم جانتی ہو' ہادی' زینب سے کتنا چڑتا ہے' زینب کی مدد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں' یہ کیا بات ہوئی اس کی مدد کے لیے میں اپنے بیٹے کو قربانی کا بکرا بنادوں۔"

ان کا ناگوار لہجہ عمارہ کو اچھا خاصا برا لگا تھا۔

"زینب کیا بدصورت ہے' بدتمیز ہے' کریکٹر لیس ہے۔"

"بس۔" ثمینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "وہ تمہاری دوست ہے بس' اور کوئی رشتہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ میں کل رشتہ والی سے بات کر کے زینب کا بندوبست کرواتی ہوں۔" بات ختم کر کے وہ کھڑی ہو گئی تھیں۔

"لیکن امی! زینب میں کیا خرابی ہے؟" ثمینہ نے بے اختیار اپنا ماتھا پیٹا تھا۔

"بات زینب میں خرابی کی نہیں۔ بات ہادی کی خوشی کی ہے' فرض کرو میں مان بھی جاتی ہوں تو کیا ہادی مان جائے گا؟ یہ کسی ٹرپ یا فنکشن پر جانے کی بات نہیں ہو رہی کہ چند گھنٹوں کا ساتھ ہے جو ہادی اسے برداشت کر لے گا۔ ساری زندگی کا ساتھ ہے' ہادی کبھی نہیں مانے گا۔" عمارہ ان کی بات سے متفق تو تھی' لیکن ایک آخری کوشش بھی تو کرنا تھی۔

"میں ہادی بھائی سے پوچھ لیتی ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ کھڑی بھی ہو گئی۔

"خبردار جو تم نے ہادی سے ایسی بات کی۔ ہادی کے لیے میں لڑکی پسند کر چکی ہوں۔ وہ بھی ہاں کہہ چکا ہے۔ دو' تین دن تک میں تمہارے پاپا اور عالیہ ان کے گھر جا رہے ہیں اور ارم کو انگوٹھی بھی پہنا آئیں گے اور زینب تمہاری دوست ہونے کے ناتے تجھے بھی عزیز ہے۔ مجھے بھی اس کی فکر ہے' میں کچھ کرتی ہوں اس کے لیے' تب تک تم اپنی چونچ بند رکھو۔" باہر نکلتے ہوئے انہوں نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔

اس نے غصے سے بند دروازے کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی ہادی' زینب سے شادی نہیں کرے گا' لیکن اس کا خیال تھا۔ ماں' باپ میں سے اگر کسی کا ووٹ مل جاتا تو شاید وہ ہادی کو منا لیتی' لیکن اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اندر داخل ہو کر پہلے انہوں نے اپنا ہینڈ بیگ ٹیبل پر رکھا اور خود گرنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے بیگم! آپ کیا اولمپکس کی دوڑ میں حصہ لے کر آ رہی ہیں؟" حشمت صاحب کے کہنے پر ہادی اور عالیہ ہنس پڑے تھے' جبکہ ثمینہ نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ عمارہ! ذرا ایک گلاس پانی تو پلا دو نا۔" ان کے کہنے پر وہ خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔

"آپ گئی کہاں تھیں؟" عالیہ نے پوچھا تھا۔

"میں حمیرا کی طرف تھی۔ اس نے زینب کے رشتے کے لیے کہا تھا۔"

"اتنی اچانک!" حشمت صاحب حیران ہوئے۔

"بس قسمت خراب' جیٹھ نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگا تھا۔ حمیرا نے انکار کر دیا بجائے کہ وہ لوگ خاموش ہو جاتے دھمکیاں دینے لگے۔ بے چاری حمیرا بہت پریشان تھی۔"

"حمیرا بھابھی نے انکار کیوں کیا؟" حشمت صاحب کے استفسار پر عمارہ ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ ایک تو عمر زیادہ دوسرا وہ شادی شدہ ہے۔"

اب کی بار لاپروائی کے ساتھ ٹی وی دیکھتے ہوئے ہادی نے بھی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

"میں نے رشتے والی سے بات کی تھی۔ وہ بھی آج رشتہ لے کر گئی تھی۔ زینب کو وہ لوگ پسند کر گئے ہیں۔ اب دو' تین دن تک میں حمیرا کے ساتھ جاؤں گی۔"

"اللہ' بچی کے نصیب اچھے کرے۔" حشمت صاحب نے کہہ کر بات ختم کر دی۔

"بچے کہاں ہیں؟" خاموشی محسوس کر کے ثمینہ نے عالیہ سے پوچھا تھا۔

"دونوں کھیل کے تھک گئے تھے' سو رہے ہیں۔"

"تم تیار رہنا۔ ارم کی طرف چلنا ہے۔ اب تم آئی ہو تو یہ کام بھی نپٹالیں۔"

ثمینہ کے کہنے پر عالیہ نے مسکرا کر ہادی کو دیکھا جو عالیہ کی نظریں خود پر محسوس کر کے اور انہماک سے ٹی وی دیکھنے لگا تھا۔

"عمارہ نہیں جا رہی؟"

حشمت صاحب کے پوچھنے پر ہادی بھی اسے دیکھنے لگا تو وہ گڑبڑا کر بولی۔

"میں پھر چلی جاؤں گی۔" کہہ کر اس نے نظریں دوبارہ ٹی وی پر جما دیں۔ سب چلے گئے تھے' صرف ہادی اور عمارہ وہاں بیٹھے تھے۔

"عمارہ' کوئی پریشانی ہے؟" عمارہ نے اس کی طرف دیکھا' جس کی کھوجتی نظریں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک پل کے لیے اس نے سوچا اسے سب بتا دے' لیکن ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس کے چہرے پر ارم کے نام کی مسکراہٹ دیکھ چکی تھی۔ اس نے سر نفی میں ہلایا اور مزید سوالوں سے بچنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"عمارہ باجی آئی ہیں۔" سمیر کی آواز پر کپڑے تہہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ایک پل کے لیے رک گئے تھے۔

وہ کپڑے رکھ کر باہر نکل آئی۔ عمارہ اسی طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرا دی' جبکہ زینب کی نظریں جھک گئی تھیں۔ اس دن اس نے بے اختیاری میں جو عمارہ سے کہہ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ خود میں حوصلہ نہیں پا رہی تھی کہ عمارہ کا سامنا کر سکے۔

"دو دن سے کالج کیوں نہیں آ رہیں اور میرے فون بھی اٹینڈ نہیں کر رہیں؟" زینب نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں زینب!" اسے مسلسل خاموش دیکھ کر عمارہ زور سے بولی۔

"آئی ایم سوری' اس دن پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔" زینب کی جھکی نظریں دیکھ کر عمارہ نے لمبی سانس لی تھی۔

"میرا خیال ہے ہماری دوستی ایسی ہے کہ اس میں کسی ایکسکیوز کی گنجائش نہیں۔ اس وقت تم پریشان تھیں اور اگر پریشانی میں تم نے مجھے اپنا سمجھ کر کچھ کہہ بھی دیا تو اس میں سوری کرنے والی کیا بات ہے۔"

"تم ناراض تو نہیں؟" زینب کے پوچھنے پر وہ ہنس پڑی۔

"نہیں' کیونکہ میں جانتی ہوں۔ وہ سچ نہیں تھا۔" زینب نے غور سے دیکھا۔ "اور اگر اس دن جو میں نے کہا تھا وہ سچ ہوتا تو؟"

عمارہ کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

"تو کیا تم ہادی بھائی سے میری شادی کروا دیتیں؟"

عمارہ بالکل خاموش تھی۔

"کیا تمہیں میں ہادی بھائی کے قابل نہیں لگتی؟"

عمارہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی پچھلی بات نہیں بھولی تھی' زینب نے اسے ایک بار پھر الجھا دیا تھا۔ اسے یوں دیکھ کر زینب ہنس پڑی تھی۔

"مذاق کر رہی تھی یار!" اس کے کندھے پر چپت لگا کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی' جبکہ عمارہ نے غصے سے اس کی پشت کو گھورا اور اس کے پیچھے آ گئی۔

"تمہیں تکلیف کیا ہے جو یوں الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو؟" زینب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"اچھا دفع کرو سب، یہ بتاؤ اپنے ہونے والے منگیتر کی تصویر دیکھی؟ کیسا لگا؟" عمارہ اشتیاق سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ زینب نے پل دو پل نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ برتنوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"امی نے دیکھ لیا ہے، کافی ہے اور پھر میرے پسند کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں عجیب سی مایوسی تھی۔

"کیوں فرق نہیں پڑتا، اگر تمہیں پسند نہیں تو نہ کرو۔"

"پھر کیا ہو گا؟" زینب نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ "پھر بھی میری شادی اس سے تو نہیں ہو سکتی، جسے میں پسند کرتی ہوں۔"

"زینب! تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو، میں بچپن سے تمہیں جانتی ہوں، اگر تم کسی کو پسند کرتی ہوتیں تو مجھے پتا ہوتا۔"

زینب نے سب برتن ریک میں رکھے اور عمارہ کی طرف مڑی۔

"دیکھو، جس شخص سے بھی میری شادی ہو رہی ہے وہ مجھے پسند ہے یا نہیں۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ جو بھی ہو گا ناظم بھائی سے بہتر ہو گا۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئی، پھر سر جھٹک کر عمارہ کو دیکھا۔

"میری چھوڑو، تم سناؤ۔"

"کچھ خاص نہیں، آج کل خالہ آئی آئی ہوئی ہیں، شاید ایک، دو دن تک ہادی بھائی کی منگنی ہو جائے۔"

زینب نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی، وہ مسکرا دی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔" عمارہ کتنی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی، لیکن جب اس کے چہرے سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی تو نظریں گھما لیں۔

☼ ☼ ☼

"زینب! فریج میں چکن رکھی ہے وہ پکا لینا۔"

"آپ کتنی دیر تک آئیں گی؟"

"ان کا گھر کافی دور ہے۔ آنے جانے میں دو گھنٹے تو لگ جائیں گے۔" چادر اوڑھ کر انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم ایسا کرو، عمارہ کو بلا لو۔"

"میں نے فون کیا تھا، وہ خالہ آپی کے ساتھ بازار گئی ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ سمیر گھر پر ہے، تم دروازہ بند کر لو۔"

دروازہ بند کر کے جب وہ اندر آئی سمیر ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو سمیر کے ساتھ ٹی وی دیکھتی رہی، پھر کچن میں آ گئی۔

ہنڈیا رکھنے کے بعد اس نے آٹا گوندھا۔ وہ سلاد بنا رہی تھی، جب سمیر اندر آیا۔

"باجی! میں ذرا گراؤنڈ تک جا رہا ہوں۔" زینب نے گھڑی کی طرف دیکھا، جہاں شام کے پانچ بج رہے تھے۔

"باجی بس آدھ گھنٹہ میں آ جاؤں گا۔" وہ بیٹ لے کر باہر کی طرف بھاگا۔

سمیر کے جانے کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ چینل سرچنگ میں مصروف تھی، جب فون کی گھنٹی بجی اس نے بے زاری سے فون کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔ اس کے دو، تین بار ہیلو کہنے پر بھی دوسری طرف خاموشی چھائی رہی تو اس نے آخر فون بند کر دیا۔ فون رکھ کر وہ ابھی پلٹی تھی کہ فون دوبارہ بج اٹھا۔ اس نے اب کی بار غصے سے ریسیور اٹھایا تھا۔

"اگر منہ میں زبان نہیں تو فون کیوں کیا ہے؟" کہہ کر وہ فون بند کرنے لگی تھی، جب اسے اپنا نام سنائی دیا تھا۔ اس نے کچھ حیرت سے ریسیور کان سے لگایا۔

"میں جانتا ہوں تم سن رہی ہو۔" زینب نے آواز پہچاننے کی کوشش کی۔

"کون؟"

"تمہارا ناظم!" دوسری طرف سے بڑے پیار سے کہا گیا تھا۔ یکدم ریسیور پر زینب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"میں نے کہا تھا نا تمہارا جواب مجھے ہاں میں چاہیے، لیکن پھر بھی دوسری دفعہ چچی نے ناں کی ہے۔ اب جو ہو گا اس کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔ مجھ سے بچنے کے لیے چچی تمہاری شادی کروانے کے چکر میں ہیں۔ تم لوگوں کی ایک ایک حرکت پر میری نظر ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں تم اس وقت گھر میں اکیلی ہو۔ چچی ان لوگوں کے گھر گئی ہیں جن سے تمہارا رشتہ جوڑنے کے خواب دیکھ رہی ہیں اور وہ خواب خواب ہی رہے گا۔ میں اسے حقیقت کا روپ دھارنے نہیں دوں گا۔ سمیر بھی یہاں کھیل رہا ہے۔ اب رہیں تم، کب سے تمہیں حاصل کرنے کی حسرت دل میں دبائے پھر رہا ہوں۔ آج موقع مل رہا ہے، تمہاری گلی بھی سنسان پڑی ہے۔"

زینب نے سرعت سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور لاؤنج کا دروازہ لاک کرنے کے ساتھ ہی ٹیک لگا لی۔ کچھ دیر وہ خائف نظروں سے سامنے دیکھتی رہی۔ تب ہی اچانک ہونے والی ڈور بیل پر اس کا پورا وجود ہل گیا تھا۔ ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی۔ ایک پل کا وقفہ آیا تھا اور ساتھ ہی فون کی بیل بج اٹھی۔ وہ ایک ہاتھ دروازے پر رکھے کبھی فون کو دیکھتی، کبھی کھڑکی کی طرف باہر کے دروازے کو دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ کانپتی ٹانگوں کے ساتھ کھڑکی کی طرف آئی جہاں سے صحن کا منظر واضح تھا۔ اس نے باہر کی لائٹ بھی نہیں جلائی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی منظر کو تھوڑا بہت واضح کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو بے اختیار تھے۔ اس نے کھڑکی کی گرل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ آہٹ پر اس نے پھر صحن کی طرف نظر دوڑائی، سامنے کیاریوں کے ساتھ والی دیوار چھوٹی تھی، وہاں پر دو، تین سائے نظر آ رہے تھے اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سائے صحن میں کود گئے۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔ وہ چیختے ہوئے الٹے قدم پیچھے ہٹی اور ٹیبل سے ٹکراتے ہی وہ پشت کے بل گری تھی۔ درد کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے تو وہ حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ لاؤنج کے دروازے کو زور، زور سے بجایا جا رہا تھا، وہ بڑی ہمت کر کے اٹھی تھی۔

اس نے متوحش نظروں سے دروازے کو دیکھا۔ دروازہ جس زور سے بجایا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کسی پل بھی دروازہ دہلیز سے الگ ہو جائے گا۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اٹھی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگی، اسے نہیں پتا تھا وہ کیا کرنے جا رہی ہے، اسے اپنی عزت کے ساتھ جان بھی بچانی تھی اور پھر چھت پر پہنچ کر اس نے ساتھ والوں کی چھت پر چھلانگ لگائی اور اس کے بعد اگلی چھت پر اس کی یہ حرکت بالکل بے اختیاری تھی۔ چھت کی دیواریں پھلانگنے پر اسے کافی چوٹیں لگی تھیں۔ دوپٹہ کہیں پیچھے رہ گیا تھا، لیکن اسے اس وقت کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے چھت کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

ٹی وی دیکھتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور اگلے ہی پل وہ یوں کھڑا ہوا جیسے صوفے میں اسپرنگ لگے ہوں۔ وہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"تم؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ نہ صرف باہر کا گیٹ بند تھا، بلکہ لاؤنج کا دروازہ بھی بند تھا۔

"تم کہاں سے آئی ہو؟" حسب عادت اسے دیکھ کر ہادی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ اس کے پوچھنے پر وہ ایک دم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ اب کے ہادی نے چونکنے کے بعد غور سے اسے دیکھا۔ اس کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ پاؤں سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں اس کے چہرے تک آئی تھیں۔ اس کا دوپٹہ بھی غائب تھا۔ اس پر اس کا یوں تڑپ تڑپ کر رونا۔ وہ بے ساختہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" ہادی کے پوچھنے پر اس کے رونے میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ہادی کو اب تشویش ہونے لگی

تھی۔

"زینب!" ہادی نے زبردستی اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تھے۔ زینب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور کچھ پل کے لیے نظریں اس چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔ ان نظروں کی تڑپ شاید ہادی نے بھی محسوس کرلی تھی، اسی لیے کچھ الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے اور آئی کیسے ہو؟" اس سے اس وقت بات نہیں ہو پا رہی تھی، اس نے انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"واٹ!" وہ چیخ پڑا۔ "چھت سے ہم میں لڑکیوں والی کوئی بات ہے یا نہیں؟" ہادی کو ایک بار پھر غصہ آگیا تھا۔ "عمارہ گھر پر نہیں ہے۔"

اس کے بتانے پر بھی وہ یوں ہی سر جھکائے کھڑی رہی تو ہادی کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"جو انسانوں والے کام ہیں وہ کیا کرو، کسی کے گھر جانے کے لیے دروازے استعمال ہوتے ہیں، چھت نہیں، آئندہ دھیان رکھنا۔ جاؤ گھر جاؤ اور حلیہ ٹھیک کروا لینا۔" ہادی نے اس پر نظر ڈالنے سے گریز کیا تھا۔

"سنا نہیں تم نے؟" اسے یوں ہی کھڑا دیکھ کر وہ زور سے بولا۔ زینب سہم کر رہ گئی۔

"امی گھر پر نہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

وہ سر جھکائے ہاتھ مسلتی ہوئی بولی۔ ہادی کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کی حالت اتنی قابل رحم ہو رہی تھی کہ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

"اس وقت گھر میں کوئی نہیں اور میرے دوست بھی آنے والے ہیں۔" ہادی نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"ہمارے گھر کوئی آگیا ہے۔" آخر کار اس نے روتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

ہادی نے نا سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"کون آگیا ہے؟" وہ کچھ نہیں بولی تھی تو وہ خود ہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا، جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دوپٹہ تھا جو یقیناً "عمارہ کا تھا۔ اس نے دوپٹہ اس کے کندھے پر رکھا اور اسے ساتھ چلنے کا کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ زینب نے بے چارگی سے اسے جاتے دیکھا۔ اس کے پاس اب جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اب اگر اس نے مزید کوئی بات کی تو وہ تھپڑ جڑ دے گا۔

وہ اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔ وہ تیزی سے ان کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ ہادی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا، جبکہ وہ حیرت کے مارے گنگ رہ گئی کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ دروازہ بند تھا۔ ہادی اندر چلا گیا تھا اور وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے آئی تھی۔ البتہ لاؤنج کا دروازہ بند تھا۔ ہادی اس کی طرف مڑا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا دروازے پر دھماکہ سا ہوا تھا اور ناظم کے ساتھ تین آدمی اور اندر داخل ہوئے تھے۔ جو اپنی وضع قطع سے غنڈے ہی لگ رہے تھے۔ زینب بھاگنے کے سے انداز میں ہادی کی طرف بڑھی تھی۔

"اچھا تو یہاں پہ رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں؟" ناظم کا انداز اتنا بے ہودہ تھا کہ ہادی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"ماں بھائی کو گھر سے بھیج کر پیچھے سے اپنے عاشق کو بلایا ہے۔" اس الزام پر وہ دونوں تڑپ اٹھے تھے۔ زینب تو رو پڑی تھی جبکہ ہادی بول اٹھا تھا۔

"یہ بکواس کر رہے ہو؟"

"شکر کرو، ابھی بکواس کر رہا ہوں، ورنہ ہاتھوں کی زبان استعمال کی تو یہاں تمہاری لاش ہی نظر آئے گی۔"

ہادی طیش کے عالم میں آگے بڑھا تھا۔ لیکن زینب نے تیزی سے اس کا بازو تھام کر اسے روکا تھا۔ ہادی نے ان ہی طیش بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا جو روتے ہوئے اسے منع کر رہی تھی۔ ہادی نے دوبارہ ان چاروں کی طرف دیکھا اور تب ہی اس کی نظریں کھلے گیٹ سے نظر آتے چہروں پر پڑیں۔ آواز سن کر باہر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ بالکل اچانک اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

"تمہیں تو میں کافی عرصے سے نوٹ کر رہا ہوں، جب بھی زینب سے ملنے اس کے آس پاس پائے جاتے ہو۔ چلو اب سمجھ میں آیا ہے۔"

وہ مکروہ انداز میں ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں تو جیسے اپنی اپنی جگہ پر بالکل منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ تب ہی ہجوم میں ہلچل ہوئی اور پھر جو چہرے نظر آئے انہوں نے ان دونوں کے ساکت وجود میں جان ڈال دی تھی۔ ثمینہ، حمیرا اور سمیر ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ ان تینوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آیئے چچی جان! آپ کا ہی انتظار تھا۔ آپ جو ہر وقت عزت کی دہائی دیتی ہیں، یہ دیکھیں اپنی بیٹی کو، آپ کے پیچھے آپ کی عزت کا جنازہ نکال رہی تھی۔ میں نے ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے، توبہ توبہ!" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"اتنا بڑا بہتان!" زینب منہ کھولے آنکھیں پھاڑے ناظم کو دیکھنے لگی۔ اسے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہوئیں۔ اگلے ہی پل وہ بے دم ہو کر زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ جبکہ ہادی چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ ناظم اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ہادی کے مکے پر وہ منہ تھام کر زمین پر بیٹھ گیا جبکہ اس کے تینوں ساتھیوں نے آگے بڑھ کر ہادی کو دبوچ لیا تھا۔ حمیرا اور ثمینہ کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور وہ دونوں ہادی کی طرف بڑھی تھیں۔ محلے کے لوگ جو باہر لطف اندوز ہو رہے تھے وہ بھی اندر آگئے۔ محلے کے لوگوں نے ان تینوں کو قابو پالیا تھا۔ حمیرا اور ثمینہ نے بھی ہادی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سمیر جو پریشانی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے زینب کی طرف دیکھا جو زمین پر سکڑی سمٹی ہوئی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کی طرف گیا اور اسے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

"تم نکل جاؤ میرے گھر سے اسی وقت۔ شرم آنی چاہیے تمہیں میری بیٹی پر ایسا الزام لگاتے ہوئے۔" حمیرا نے غصے سے ناظم نے دیکھا جو ہونٹوں سے نکلنے والے خون کو صاف کر رہا تھا۔

"شرم بھی مجھے آنی چاہیے، پوچھو اپنی بیٹی سے، یہ یہاں کیا کر رہا تھا، وہ بھی بند دروازے کے پیچھے، اکیلے گھر میں۔"

زینب نے زور سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس وقت شدت سے ایک خواہش نے دل میں جنم لیا تھا کہ بس اسی لمحے اس کی آنکھیں، کان، دل سب کام کرنا بند کردیں۔ لیکن وہ زندہ تھی۔ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔

"اسی لیے چچی تم زینب کی شادی مجھ سے نہیں کر رہی تھیں۔"

"تم نکل جاؤ میرے گھر سے۔" حمیرا کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"میں جواب لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" وہ زور سے بولا تھا اور حمیرا نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا تھا۔

"یہ ہے میرا جواب۔ میری بیٹی کیا ہے، میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اور یہ کیا ہے، وہ بھی میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" انہوں نے ہادی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے تھپڑ مار کر تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ اپنے گال کو سہلاتے ہوئے بدتمیزی سے بولا۔ "تمہاری بیٹی کو اتنا بدنام کروں گا کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہیں ہوگا اور تم خود ناک رگڑتی ہمارے در پر آؤ گی۔"

"تم جاتے ہو کہ بلاؤں پولیس کو۔"

"ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن پھر آؤں گا اور تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔"

جانے سے پہلے اس نے ہادی کو انگلی اٹھا کر دھمکی دی تھی۔ ثمینہ نے ہادی کو آگے بڑھتا دیکھ کر مضبوطی سے اس کا بازو تھاما تھا۔ وہ اپنے تینوں آدمیوں کے ساتھ باہر نکل گیا تھا اور لوگ بھی آہستہ آہستہ باہر نکل گئے تھے۔ وہ پانچوں بالکل خاموش تھے۔

"امی!" حمیرا جو ہادی اور ثمینہ کو دیکھ رہی تھیں۔ سمیر کی آواز پر چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ "باجی کو دیکھیں یہ بول نہیں رہیں۔"

وہ اس کا بازو ہلاتے ہوئے پریشانی سے بولا "ان تینوں

نے ایک ساتھ بے سدھ پڑی زینب کو دیکھا۔ ثمینہ نے آگے بڑھ کر زینب کی نبض دیکھی تھی۔

"میرا خیال ہے بے ہوش ہو گئی ہے۔" ثمینہ نے کہتے ہوئے بغور اس کے بازو کے زخموں کو دیکھا اور پھر ہادی کو جو زینب کو ہی دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ کے دیکھنے پر اس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور مزید کوئی بات کیے بغیر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ سب اتنے خاموش اور پریشان تھے جیسے وہ واقعہ زینب کے بجائے ان کے ساتھ رونما ہوا ہو۔

"کچھ لوگ اتنے گھٹیا ہوتے ہیں کہ ذلالت کی حد تک گر جاتے ہیں۔" پوری بات سن کر حشمت صاحب نے افسوس سے کہا تھا۔

"ویسے ہادی! تمہیں زینب کے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ جو خاموشی سے سب سن رہا تھا، چونک کر ثمینہ کو دیکھنے لگا۔

"کیوں؟" وجہ اس نے پوچھی تھی، لیکن یہ ہی کیوں سب کے چہروں پر تھا۔

"تم نے دیکھا نہیں تم اس نے کیسے تمہیں بھی لپیٹ میں لے لیا اور خدانخواستہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتے تو۔ جس قسم کے وہ آوارہ تھے ان کے پاس گن وغیرہ بھی ہو سکتی تھی۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں پرائی لڑائی میں ٹانگ اڑانے کا، جس طرح وہ اچانک پریشان حال میرے سامنے آئی تھی میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ ہی کرتا جو میں نے کیا۔ اس نے کہا گھر میں کوئی آ گیا ہے۔ میں سمجھا کوئی چور وغیرہ ہو گا، اب مجھے کیا پتا تھا۔" وہ قدرے بے زاری سے بولا تھا۔

"پھر بھی تمہیں اکیلے اس کے ساتھ گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔ ہمارے آنے تک اسے یہیں روک لیتے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں امی! میں اس وقت گھر پر اکیلا تھا۔ میرے دوست بھی آنے والے تھے اور اس کے اپنے گھر میں لگتا ہے ہنگامہ ہو گیا ہے۔ یہاں ہمارے گھر میں میرے ساتھ اسے کوئی دیکھ لیتا تو؟"

اس کی پیشانی پر شکنیں نمایاں ہونے لگی تھیں۔

"زینب تو بچپن سے ہی بے وقوف رہی ہے، اب بھلا ایسی بات تھی تو پولیس کو فون کر دیتی، لے کر ہمیں پھنسا دیا۔"

عمارہ نے افسوس سے ماں کو دیکھا۔

"پولیس کو بلا لیتی اور تماشا لگا لیتی۔ کیسی باتیں کر رہی ہو ثمینہ؟" حشمت صاحب کو بھی اب کے برا لگا تھا۔

"زینب بھی ہمارے لیے عمارہ کی طرح ہے، ایک تو وہ مشکل میں ہے اور تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔" وہ غصے میں کہہ کر کھڑے ہو گئے، جبکہ ثمینہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"کس کا فون تھا؟" ثمینہ کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر حشمت صاحب نے پوچھا۔

"وہ رشتہ کروانے والی کا۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"اس نے ایسا کیا کہہ دیا کہ آپ کا منہ ہی بگڑ گیا ہے۔" حشمت صاحب کے کہنے پر ہادی نے بھی مسکرا کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"وہ لوگ جو اس دن زینب کو پسند کر گئے تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا ہے۔" کھانا کھاتے سب کے ہاتھ رک گئے تھے۔

"ایک تو ان کے بیٹے کو دھمکی والے فون آ رہے ہیں۔ دوسرا وہ کہتے ہیں لڑکی کا کردار ٹھیک نہیں۔"

"تم نے انہیں بتایا نہیں کیا ہوا تھا۔"

"میں نے بتایا تھا سب کچھ، لیکن وہ کہہ رہی ہے وہ لوگ نہیں مان رہے۔" وہ کہہ کر پلیٹ پر جھک گئیں۔ باقی سب بھی خاموشی سے کھانا کھانے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"عمارہ!" اس نے چونک کر پیچھے دیکھا جہاں ہادی کھڑا تھا۔ "یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"ایسے ہی۔" وہ دوبارہ سیدھی ہو بیٹھی تو ہادی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کوئی پریشانی ہے؟" وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"میں زینب کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"کیوں؟ اس کے کزن نے دوبارہ کوئی حرکت کی ہے؟" ہادی نے چونک کر پوچھا تھا۔

"نہیں۔ ابھی تک تو اس نے کچھ نہیں کیا، لیکن اس سے کچھ بھی امید کی جا سکتی ہے۔ آنٹی بھی بہت پریشان ہیں اور کل انہوں نے پاپا سے بھی بات کی تھی۔ وہ ان کا گھر بکوا دیں۔" ہادی نے اب کی بار کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ عمارہ نے گردن گھما کر اس کا چہرہ دیکھا، وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔

"بھائی! آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں۔" وہ اب بھی سیدھا دیکھ رہا تھا۔

"آپ ارم کو کتنا پسند کرتے ہیں؟" ہادی کی نظریں بے ساختہ اس کی طرف گھومی تھیں۔

"یہ کیسا سوال ہے؟"

"آپ پلیز بتائیں نا!" عمارہ ضدی لہجے میں بولی تو وہ جھنجلا کر رہ گیا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"اگر آپ کی شادی ارم سے نہ ہو تو...؟"

"تو کیا ہو گا؟" وہ الٹا اس سے سوال کرنے لگا۔

"آپ کو دکھ نہیں ہو گا؟"

"دکھ کیوں ہو گا، میری کون سی اس سے بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ میں نے صرف اس کی تصویر دیکھی ہے اور نام سنا ہے بس۔"

"آپ میری ایک بات مانیں گے۔" ہادی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

بولو عمارہ کچھ دیر اس کا مسکراتا چہرہ دیکھتی رہی۔

"آپ زینب سے شادی کر لیں۔" اس نے ہادی کی مسکراہٹ سکڑتے دیکھی تو ایک پل کے لیے اس کی دھڑکن بھی سست پڑ گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ کو زینب پسند نہیں، لیکن بھائی! وہ بہت اچھی ہے۔ آپ نے کبھی اسے غور سے نہیں دیکھا نا، اس لیے آپ کو پتا نہیں، وہ بہت خوب صورت ہے۔"

"عمارہ پلیز۔" وہ اٹھنے لگا تھا جب عمارہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

"بھائی! یہ اس کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ بچپن سے اسے جانتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے وہ کیریکٹر لیس نہیں۔ لوگ اسے اس وجہ سے ریجیکٹ کر دیں کہ وہ کیریکٹر لیس ہے تو یہ غلط ہو گا اور آپ کو پتا ہے اس کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی لیا جانے لگا ہے۔"

ہادی نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

"بے قصور ہوتے ہوئے بھی آپ قصوروار کی فہرست میں شامل ہیں۔ میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہی کہ وہ میری دوست ہے، بلکہ اس لیے کہ مجھے یقین ہے، آپ اس کے ساتھ بہت خوش رہیں گے۔" اپنی بات ختم کر کے وہ رکی نہیں تھی، جبکہ ہادی ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

سڑک کے اس پار کھڑے دو لوگوں پر اسے اپنوں کا گمان ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار گاڑی کا رخ ان کی طرف کیا تھا۔ اس نے گاڑی بالکل ان کے قریب روکی تھی اور وہ دونوں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی تھیں۔

"السلام علیکم آنٹی!" گاڑی میں بیٹھے ہادی کو دیکھ کر حمیرا نے گہرا سانس لیا تھا۔

"آپ یہاں آنٹی!" اس کا اشارہ پیچھے نظر آتے کلینک کی طرف تھا۔

"ہاں۔ زینب کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ اسی کی دوائی لینے آئی تھی۔" ان کے جواب پر اس کی نظریں بالکل غیر ارادی انداز میں اس کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"آیئے آنٹی! آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا! ہم چلے جائیں گے۔" ہادی گاڑی سے

باہر آگیا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا۔

"میں بھی گھر جا رہا ہوں۔" وہ دروازہ کھولے ان کا منتظر تھا۔ اس نے ان کے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

"میں یہ دوائیاں لے آؤں۔"

"یہ مجھے دیں' آپ بیٹھیں۔" اس نے پرچی ان کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ وہ دوائیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ میڈیکل اسٹور سے باہر سڑک کا منظر بالکل صاف تھا' اپنی گاڑی پر اس نے بالکل سرسری نظر ڈالی تھی اور اسی دوران ایک گاڑی نے پورے زور سے اس کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ حیرت کے مارے پہلے تو وہ ہل ہی نہیں سکا۔ لیکن اگلے ہی پل دوسری گاڑی سے بڑی تیزی سے دو آدمی نکلے تھے' جن کے ہاتھ میں بیٹ تھے اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے گاڑی کے پچھلے شیشے توڑ ڈالے' جہاں زینب اور حمیرا بیٹھے تھے۔ وہ ایک پل ضائع کیے بغیر گاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ لوگوں کا ہجوم تیزی سے جمع ہوا تھا۔ اس لیے اس کے پہنچنے تک وہ لوگ بھاگ گئے تھے۔ اس نے سب سے پہلے گاڑی کے اندر جھانک کر ان دونوں کے خیریت سے ہونے کی تصدیق کی تھی۔ زینب سہمی ہوئی حمیرا کے پہلو سے لگی تھی۔

"آپ لوگ' پلیز ہٹیں۔" اس نے لوگوں کو وہاں سے ہٹانا شروع کیا تھا۔

"آنٹی! آپ ٹھیک ہیں؟" ہادی نے کھڑکی میں جھک کر پوچھا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے سر ہلایا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور تک گیا تھا' جب حمیرا نے اسے گاڑی روکنے کو کہا تھا۔ اس نے گاڑی روک کر حیرت سے پیچھے دیکھا۔

"بیٹا! میں آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ میں تم سے جو کہنے جا رہی ہوں' میں اس کے لیے شرمندہ ہوں' لیکن اسی میں بہتری ہے۔ آج جو ہوا مجھے یا آپ کو اندازہ لگانے کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ کس نے کیا۔ یقیناً" یہ کام ناظم کا ہے۔ اس کی دشمنی ہمارے ساتھ ہے۔ میں نہیں چاہتی' ہماری وجہ سے آپ کو کچھ ہو' اگر آج آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں آپ کے امی' پاپا کو کیا جواب دیتی۔ پہلے ہی ان کے ہم پر بہت احسان ہیں۔"

"لیکن آنٹی...." وہ پریشانی سے بولا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا! مجھے آپ کی نیت پر کوئی شک نہیں۔ مجھے جتنا یقین زینب پر ہے' اتنا ہی آپ پر ہے' لیکن بہت بدنامی ہو چکی ہے۔ لوگ آپ کو اور زینب کو ایک ساتھ دیکھیں گے تو انہیں اور بات کرنے کا موقع ملے گا۔ میں انہیں مزید کوئی موقع نہیں دینا چاہتی' آپ ہمیں یہیں اتار دیں۔" کہتے کے ساتھ ہی حمیرا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئیں۔

ہادی کی نظریں زینب کی طرف اٹھی تھیں' اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ جبکہ آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔ وہ بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔

ہادی نے گہرا سانس لیا اور باہر نکل آیا۔ اس نے پہلے رکشا روکا' اسے ایڈریس سمجھایا اور دوبارہ ان کی طرف پلٹا۔

"میں نے رکشے والے کو ایڈریس سمجھا دیا ہے۔" حمیرا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو آنکھیں بے ساختہ نم ہوئی تھیں اور ان کا ہاتھ اس کے کندھے پر ٹک گیا تھا۔

"میری بات کا برا مت ماننا بیٹا! میں مجبور ہوں۔ دنیا خلوص کو نہیں سمجھتی' رشتے کی سند مانگتی ہے۔ وہ میں انہیں نہیں دے سکتی۔"

اس کے کندھے پر ان کے ہاتھ کا دباؤ ایک پل کے لیے بڑھا تھا اور پھر وہ رکشا کی طرف بڑھ گئیں۔ اس نے زینب کو اپنے قریب رکتے دیکھا تھا' لیکن اس نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ رکشا اسٹارٹ ہوا اور پھر چلا بھی گیا اور وہ کتنی دیر تک چلتی ہوئی ٹریفک کو دیکھتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"لو ہادی بھی آگیا۔" اسے دیکھ کر حشمت صاحب مسکرائے تو وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا اور پھر عالیہ اور ثمینہ کو دیکھا جو معمول سے ہٹ کر تیار تھیں۔

"آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟"

"تمہارے ہونے والے سسرال جا رہے ہیں۔" عالیہ نے شرارت سے اسے دیکھا تو وہ ثمینہ کو دیکھنے لگا۔

"ہم ارم کی طرف جا رہے ہیں' تمہارا کیا خیال ہے بات پکی کر آئیں؟"

"آپ کو وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا' عمارہ جو اکتائے ہوئے انداز میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ سب کے ساتھ وہ بھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں؟" ثمینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیونکہ مجھے وہاں شادی نہیں کرنی۔" کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سب گڑبڑا کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے تھے۔ وہ جب باہر آیا تو خود کو ہر طرح کے سوالوں کے لیے تیار کر چکا تھا۔ لہٰذا آکر بڑے مطمئن انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"تمہارے اس فیصلے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" ثمینہ کو اچھا خاصا برا لگا تھا۔

"ہم تم سے پوچھ کر گئے تھے نا؟" عالیہ نے جیسے اسے یاد کروایا تھا۔

"ہاں تو کیا مصیبت ہو گئی' کون سا منگنی یا نکاح ہو گیا تھا۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

اچانک اس فیصلے کو بدلنے کی وجہ؟ کیا کوئی اور لڑکی ہے؟" عالیہ کے پوچھنے پر اس نے باری باری سب کا چہرہ دیکھا۔ اسے پتا تھا اب جو وہ کہنے والا ہے وہ سب کے لیے دھماکے سے کم نہیں ہوگا۔

"میں زینب سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"زینب!" انہوں نے حیرت سے زینب کا نام دہرایا تھا۔ "زینب کہاں سے آگئی بیچ میں؟"

"آپ نے پوچھا' میں نے بتا دیا' بات ختم۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"بات ختم نہیں ہوئی ہادی!" وہ ایک دم اس کے سامنے آگئی تھیں۔ "اس کا مطلب ہے جو لوگ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں لوگ؟" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"اس دن اس کا کزن جو تم پر اور اس پر الزام لگا کر گیا ہے۔"

"آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"میں شک نہیں کر رہی' لیکن زینب کا نام لے کر تم لوگوں کے شک کو یقین میں بدل رہے ہو۔"

"مجھے فرق نہیں پڑتا۔ لوگ کیا سوچتے ہیں' میرے لیے اہم یہ ہے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔"

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ ثمینہ پیچھے سے چیختی رہ گئی تھیں۔

"ثمینہ!" کب سے خاموشی سے ماں' بیٹے کو دیکھتے حشمت صاحب بول اٹھے تھے۔

"آپ دیکھ رہے ہیں۔" انہوں نے بڑی بے بسی سے شوہر کو دیکھا۔

"ہاں دیکھا بھی اور سنا بھی۔ تم خود کو کمپوز کرو' میں ہادی سے بات کرتا ہوں۔ عمارہ! ماں کو پانی پلاؤ۔" عمارہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔ اس سے گلاس لیتے ہوئے جس طرح ثمینہ نے اسے دیکھا تھا وہ نظریں چرا گئی تھی۔

"ہادی کو یہ پٹی تم نے پڑھائی ہے؟" ان کا لہجہ بہت سخت تھا۔

"میں نے بھائی سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور آپ جانتی ہیں' وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔" دل میں وہ بے حد خوش تھی' لیکن بظاہر وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"امی! آپ یوں غصہ کیوں کر رہی ہیں۔ ہادی نے ایسا غلط کیا کہہ دیا۔ زینب بہت اچھی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں یہ خیال ہمیں کیوں نہیں آیا۔"

عالیہ نے عمارہ کو دیکھ کر کہا تو وہ جوش میں آکر کچھ

بولنے لگی تھی۔ لیکن ماں کے جارحانہ تیور دیکھ کر خاموش رہ گئی۔

"تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے۔"

"امی! کیا آپ کو بھی لگتا ہے زینب میں خرابی ہے؟"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ جھنجلا کر بولیں۔

"تو پھر کیا لوگوں کا سوچ رہی ہیں؟"

"تو کیا نہیں سوچنا چاہیے؟" وہ الٹا اس سے سوال کرنے لگیں۔

"نہیں سوچنا چاہیے۔ ہادی نے خود زینب کا نام لیا ہے تو اس کا مطلب ہے اس میں اس کی خوشی ہے اور ہم نے اپنے بھائی کی خوشی دیکھنی ہے۔ محلے والوں کی نہیں۔" عالیہ کے دوٹوک انداز پر عمارہ اسے دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھے تو اس رشتے میں خوشی سے زیادہ مجبوری نظر آرہی ہے۔"

"کیسی مجبوری؟" عالیہ کے پوچھنے پر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس اٹھ کر چلی گئی تھیں۔

"تمہیں بھی کوئی اعتراض ہے؟" اس کی خاموشی پر عالیہ کو پوچھنا پڑا تھا۔

"میں تو سب سے زیادہ خوش ہوں۔" عمارہ کہتے کے ساتھ ہی بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا' جب حشمت صاحب اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ نارمل انداز میں شیشے کے آگے کھڑے ہو کر ٹائی باندھنے لگا' جانتا تھا وہ کیا بات کرنے آئے ہیں۔

"کل تم نے جو بات کی تھی کیا تم سیریس ہو؟" ہادی نے شیشے میں نظر آتے ان کے عکس کو دیکھا اور پھر پوری طرح ان کی طرف گھوم گیا۔

"پاپا! آپ کو کیا لگتا ہے میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ہے اور میں مذاق کروں گا۔"

"لیکن اچانک اس فیصلے کی وجہ؟"

ہادی نے گہرا سانس لیا۔ "پاپا! میں خود نہیں جانتا اور میں سمجھتا ہوں میری اس بات سے سب کو شاک لگا ہے' لیکن میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہے۔ انجانے میں ہی سہی' لیکن زینب پر جو الزام لگایا گیا ہے اس میں میرا نام شامل ہے اور میں نہیں چاہتا ایک نیک لڑکی میری وجہ سے بدنام ہو۔"

"زینب کی مدد کرنے کا یہ آخری طریقہ تو نہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہے' آپ کے نزدیک کوئی دوسرا حل ہو تو آپ بتا دیں۔" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تو وہ مسکرا دیے۔

"اسے میں ہمدردی سمجھوں یا ترس؟"

"استغفراللہ!" وہ بے ساختہ بولا تھا۔

"ترس کھانے کی کوئی وجہ بتا دیں؟"

"چلو مان لیا ترس کھانے والی کوئی وجہ نہیں' لیکن تمہاری اس سے چڑ تو بھی سب جانتے ہیں۔ اتنی ناپسندیدگی کے باوجود شادی... کہیں کوئی اور بات تو نہیں؟" ان کا لہجہ اچانک شوخ ہو گیا تھا تو وہ جھکے سر کے ساتھ مسکرا دیا۔

"میں خود بھی نہیں جانتا پاپا!" وہ بہت دھیمی آواز میں بولا تھا' پھر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"اس بات کو چھوڑیں۔ آپ امی کو سمجھائیں۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" جانے سے پہلے وہ اس کے قریب آئے تھے۔

"آئی ایم پراوڈ آف یو۔" ان کے کہنے پر وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

حشمت صاحب' ثمینہ' عالیہ اور عمارہ کا ایک ساتھ ان کے گھر آنا اس کے لیے حیران کن تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات وہ تھی جس کے لیے وہ آئے تھے۔

پہلی بات جو اس کے ذہن میں آئی تھی وہ یہ تھی کہ کیا معجزے آج کی دنیا میں بھی ہوتے ہیں۔ حمیرا کو جس قدر خوشی ہوئی تھی' وہ ان کے چہرے سے ظاہر

ہو رہی تھی۔ لیکن انہوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ اصولاً تو اسے بہت خوش ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس پرپوزل کے پیچھے محبت نہیں تھی۔ یہ وہ جانتی تھی۔ ہادی نے اس پر ترس کھایا' اس کی ساری خوشی جیسے اس خیال کے پیچھے زائل ہو کر رہ گئی۔ وہ جب کمرے سے باہر نکلی تو حمیرا فون کا ریسیور تھامے بالکل ساکت کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ وہ پریشان ہو کر ان کے قریب آئی تھی۔

"امی!" اس کے پکارنے پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا اور ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" وہ پریشانی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"ناظم کو کسی نے گولی مار دی۔" حیرت کے مارے اس کا منہ ایک پل کے لیے کھلا تھا' پھر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ کسی کی موت پر خوش ہونا بہت بری بات ہے۔ لیکن اس کے دل کو ایک گونہ سکون ملا تھا' ایسے لگا جیسے اسے بہت بڑے عذاب سے نجات ملی ہو۔

"لیکن کیسے؟" وہ صرف اتنی ہی پوچھ پائی تھی۔

"اچھا تو وہ تھا ہی نہیں' کئی لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ معصوم کو تنگ کرو تو سزا تو ملتی ہے نا!" انہوں نے اسے دیکھا۔

"تمہارے تایا بہت رو رہے تھے اور معافی بھی مانگ رہے تھے۔" وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"شام کو جنازہ ہے۔" "آپ جائیں گی؟"

"ہاں' اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" ان کے کہنے پر وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

حمیرا اور سمیر' تایا جی کی طرف گئے تھے۔ جاتے ہوئے وہ اسے عمارہ کو بلانے کی تاکید کر گئی تھیں۔ فون کے پاس کھڑی ہو کر وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ہادی اس وقت گھر میں ہی ہوتا تھا۔ ضروری تو نہیں وہ ہی فون اٹھائے اس نے خود کو تسلی دی نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور ہر بیل کے ساتھ اس کی گھبراہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

"ہیلو۔" ہادی کی آواز اسپیکر سے ابھری تو بڑے بے ساختہ انداز میں اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا تھا اور تھوک نگل کر فون کو دیکھا۔

"حد ہوتی ہے زینب! وہ ملک الموت تو ہے نہیں کہ تو فون میں سے نکل کر تمہاری جان نکال لیں۔" اس نے خود کو تسلی دے کر دوبارہ ری ڈائل کیا تھا۔

اب کی بار پہلی بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا تھا۔ اس نے ہیلو نہیں کہا تھا تو دوسری طرف بھی مکمل خاموشی تھی۔ ایک پل کے لیے وہ کنفیوز ہو کر رہ گئی۔

"ہیلو۔" وہ مری مری آواز میں بولی۔

"فرمایئے۔" "اتنا احترام؟ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

"عمارہ!"

"جی نہیں میں ہادی بات کر رہا ہوں۔"

"عمارہ سے بات کرنی ہے۔"

"کیوں؟"

زینب نے فون کان سے ہٹا کر آنکھوں کے سامنے کیا اور پھر دوبارہ کان سے لگا کر عمارہ کے نام کی دہائی دی۔

"عمارہ! تمہاری دوست کا فون ہے۔" اس کی اونچی آواز اسے فون سے صاف سنائی دی تھی۔

"کون ہے بھائی؟" وہ شاید روٹیاں پکا رہی تھی اسی طرح بھرے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کچن سے برآمد ہوئی۔

"کتنی دوستیں ہیں تمہاری؟" ہادی نے الٹا اس سے سوال کیا تھا تو وہ چلتی ہوئی فون کے قریب آگئی۔ ہادی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اسپیکر کا بٹن آن کر کے اسے بات کرنے کو کہا۔

"ہیلو عمارہ!"

"ہاں زینب! بولو۔" عمارہ نے مڑ کر ہادی کو دیکھا۔
"تم اس وقت گھر آ سکتی ہو۔" ہادی اور عمارہ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
"خیریت؟" "ہاں وہ امی اور سمیر گھر پر نہیں۔ امی نے کہا تمہیں بلا لوں۔"
"اچھا آتی ہوں لیکن آنٹی اتنی رات کو کہاں گئی ہیں؟"
"وہ... وہ ایک پل کے لیے رکی تھی۔" "وہ ناظم بھائی کی ڈیتھ ہو گئی۔"
"کیا؟" عمارہ حیرت سے چیخی تھی۔ "کیسے؟"
"گولی لگی تھی۔"
عمارہ نے گہرا سانس لیا۔ "اچھا میں آتی ہوں۔" ہادی نے بٹن آف کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ہاتھ دھو کر جب واپس آئی تو ہادی گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔
"چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔" اس کے کہنے پر عمارہ ہنس پڑی تھی۔
"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" ہادی نے گھور کر اسے دیکھا۔
"میں آج پہلی بار تو زینب کے گھر نہیں جا رہی اور یہ ایک گھر چھوڑ کر اس کا گھر ہے۔"
"رات کا وقت ہے۔" ہادی نے لاپروائی سے جواب دیا۔
بیل ساتھ ہی گیٹ کھل گیا جس تیزی سے گیٹ کھلا تھا ہادی کو دیکھ کر وہ اتنی تیزی سے پیچھے ہٹی تھی۔ اس کے یوں پیچھے ہٹنے پر ہادی اور عمارہ دونوں مسکرائے تھے۔ ہادی واپس مڑ گیا تھا جبکہ عمارہ اندر آ گئی تھی۔
"تم ایسے کیوں شرما رہی ہو۔ بھائی سے ابھی سے پردہ شروع کر دیا۔" عمارہ کے شرارتی انداز پر وہ جھینپ کر مسکرا دی تھی۔

ٹی وی دیکھتے ہوئے عمارہ اس سے باتیں کرتی رہی۔ زینب انتظار ہی کرتی رہی کہ وہ ہادی کے بارے میں اس کے پرپوزل کے بارے میں کوئی بات کرے لیکن اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تو اسے خود ہی پوچھنا پڑا۔
"ہادی بھائی نے میرے لیے پرپوزل کیوں بھیجا؟" اس اچانک سوال پر عمارہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔
"کیا تم نے انہیں کچھ کہا تھا؟"
"میں نے انہیں کچھ نہیں کہا اور فرض کرو اگر کہا بھی ہوتا تو کیا صرف میرے کہنے سے وہ تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتے؟"
"تو پھر وہ مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں؟" اس کی آواز کے ساتھ چہرے سے بھی الجھن چھلکنے لگی تھی۔
"تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" عمارہ کے کھوجتے لہجے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
"میری خوش قسمتی ہے کہ میری شادی ایک آئیڈیل انسان سے ہو رہی ہے۔ لیکن عمارہ! شادی میں محبت کا ہونا بہت ضروری ہے جبکہ یہ صرف کمپرومائز ہے۔ میں بچپن سے انہیں جانتی ہوں اور بڑی اچھی طرح جانتی ہوں انہیں میں پسند نہیں تھی۔ پھر اچانک اتنا بڑا فیصلہ...!!"
وہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی پھر کچھ دیر بعد خود ہی بول پڑی۔
"میں جانتی ہوں صرف مجھے بدنامی سے بچانے کے لیے۔ لیکن جس سے مجھے خطرہ تھا اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ اگر وہ چاہیں تو اس کمپرومائز کو ختم کر سکتے ہیں۔ مجھے بالکل برا نہیں لگے گا۔"
"تمہارا پیغام پہنچا دوں گی لیکن مجھے ایک بات بتاؤ۔" عمارہ جو کب سے اس کی تقریر سن رہی تھی غصہ سے بولی "جہاں تک پسند ناپسند کی بات ہے تو تم بھی بھائی کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ پھر تم نے کیوں کہا تھا کہ ہادی بھائی سے کہو مجھ سے شادی کر لیں۔ وہ کمپرومائز

نہیں تھا؟"

زینب کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا تھا۔

"نہیں وہ میں نے کسی دباؤ میں نہیں بلکہ دل سے کہا تھا۔" عمارہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"مطلب؟"

"میں واقعی ان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔" وہ سر جھکائے انگلیوں کو ایک دوسرے میں الجھائے دھیمی آواز میں بولی تھی۔ عمارہ نے بے ساختہ اپنے بال نوچ لیے تھے۔

"یا خدا! ہم لوگ بے وقوف تھے یا تم دونوں مل کر ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔ سچ سچ بتاؤ کب سے یہ چکر چل رہا ہے؟" عمارہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر اس کے سر پر کھڑی ہو گئی۔

"قسم لے لو کوئی چکر نہیں۔ یہ تو میری اپنی فیلنگز ہیں۔ ہادی بھائی کو تو پتا بھی نہیں۔"

"میں اب کسی کا اعتبار نہیں کر سکتی تم دونوں گھنے میسنے۔"

عمارہ غصے سے لیفٹ رائٹ کرنے لگی تھی۔

زینب نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ تب ہی باہر بیل ہوئی۔ زینب عمارہ کو ایک نظر دیکھ کر باہر نکل گئی۔ جہاں حمیرا اور سمیر کھڑے تھے۔ عمارہ کچھ دیر حمیرا سے باتیں کرتی رہی۔

"عمارہ! ہادی سے کہنا اس کے پاس ٹائم ہو تو مجھ سے ملے۔" حمیرا کے کہنے پر اس نے سر ہلا دیا۔

زینب سب کچھ کلیئر کرنا چاہتی تھی لیکن اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہ چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" عمارہ کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور دوبارہ چولہے کی طرف مڑ گیا۔

"چائے بنا رہا ہوں۔"

"اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں۔" عمارہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آفس کا کام کر رہا تھا اور تم کیوں ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ اب فریج سے اپنے لیے جوس نکال رہی تھی۔

"بھائی آپ سے ایک بات پوچھوں؟" ساس پین کو ہلاتا اس کا ہاتھ ایک پل کے لیے رکا تھا اور وہ سنجیدہ نظروں سے عمارہ کو دیکھنے لگا۔

"آپ زینب سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟" ہادی نے گہرا سانس لیا تھا۔

"مجھے پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے اس لیے۔" وہ جل کر بولا تھا۔ اس کے انداز پر عمارہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"جس کو دیکھو یہی سوال کر رہا ہے۔ میں کیا دنیا سے نرالی شادی کر رہا ہوں۔" وہ اپنا مگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"بات شادی کی نہیں زینب سے شادی کی ہے۔"

"کیوں زینب انسان نہیں یا میں انسان نہیں اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے ہی مجھے زینب سے شادی کا مشورہ دیا تھا۔"

وہ کپ کاؤنٹر پر رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"جی مجھے یاد ہے۔ میں نے لگتی ہوش و حواس میں آپ کو یہ مشورہ دیا تھا۔ لیکن یہ سوال آپ کی ہونے والی بیوی نے پوچھا ہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"اسے لگتا ہے آپ ترس کھا کر اس سے شادی کر رہے ہیں۔" ہادی کا جھنجلایا ہوا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اور اس نے آپ کے لیے میسج بھی دیا ہے کہ جس شخص سے بچانے کے لیے آپ اس سے شادی کر رہے تھے وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں رہا شادی کا رشتہ محبت کا رشتہ ہوتا ہے اور وہ تو آپ اس سے کرتے نہیں اس لیے اگر آپ چاہیں تو یہ رشتہ ختم کر سکتے ہیں۔ اسے برا نہیں لگے گا۔"

عمارہ نے کہہ کر جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا کیونکہ ہادی کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

اور اسے بہت زور کی ہنسی آ رہی تھی۔

"ساری دنیا کو اس رشتے کی خبر ہو گئی ہے۔ شادی کی شاپنگ ہو رہی ہے۔ اسے اب ہوش آیا ہے۔"

وہ جب بولا تو اس کا لہجہ میں غصہ تھا۔ عمارہ جوس کے سپ لیتے ہوئے اسے دیکھتی رہی جس کی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"میری طرف سے اسے تم میسج دے دینا۔ میری فکر کرنے کی اسے ضرورت نہیں ہاں اگر اسے یہ رشتہ بوجھ لگ رہا ہے تو وہ ختم کر سکتی ہے۔ مجھے برا نہیں لگے گا۔" کہہ کر وہ ایک بار پھر چائے گرم کرنے لگا۔

"اسے تو آپ کی فکر ہے ورنہ اسے کیوں بوجھ لگے گا وہ تو آپ سے محبت کرتی ہے۔"

اس کا جوس ختم ہو گیا تھا اور جو پیغام اس نے دینا تھا وہ بھی دے چکی تھی اس لیے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن ہادی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کچھ بھی تو نہیں۔" عمارہ ایک دم انجان بن گئی۔

"عمارہ! جلدی بولو ورنہ..." اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کہے۔

"پہلے آپ وعدہ کریں آپ مجھے شادی پر گولڈ کی رنگ گفٹ کریں گے۔"

"نہ دیدی! لے لینا اب بولو۔"

"بھائی! اب میری سمجھ میں آ رہا ہے آپ نے زینب سے شادی کے لیے ہاں کیوں کی۔" عمارہ نے شرارتی انداز میں ہادی کا چہرہ دیکھا تو ہادی کو اچانک اپنے بے اختیار رویے کا احساس ہوا۔ "آپ بھی زینب کو پسند کرتے ہیں۔"

اس کا انداز اتنا پُریقین تھا کہ ہادی بھی حیران رہ گیا وہ ایک دم خاموش ہو کر کاؤنٹر کی طرف مڑ گیا۔

"بھائی! وہ نہیں جانتی کہ آپ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ اب یہ بات آپ نے اسے بتانی ہے۔ اور آنٹی نے کہا تھا۔ آپ کے پاس ٹائم ہو تو ان سے مل لیں۔"

وہ کہہ کر چلی گئی تھی جبکہ وہ کتنی دیر ابل ابل کر کالی ہوتی چائے کو دیکھتا رہا اور پھر مسکرا کر چولہا بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

صبح سے موسم بہت اچھا تھا اور شاید موسم کا ہی اثر تھا کہ اس کا اپنا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ حمیرا بازار سے تھکی ہوئی آئی تھیں اور اب لیٹی ہوئی تھیں وہ چھت پر آ گئی جہاں سمیر، شانی اور سدرہ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔

وہ تینوں اسے بھی کھیلنے کے لیے بلا رہے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ڈور بیل کی آواز پر سمیر نے نیچے جھانکا اور ساتھ ہی ہادی بھائی کا نعرہ لگا کر نیچے کی طرف بھاگا تھا۔ ہادی کے نام پر اس کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی تھی۔ اس کی اچانک آمد نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

کل اس نے عمارہ کو جو پیغام دیا تھا۔ آمد اس پیغام کا جواب تو نہیں تھی؟ اس نے تھوک نگل کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ تب ہی سمیر دوبارہ تیزی سے اوپر آیا تھا۔

"خیریت ہے؟" اس نے کھوجتی نظروں سے سمیر کا چہرہ دیکھا۔

"وہ امی سے ملنے آئے ہیں۔" سمیر کہہ کر پھر شانی اور سدرہ کے ساتھ کھیلنے لگا جب وہ وہیں کھڑی رہی۔ نیچے جانے کی اس میں بالکل بھی ہمت نہیں تھی۔

"السلام علیکم آنٹی!" انہیں دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

"عمارہ کہہ رہی تھی۔ آپ نے مجھ سے کوئی بات کرنی ہے؟" انہیں خاموش دیکھ کر اس نے خود ہی بات شروع کی تھی۔

"ہادی بیٹا! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ میں شاید مر کر بھی ادا نہ کر سکوں۔" ان کا لہجہ بھیگ سا گیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آنٹی! میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔" ان کے دل گیر انداز پر اسے

تکلیف ہوئی تھی۔ "میں اپنے اس دن کے رویے پر بھی بہت شرمندہ ہوں لیکن میں کیا کرتی میں اکیلی عورت اس دنیا کی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ نے زینب کو اپنے نام اور ساتھ کا جو مان دیا ہے میں بتا نہیں سکتی کہ۔" آنسوؤں کا غلبہ اتنا تھا کہ وہ بات پوری نہ کر سکیں۔

"پلیز آنٹی!" اس نے انہیں اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ "میں ہر بات کو سمجھتا ہوں آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ دنیا رشتوں کی سند مانگتی ہے۔ میں نے انہیں سند فراہم کردی ہے۔ اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کا مہربان چہرہ دیکھ کر مسکرا دیں۔

"آپ خوش ہیں نا؟"

"جی!" ان کے پوچھنے پر وہ دل سے مسکرایا تھا۔ "آپ نے زینب سے۔"

"آنٹی پلیز۔" اس نے بے اختیار انہیں ٹوکا تھا یہ سوال تو اس کے ساتھ جڑ کر رہ گیا تھا۔

"آنٹی! یہ مت پوچھیے گا کہ میں زینب سے یہ شادی کیوں کر رہا ہوں۔" وہ یہی سوال پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ باقی لفظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے۔

"ہماری قسمت میں ایک دوسرے کا ساتھ لکھا تھا۔ وسیلہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو بنا دیا بس۔" حمیرا کتنی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں، انہیں اپنی بیٹی کے نصیب پر رشک آیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔" ان کے دل سے بے ساختہ اس کے لیے دعا نکلی تھی۔

"آپ بیٹھو میں آپ کے لیے شربت لاتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی ابھی مجھے شادی کے کارڈ کلیکٹ کرنے جانا ہے ہال کی پے منٹ کرنی ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ ہاں اگر آپ نے کھیر بنائی ہے تو وہ کھلا دیں۔ آپ کے ہاتھ کی کھیر مجھے بہت پسند ہے۔"

حمیرا بے اختیار خوش ہو گئی تھیں۔ "ضرور بیٹا! میں کل ہی بنا کر آپ کو کھلاتی ہوں۔"

"آنٹی! ذرا شانی اور سدرہ کو بلا دیں۔" حمیرا نے دو تین دفعہ آواز دی لیکن کوئی نیچے نہیں اترا تھا۔

"آپ رہنے دیں آنٹی! میں خود انہیں لے آتا ہوں۔" انہیں سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر اس نے روک دیا۔ وہ آخری سیڑھی پر پہنچ کر رک گیا۔ دروازے کے بالکل قریب دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے یقیناً "وہی" تھی۔ اس کے قریب پہنچنے پر وہ زور سے کھنکھارا تھا اور وہ جو اپنے دھیان میں تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر اتنی حیران ہوئی کہ نظریں بھی نہیں ہٹا سکی۔

"السلام علیکم۔" اس نے سلام کیا تو وہ شرمندہ ہو کر نظریں جھکا گئی۔

"سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ بہت آہستگی سے بولی تھی۔ ایک پل کے لیے رک کر اس نے بات کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ بدل کر آگے بڑھ گیا۔

"ہادی بھائی! ایک دور ہو جائے۔" سمیر بیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یار! میں ضرور کھیلتا لیکن ابھی مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے پھر کسی دن۔" اس نے مسکرا کر سمیر کے بالوں کو بکھیرا۔

"چلو تم دونوں، تمہاری ماما بلا رہی تھی۔" اس نے دونوں بچوں سے کہا لیکن ان کا موڈ ابھی مزید کھیلنے کا تھا۔ ہادی نے ایک نظر ان دونوں کو بھاگتے دیکھا اور اگلے ہی پل آگے بڑھ کر شانی اور سدرہ کو دبوچ لیا وہ وہیں کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔

"خالہ!" وہ دونوں اس کے قریب آنے پر چیخنے لگے تھے۔

"یہ خالہ نہیں ممانی ہے آپ کی۔" اس کے بالکل قریب کھڑے ہو کر اس نے ان دونوں سے کہا تھا جبکہ نظریں اسی پر تھیں۔ زینب ہونقوں کی طرح منہ اٹھا کر ہادی کو دیکھنے لگی۔

"ممانی کیوں؟" شانی نے پہلے سوال کیا تھا۔

"میں کون ہوں" وہ شانی سے پوچھ رہا تھا۔

"ماموں۔" وہ بولا۔

"تو بیٹا! یہ آپ کے ماموں کی دلہن ہیں۔ اگر آپ انہیں خالہ کہو گے تو ماموں کے ساتھ ان کا رشتہ خراب ہو جائے گا۔"

بچے پتا نہیں سمجھے تھے یا نہیں البتہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر نیچے کی طرف بھاگی تھی۔

وہ جب لاؤنج میں داخل ہوا۔ اندر ثمینہ اور عالیہ بیٹھے تھے۔

"کتنی دیر لگا دی تم دونوں نے؟" ان دونوں کو ہادی کے ساتھ آتا دیکھ کر عالیہ نے پوچھا۔

"اور حلیہ دیکھو کیا بنایا ہوا ہے۔" اس نے غصہ سے ان دونوں کے گندے کپڑے دیکھے۔

"بھائی آپ فارغ ہیں؟" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جب عمارہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"کیوں؟" "وہ مجھے اپنے اور زینب کے کپڑے لینے ٹیلر کے پاس جانا ہے اور مجھے اور آپی کو جیولر کے پاس بھی جانا ہے۔" ہادی نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی کام سے جانا ہے۔"

"بھائی پلیز مجھے اور آپی کو بازار اتار کر آپ اپنے کام پر چلیں جائیں اور بعد میں ہمیں پک کر لیں۔" اس کے کہنے پر اس نے سر ہلا دیا تو عمارہ لاؤنج میں آ گئی۔

"چلیں آپی! بھائی چل رہے ہیں امی! آپ چلیں گی؟" اس نے ٹی وی دیکھتی ثمینہ سے پوچھا تو انہوں نے سر نفی میں ہلا دیا۔ عمارہ نے شکایتی نظروں سے عالیہ کو دیکھا جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے اسے مزید بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔

"شانی! زینب خالہ کیا کر رہی تھیں؟" عمارہ نے کیلا کھاتے شانی سے پوچھا۔

"خالہ نہیں ممانی۔ ان کا نام زینب ممانی ہے۔"

"ہیں۔" شانی کے کہنے پر عالیہ اور عمارہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے جبکہ لاپروائی کا مظاہرہ کرتی ثمینہ بھی چونک کر اسے دیکھنے لگیں جبکہ لاؤنج کی طرف آتے ہادی نے بے ساختہ اپنا ماتھا پیٹا۔

"آپ کو کس نے کہا ایسا کہنے کو؟" عالیہ نے مسکرا کر شانی سے پوچھا۔

"ماموں نے کہا وہ ان کی دلہن ہیں۔"

"اچھا۔" اسے عالیہ کی معنی خیز آواز سنائی دی تھی۔ وہ دل کڑا کر لاؤنج میں آ گیا تھا۔

"جلدی چلو دیر ہو رہی ہے۔" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔

"ہادی! ذرا رکو تو۔" عالیہ کی آواز پر وہ نا چاہتے ہوئے بھی رکا تھا۔ عالیہ اور عمارہ دونوں اس کی طرف بڑھیں۔

ثمینہ کی نظریں ان تینوں کے کھلکھلاتے چہروں پر تھیں۔ وہ ان سے اتنے فاصلے پر تھے کہ وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو تو نہیں سن سکتی تھیں لیکن اندازہ کر سکتی تھیں۔ ہادی کی خوشی کا۔

ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی۔ اس وقت کا انہیں کب سے انتظار تھا لیکن وہ ہادی سے ناراض تھیں۔ انہیں لگتا تھا۔ اس نے مجبوری میں یہ رشتہ کیا ہے۔ لیکن مجبوری چہرے کو ایسا روشن تو نہیں کرتی صرف مسکرانے والا ہادی اب کھل کر ہنستا تھا۔ یہ دل کی خوشی تھی جو اس کے چہرے پر بھی نظر آ رہی تھی۔ ان کی ساری ناراضی پل میں ہوا ہو گئی۔ اچانک انہیں زینب پر پیار آنے لگا۔ وہ ایک دم اٹھ کر ان تینوں کے قریب آئی تھیں وہ تینوں چونک کر ان کو دیکھنے لگے۔

"میں بھی چلوں۔ اپنی شاپنگ تو میں نے کی ہی نہیں۔" وہ تینوں پہلے تو حیرت سے انہیں دیکھتے رہے پھر مسکرا دیے۔

"آپ دونوں گاڑی میں چل کر بیٹھیں۔ میں ذرا بچوں کو بھی تیار کر لوں۔ عمارہ! تم ذرا میری ہیلپ کروا دو۔"

عالیہ کے کہنے پر عمارہ اس کے پیچھے چل دی۔

"ہادی! تم خوش ہو نا؟" ثمینہ کے سوال پر وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"امی۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے تم خوش ہو۔" ان کے کہنے پر وہ مسکرا دیا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں۔ کیا آپ خوش ہیں؟"
"تم خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔" ان کے دل سے جیسے کوئی بوجھ ہٹا تھا۔
"یہ کوئی بات نہ ہوئی امی! آپ اپنی بات کریں کیونکہ جب سے زینب سے میری بات طے ہوئی ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ آپ کو زینب پسند نہیں؟"
انہوں نے سرنفی میں ہلایا۔ "ایسی بات نہیں۔ مجھے زینب بہت پسند ہے میں کبھی تمہیں پسند نہیں صرف جو حالات پیدا ہوئے ہیں تم نے ان سے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ یہی میری ناراضی کی وجہ تھی لیکن اب میں نے دیکھا ہے میرا بیٹا بہت خوش ہے۔" انہوں نے مسکرا کر اس کا گال چھوا تو وہ نظریں جھکا کر ہنس پڑا۔ ثمینہ نے اس کا ماتھا چوم لیا۔
"سدا ایسے ہی خوش رہو۔ مجھے تو زینب کا احسان مند ہونا چاہیے جس نے میرے بیٹے کو ہنسنا سکھا دیا ہے۔"
ان کے کہنے پر وہ کچھ بولا نہیں تھا بس مسکراہٹ تھی جو ہونٹوں پر چمک کر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"زینب!" سمیرا کی پکار پر وہ کچن میں داخل ہوئی۔
"جی امی!"
"بیٹا! یہ عمارہ کے گھر دے آؤ۔" انہوں نے کھیر کا ڈونگہ اس کی طرف بڑھایا۔
"میں؟" اس نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔
"کیوں تمہیں کیا ہے؟"
"امی! میں آپ سمیر کو بھیج دیں۔"
"سمیر ہوتا تو تمہیں کہتی۔ اب جاؤ بھی گیٹ پر پکڑا کر آجانا۔"
زینب نے بے بسی سے ماں کو دیکھا اور باہر آگئی۔
"امی بھی ناں سمجھتی نہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی عمارہ کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ بیل بجانے کی نوبت نہیں آئی گیٹ کھلا تھا وہ بہت محتاط نظروں سے دیکھتی ہوئی اندر بڑھی لاؤنج میں داخل ہو کر اس نے عمارہ کو آواز دی تھی لیکن وہی ہوا جس کا ڈر تھا ہادی اس کے سامنے تھا اس نے حواس بحال کر کے اسے سلام کیا وہ وعلیکم سلام کہتا ہوا اس کے قریب آیا۔ ساتھ ہی کلون کی دلفریب خوشبو بھی آئی۔
"امی نے آپ کے لیے کھیر بھیجی ہے۔"
"او گریٹ۔" اس نے ڈونگہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "تم نے بنائی ہے؟" اس نے ڈھکن اٹھا کر دیکھنے کے بعد اس سے پوچھا تو اس نے سرنفی میں ہلایا۔
"بنانا آتی ہے؟" اس نے ایک بار پھر سرنفی میں ہلایا۔
"تو امی سے سیکھ لو کیونکہ مجھے کھیر بہت پسند ہے۔ بیٹھو میں آتا ہوں۔"
زینب نے کب سے جھکی نظریں اٹھا کر اس کی پشت کو دیکھا۔ وہ کچن میں جا رہا تھا۔ زینب ابھی تک حیران کھڑی تھی کیونکہ وہ امید نہیں کر رہی تھی ہادی اتنے آرام سے بھی بات کر سکتا ہے یعنی ان کے درمیان رشتے نے اس پر کچھ تو اثر ڈالا ہے۔
"تم ابھی تک کھڑی ہو؟" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔
"عمارہ؟"
"گھر پر کوئی نہیں ہے۔" اس نے کھیر کھاتے ہوئے بڑے نارمل انداز میں اطلاع دی تھی۔ اگلی بات اس سے بھی زیادہ حیران کن تھی۔
"بیٹھ جاؤ، تمہارا اپنا گھر ہے۔"
"نہیں، میں چلتی ہوں۔" وہ گھبرا کر مڑی تھی۔
"بیٹھ جاؤ زینب! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے مڑ کر اسے دیکھا اسے یونہی کھڑے دیکھ کر کھیر کھاتا ہادی کا ہاتھ رک گیا تھا۔ وہ خائف ہو کر سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے خالی رکابی سینٹرل ٹیبل پر رکھ دی اور دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"میں نے سوچا تھا یہ سب باتیں شادی کے بعد کروں گا لیکن کچھ باتیں ایسی سامنے آئی ہیں جن کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کچھ باتیں کلیئر ہو جائیں تو اچھا ہے۔" زینب نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ جانے اب کیا انکشاف ہونے جا رہا تھا۔
"جب سے ہماری بات طے ہوئی ہے مجھ سے بار بار ایک ہی سوال پوچھا جا رہا ہے۔ تم زینب سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم نے بھی عمارہ سے یہ کہا کہ میں تم سے شادی تم پر ترس کھا کر کر رہا ہوں۔ کیا تم مجھے بتا سکتی ہو میں تم پر ترس کیوں کھاؤں گا؟"
زینب ہاتھ مسلتے ہوئے سر جھکا گئی۔
"میں نے کچھ پوچھا ہے؟" اس کی بھاری سنجیدہ آواز پر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
"ترس کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی تو نہیں ہو سکتی میں اچھی طرح جانتی ہوں میں آپ کو اچھی نہیں لگتی لیکن اس کے باوجود آپ نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کیا صرف اس لیے کیونکہ میں مشکل میں تھی۔ آپ نے مشکل وقت میں میری امی کی عزت رکھی۔ آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی۔" وہ جھکی نظروں کے ساتھ بولی تھی۔
"ہونہہ تو تم بھی مجھے نہیں کرتی تھیں۔ تمہارے نزدیک دنیا کی فضول ترین لڑکی ہو گی جو مجھ سے شادی کرے گی میرے تو دل کی جا۔ پھر فٹ ہے میں تو گھو بھور کر اس کا خون ہی جلا دوں گا۔"
زینب سب بھول کر پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی جو اس کے کہے ہوئے سب الفاظ بہ لفظ دہرا رہا تھا۔
"میرے بارے میں اتنا جاننے کے باوجود تم نے بھی شادی کے لیے انکار نہیں کیا اور باوثوق ذرائع سے مجھے پتا چلا ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" اب کے جملے کے اختتام پر وہ مسکرایا بھی تھا۔ زینب صوفے سے یوں کھڑی ہوئی تھی جیسے وہاں کانٹے اگ آئے ہیں۔
"یہ آپ سے عمارہ نے کہا؟" یہ پوچھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہادی بھی اٹھ کر اس کے سامنے آگیا۔
"یہ بات تمہیں عمارہ کے بجائے مجھ سے کہنی چاہیے تھی کیونکہ جس سے محبت ہو بتانا اسے چاہیے نہ کہ اس کی بہن کو۔" زینب کا جھکا ہوا سر جھکا ہی رہ گیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اس سے نظریں ملا سکے۔
"زینب!" اسے مسلسل سر جھکائے کھڑے دیکھ کر ہادی کو اسے پکارنا پڑا۔ تو زینب نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو صاف کر کے سر اٹھایا۔ وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ صرف ایک پل کے لیے اس کی نظریں اس کی نظروں سے ملی تھیں اور پھر دوبارہ جھک گئی تھیں اور ساتھ ہی وہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔
"عمارہ نے صحیح کہا تھا۔" اس کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔
"عمارہ نے کہا تھا آپ نے زینب کو غور سے نہیں دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اور تمہیں قریب سے دیکھا تو پتا چلا واقعی تم خوبصورت ہو۔" زینب کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ اتری تھی۔
"میں نے جس وقت تم سے شادی کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اگر اس میں ہمدردی نہیں تھی تو محبت بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کون سا جذبہ تھا جس نے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا لیکن اس فیصلے کے بعد تم خود بخود اپنی سی لگنے لگیں۔ اور آج ابھی اسی پل مجھے لگا مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔" ہادی دو قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے قریب آگیا تھا۔ زینب کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی لیکن اب وہ مسکراہٹ پہلے سے گہری ہو گئی تھی۔
"امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
اسے مسلسل دیکھتا پا کر وہ دھیمی آواز میں بولی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے یوں گھبرا کر بھاگتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا تھا۔
"جاتے جاتے میرے لیے تو کچھ کہتی جاؤ۔" وہ یکدم رکی، مڑ کر دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔
"آپ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔"
وہ کہہ کر رکی نہیں تھی لیکن گیٹ سے نکلنے سے پہلے اس نے ہادی کا قہقہہ سنا تھا اور وہ خود بھی مسکرا دی تھی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی اب اسے زندگی کی راہ میں ہادی کے سنگ ہمیشہ مسکراتے ہی رہنا تھا۔

☆

مریم فردوس
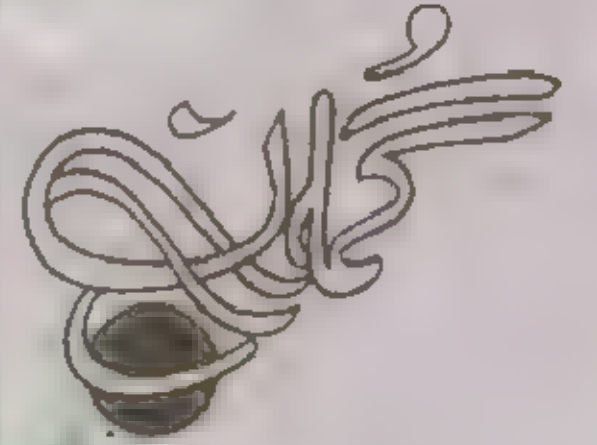
گرمیاں! اچانک ہی آئی تھیں اور پوری شدت کے ساتھ آئی تھیں۔ چلچلاتی دھوپ میں، میں ایک بس کے بعد اب دوسری بس میں سوار تھی۔ ابھی مجھے ایک بس اور بدلنا تھی۔

اور یہ آج کا نہیں! روز کا میرا معمول تھا۔

تین بسیں بدل کر طے ہونے والا یہ تھکن سے چور کر دینے والا سفر!

جس کا ایک ایک لمحہ گھڑی کی سوئیاں دیکھ کر گزرتا تھا۔

غضب کی گرمی، گھٹن، حبس اور کھچا کھچ بھری بس!

سانس لینا دشوار۔

مزید ستم یہ کہ ہر اسٹاپ پر دو تین لوگ مزید سوار ہو رہے تھے۔ پتہ نہیں بس میں لوگ کہاں اور کیسے کھڑے تھے۔

ہر دفعہ نئے چڑھنے والوں کے ساتھ کنڈکٹر کا پرانا مخصوص جملہ۔

"شاباش اندر ہو جگہ بناؤ۔ شاباش۔"

"ارے کیا روئی کے بنے ہیں جو دب جائیں گے؟"

ایک خاتون نے جل کر پوچھا تھا اور اس عالم وحشت میں بھی میرے ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔

وہ تو شکر کہ آج مجھے بیٹھنے کی جگہ مل گئی تھی۔

ایک خاتون جو خوش قسمت تھیں کہ انہیں نشست ملی ہوئی تھی۔ قومی اسمبلی کی نہ سہی بس ہی کی سہی۔ جب اترنے لگیں تو میرا دوپٹہ کھینچ کر بولیں۔

"اے لو تم بیٹھ جاؤ۔"

پانچ لوگوں نے مجھے رشک بھری نگاہوں سے دیکھا ہو گا۔ میری نشست کے پاس اتنے ہی لوگ کھڑے تھے! میں جو شکر ادا کر رہی تھی کہ بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ پانچ منٹ بعد ہی بے طرح پچھتانے لگی۔

انسان واقعی بے صبرا ہے۔ ناشکرا ہے اور جلد باز بھی!

"میرے بھائی نے مجھے بلایا ہے۔ وہاں جا رہی ہوں"

میرے برابر والی نشست پر بیٹھی ہوئی خاتون میری طرف جھک کر کہہ رہی تھیں۔ میں نے ان کی جانب نگاہ اٹھائی۔ سرمئی رنگ کی پرانی سی چادر میں وہ دبلی پتلی گہرے سانولے رنگ کی چالیس پینتالیس سالہ خاتون تھیں۔

میں سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔ گھومتے پہیے زندگی کی تیز رفتاری کے گواہ تھے۔

"پانچ ہزار دے گا مجھے۔"

میں جو سیدھی بیٹھی ہوئی تھی یک دم کڑبڑا گئی۔

"میرے والٹ میں بھی تو پانچ ہزار ہیں۔"

"ہیں یا تھے؟" ذہن نے خطرہ کا الارم بجایا اور مجھے شدید پریشانی نے آگھیرا۔

"لوگ ایسے ہی باتوں باتوں میں کام کرتے ہیں۔"

میں نے فوراً" اپنا پرس کھول کر والٹ اور ساتھ ہی موبائل چیک کیا۔ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ مجھے اطمینان ہوا۔

"گویا ابھی وار ہوا نہیں ہے۔"

بہرحال میں محتاط ہو گئی تھی۔ میری آج کمیٹی کھلی تھی۔ پانچ ہزار کی اور اس کمیٹی کے منتظر میرے بہت سے کام تھے۔

میں نے پرس کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنے برابر والی نشست پر بیٹھی ہوئی سرمئی چادر والی خاتون کی طرف سے رخ موڑ کر مکمل طور پر کھڑکی سے باہر متوجہ ہو گئی۔ اس سے زیادہ لاتعلقی میں ظاہر کرتی بھی کیسے!

"مجھے بلایا ہے میرے بھائی نے کہہ رہا تھا پانچ ہزار دوں گا۔ میری ماں کا انتقال ہو گیا نا!"

"اف یہ خاتون کیوں مجھے اپنی باتوں میں الجھا رہی ہیں؟" میں واقعی شدید الجھن میں مبتلا تھی۔ وہ مجھے متوجہ نہ پا کر بھی مجھ سے مخاطب تھیں۔

"ہم چار بہنیں تھیں۔ دو کا انتقال ہو گیا۔"

میں اس سرمئی رنگ کی چادر والی خاتون کی اس بات سے پانچ ہزار اور والدہ کے انتقال کا تعلق سوچتے ہوئے ایک دفعہ پھر اپنے پرس میں والٹ اور موبائل کی موجودگی کا اطمینان کرنے لگی۔

"شکر ہے کہ میری چیزیں موجود ہیں۔ مگر مجھے محتاط رہنا ہو گا۔"

"اللہ کی قسم جھوٹ نہیں کہہ رہی میں۔ ہمارے یہاں جس لڑکی کی خاندان میں شادی ہوتی ہے تا وہ جلدی مر جاتی ہے۔"

اب یہ خاتون بہنوں سے خاندان پر آ گئی تھیں۔ ان کی بے ربط باتیں طول پکڑ رہی تھیں۔

میں نے چالیس سیکنڈ میں چار دفعہ گھڑی دیکھی تھی۔ "یا اللہ یہ بس آج اتنا رینگ رینگ کے کیوں چل رہی ہے؟"

"میری ماں کے مرنے کا میری بھاوجوں کو بھی بہت غم ہے۔" سرمئی چادر والی خاتون ایک بار پھر موضوع بدل چکی تھیں۔ اس لمحہ میں نے یہ بات مانی تھی کہ "خاتون اردو بہت صاف بولتی ہیں۔"

میں مسلسل اپنے پرس کو ٹٹول رہی تھی کہ کہیں سے والٹ نکل تو نہیں گیا، دوسرے لفظوں میں نکال تو نہیں لیا گیا۔

"میری ماں بہت اچھی تھی۔ میری بھاوجیں کہتی ہیں ایسی ساسوں کا سایہ اللہ ہمیشہ سر پر سلامت رکھے۔" وہ پانچ ہزار کو یکسر فراموش کیے ہوئے اپنی والدہ کو یاد کر رہی تھیں اور میں ان کی باتوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کرنے کے لیے پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔

"میری ساس بالکل اچھی نہیں ہے۔"

خاتون اپنی بھاوجوں کی ساس کے بعد اب اپنی ساس کو موضوع گفتگو بنا رہی تھیں اور میں ان کی باتوں سے اکتا چکی تھی۔

"اس سے تو میں کھڑی بہتر تھی!" شکر سے ناشکری کا سفر اتنا ہی مختصر ہوا کرتا ہے۔

"میرے سسر پر سایہ ہو گیا تھا۔ میری ساس نے اسے مروا دیا۔ میرے سسر پر سایہ تھا تا وہ مر گیا۔"

وہ ایک ہی سانس میں دو مختلف باتیں کہہ رہی تھیں۔

ساس پر مکمل الزام بھی نہیں رکھ رہی تھیں۔ ان کو مکمل بری بھی نہیں کر رہی تھیں۔ کچھ بھی تھا مگر اپنی ساس کے بعد وہ اپنے سسر پر آ چکی تھیں۔

"میرا سسر بہت اچھا تھا۔ ساس اچھی نہیں ہے۔"

"سارے مرد شوہر بن کر اپنی بیویوں کے ساتھ اتنا برا کر چکے ہوتے ہیں کہ ان کا پچھتاوا انہیں اچھا سسر بنا ہی دیتا ہے۔" میں نے تلخی سے سوچا۔

"ہاں، آپ کا۔" میری سوچوں میں خلل ڈالنے

والا وہ بس کنڈکٹر تھا۔

میں نے نہایت احتیاط سے پرس کھولا۔ والٹ میں سے پیسے نکال کر کنڈکٹر کو دیے۔ کنڈکٹر نے کرایہ کاٹ کر باقی کے پیسے مجھے واپس کیے۔ اتنی دیر میں میں ایک بار پھر اپنے پرس میں موبائل کی موجودگی کا اطمینان کر چکی تھی۔ پیسے واپس والٹ میں رکھتے ہوئے میں نے سوچا۔

"ایک دفعہ زپ کھول کر پانچ ہزار بھی چیک کر لوں۔"

میں نے پانچ ہزار والٹ کی زپ والی جیب میں رکھے تھے۔

"میرے جیٹھ کی جب شادی نہیں ہوئی تھی نا تو میری ساس نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔" بس سگنل پر رکی تھی اور سرمئی چادر والی خاتون کی زبان چل پڑی تھی۔ "میرے شوہر کو بھی شادی سے پہلے اس نے گھر سے نکال دیا تھا۔"

میں اپنے والٹ میں پانچ ہزار ڈھونڈ رہی تھی۔ میرے والٹ سے پانچ ہزار غائب تھے۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میری ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ میرا اس بھری بس میں سانس لینا مزید دشوار ہو گیا۔

میرا دل چاہا اس بھری بس میں محترمہ کی ڈراما بازی کا پول کھول دوں۔ "مگر اگلے ہی پل متضاد سوچوں نے مجھے گھیر لیا۔

"اگر ان کے پاس سے نہ نکلے تو؟"

"اگر انہوں نے کہیں چھپا دیے ہوں اور لاکھ تلاشی لینے پر بھی نہ ملے تو؟"

"تو پھر یہاں میری بے عزتی ہو گی!"

اب میرا سارا دھیان اپنے چوری شدہ پانچ ہزار کی طرف تھا۔

"میرے پانچ ہزار...... میں تو اتنی محتاط تھی۔ اتنی احتیاط کی تھی میں نے۔ انہوں نے کیسے نکال لیے؟"

"میری نندوں کے ساتھ بھی اس نے بہت برا کیا۔"

"مجھے ایک کوشش تو کرنا چاہیے۔ شاید سب کے سامنے شرمندہ ہو کر محترمہ مجھے پیسے واپس کر دیں۔" کئی دفعہ میں نے سوچا۔

مگر پھر یہ خوف "اگر ان کے پاس سے نہ نکلے تو..."

عجیب کشمکش تھی جس میں میں مبتلا تھی!

"میری ساس بے نہایت بری ہے۔"

"ایک بہو آخر کب تک اچھی بن سکتی ہے؟ ساس بن کر وہ بری بن ہی جاتی ہے۔" مجھ سے تو یہ سوچا بھی نہ گیا۔

"اے لو۔" ان محترمہ نے میرا کندھا ہلایا۔ پھر میرے پیروں کے پاس جھک گئیں۔ اٹھیں تو ان کے ہاتھ میں میرا پانچ ہزار کا نوٹ تھا۔

"یہ نیچے شاید تمہارا گرا ہے۔"

اور میں...... نے ان سے وہ نوٹ جھپٹ لیا۔ اس لمحے مجھے جو خوشی ہوئی تھی۔ وہ تو کمیٹی کھلنے پہ بھی نہ ہوئی تھی۔

"یہ نیچے کیسے گر گیا؟" اپنی بدگمانی پر پشیمان ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی۔

"بیٹا" محترمہ نے ہی [illegible]

"میری ماں مر گئی مگر میری ساس نہیں مری۔" سرمئی چادر والی خاتون پھر گویا ہو گئی تھیں۔

"تو اگر انہوں نے نکالے تھے۔ تو واپس کیوں کیے

"میرے پیسے گر کیسے گئے؟" میں اپنی الجھن کو سلجھانے کے چکر میں مزید الجھ رہی تھی۔

"جب احتیاط حد پھلانگ لے تو بے احتیاطی بن جاتی ہے۔" میرے دماغ نے کہا تھا۔

"بیٹا! پیسے سنبھال کر رکھا کرو۔ ابھی میرا بھائی بھی مجھے پانچ ہزار دے گا۔ اسی لیے تو اس نے بلایا ہے مجھے۔"

میں اپنے گمان پر اب واقعی شرمندہ تھی۔ میرے لیے سرمئی چادر والی خاتون کے ساتھ سفر کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ میں وہیں بس سے اتر گئی۔ گو وہ اسٹاپ ابھی دور تھا جہاں سے میں روز تیسری بس بدلتی ہوں۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"آج میں چار بسیں بدلوں گی۔"

مکمل ناول

سالوی علی بٹ

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان پاک ہے۔

"جو تمہیں دکھ دے اسے چھوڑ دو مگر جسے چھوڑ دو اسے دکھ نہ دو۔"

رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی غیر واضح سی روشنی اور سرد سی خاموشی تھی۔ ساری کائنات ہو کے عالم میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ رات کے اس پہر وہ گم صم شعور سے بے گانہ جاگتے ہوئے تیسری رات بتا رہا تھا۔ نیند بہت بے کل سی اس کی کھلی آنکھوں کو بند کرنے کے لیے کروٹیں بدل رہی تھی۔ مگر اس کے بہم کنال وجود کا نیند اور سکون سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے کیے گئے پختہ ارادے، سجائے گئے خواب، لاحاصل کا دکھ اس کے اندر بین ڈال رہے تھے۔ متضاد سوچوں کی آماجگاہ بنا بوجھل اور بھاری سر اس نے بمشکل اٹھایا۔

خالی خالی آنکھوں سے خود اپنے ہاتھوں سے اجڑے ہوئے کمرے کا حلیہ اجنبیت سے دیکھا۔ بیڈ کی چادر ادھڑی ہو کر آدھی کارپٹ پہ رل رہی تھی۔ بیڈ اور نیچے کارپٹ پہ سارے بے بسی اور مایوسی سے پھاڑے گئے تکیوں کی روئی، دھرم، روشنی میں برف باری کے نرم گداز گولوں کے رقص کرنے کا منظر پیش کررہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ دھری پرفیوم، کٹ اسپرے، کلون، ہیئر برش، لوشن وغیرہ کی سب بوتلیں زمین پر زور سے پٹخنے سے ٹوٹ چکی تھیں یا یونہی ادھر سے ادھر لڑھک گئی تھیں۔ اس نے ان دنوں میں بے تحاشا اسموکنگ کی تھی حالانکہ وہ سگریٹ پینے کا عادی نہیں تھا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر گیا تھا۔ گلاس ٹیبل جا بجا راکھ سے اٹا تھا۔
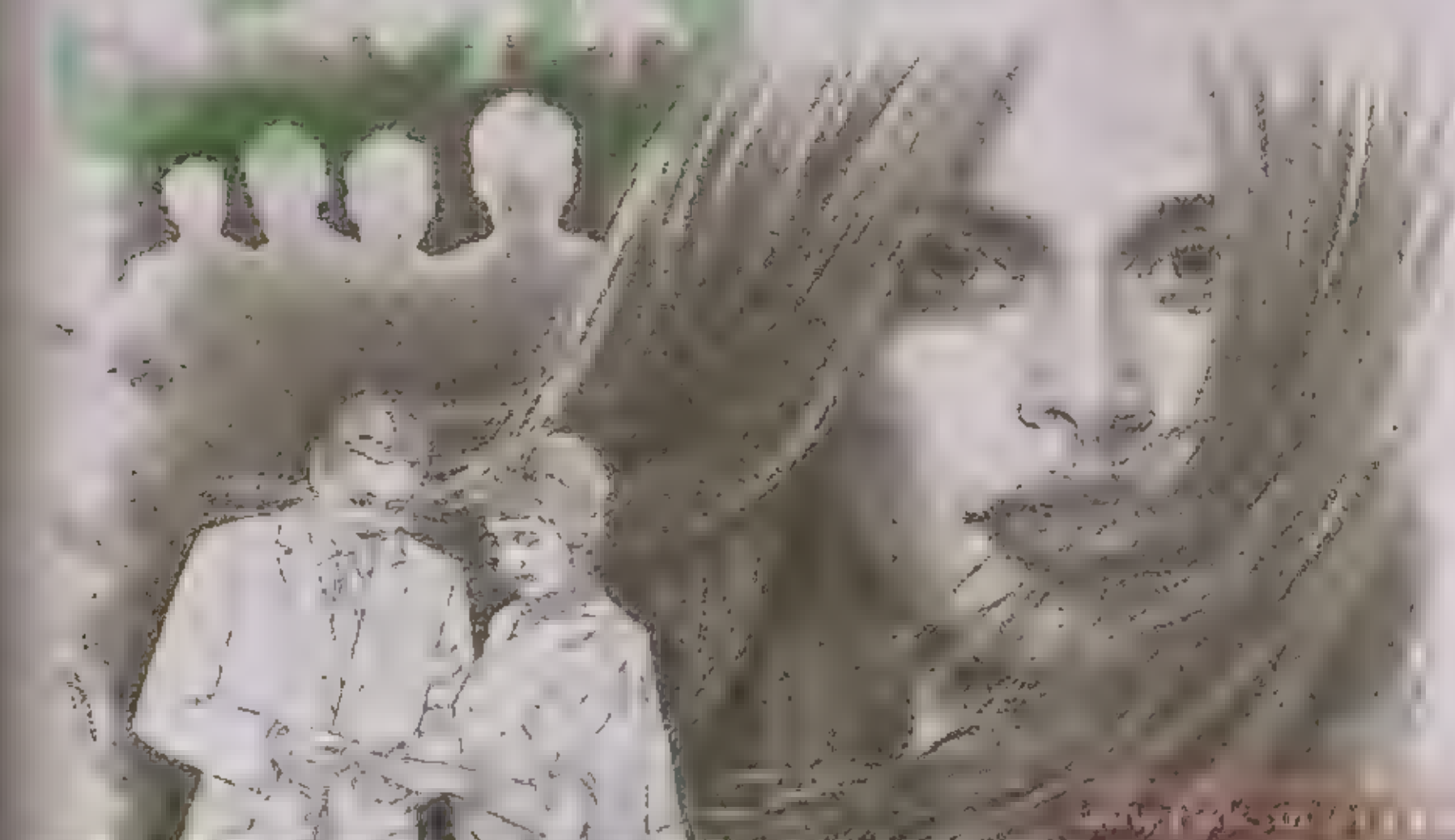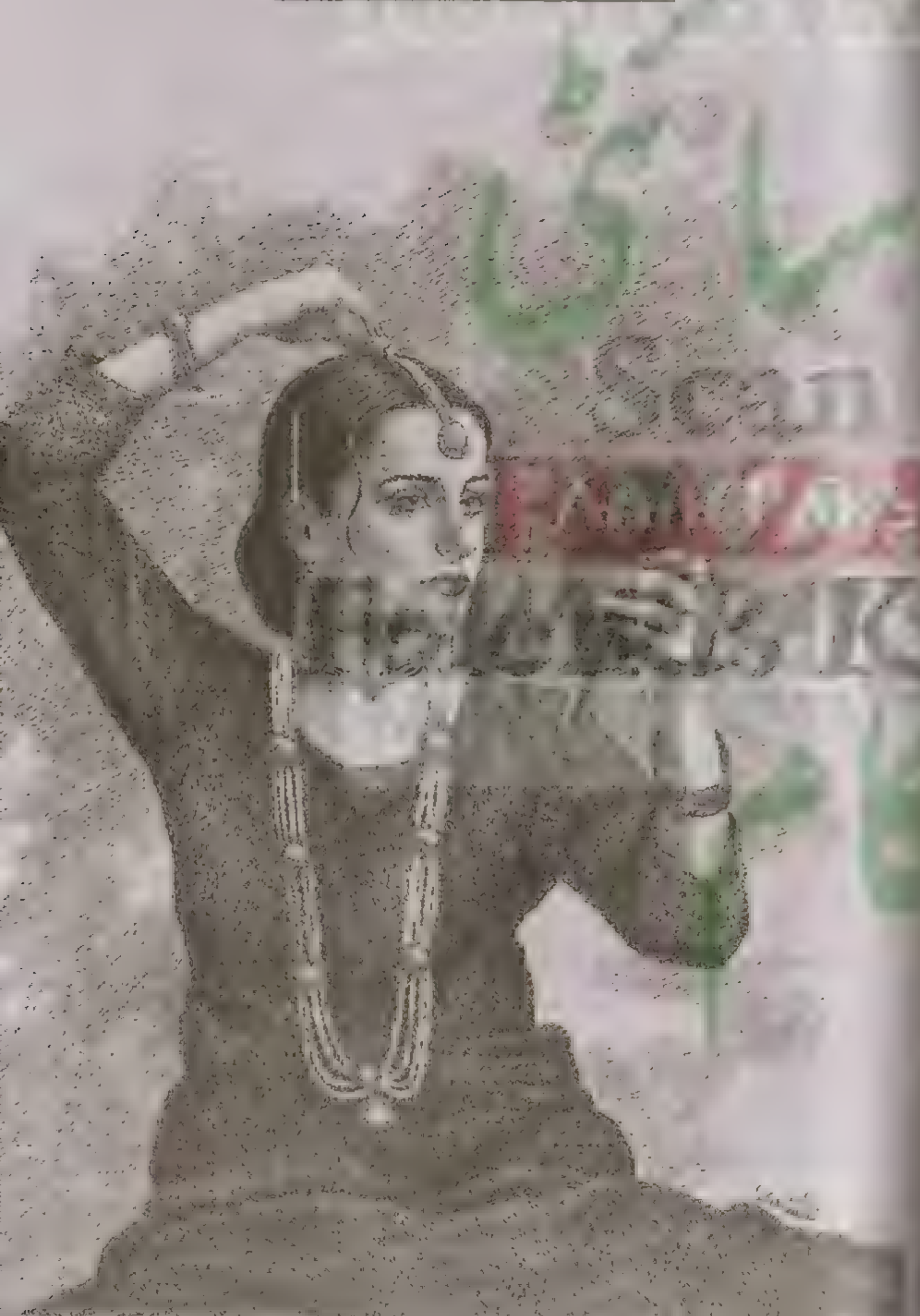
کمرے کا جائزہ لے کر اس نے سر کو دائیں سے بائیں جھٹکا اپنے پژمردہ اور تھکن سے بھرے وجود میں بہت سی ہمت مجتمع کرتا وہ اپنے گھٹنے پر ہاتھ کا بوجھ ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مدھم روشنی میں بکھری چیزوں کو مزید قدموں تلے روندتا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کافی دیر وہ بے یقینی سے آئینے میں اپنے عکس کو تکتا رہا پھر بلا ارادہ ہی وہ اپنی دونوں کھلی ہتھیلیوں سے گالوں کو رگڑنے لگا۔

غیر محسوس انداز میں وہ کسی ذہنی مریض کی طرح یہ عمل بار بار دہرا رہا تھا جیسے اسے کسی اور کے چہرے کا گمان ہو ایسے کرتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ کے زخم کا بھی احساس نہیں تھا جس پہ اس نے بینڈیج کی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں چھلنی سی ہو گئیں اس نے چہرے کو آئینے کے مزید قریب لے جا کر غور سے دیکھا گھنے بال خاصے الجھے ہوئے تھے۔ اس کا ہلکا سانولا رنگ سیاہی مائل لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے رت جگے اور زیادہ اسموکنگ کی وجہ سے سوجے ہوئے تھے' آنکھیں بے تحاشا سرخ اور ہونٹ سیاہ ہو چکے تھے۔ اس کے جسم پر تین دن پرانے کپڑے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ تین دن سے بھوکا ہے۔ خود کا ہر زاویہ سے اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ میکانکی انداز میں وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔ ہینگر میں لٹکتے کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے الٹتے پلٹتے اس نے سیاہ شلوار قمیص منتخب کر لیا۔

شاور پوری رفتار سے کھولے وہ ٹھنڈے یخ پانی کے نیچے پندرہ منٹ کھڑا رہا تھا ایک طویل باتھ لے کے وہ باہر آیا۔ باتھ کے بعد بھوک کا احساس شدت سے جاگا تھا۔ کچن فریج میں رات کا بنا کھانا پڑا تھا۔ کھانے کے ڈونگے دیکھتے ہی اس کا جی پھر سے اچاٹ ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈونگا واپس رکھ کر اس نے دودھ کا ڈبہ نکال لیا اور چائے بنانے لگا۔ اس دوران اس کے ذہن میں کتنی ہی یادیں ابھرنے لگی تھیں۔ کسی کا وجود' باتیں' قہقہے' چھیڑ چھاڑ اسے خود سے بے گانہ کرنے لگے۔ ان تکلیف دہ سوچوں سے فرار پانے کے لیے اس نے برنر کی آنچ تیز کر دی۔

دھیان بٹانے کے لیے وہ بلاوجہ ہی کیبن کھول کھول کر بند کرنے لگا۔ ایک کیبن میں بسکٹ کا پیکٹ نظر آنے پر اس نے اٹھا لیا۔

چائے کے سپ بھرتے اس کا سامنے دھری بسکٹ کی پلیٹ پر یا تو دھیان نہیں گیا تھا یا پھر وہ کھانا نہیں چاہ رہا تھا۔

خالی دل...

خالی دماغ...

خالی جسم...

اور خالی روح۔

چائے کے آخری گھونٹ تک ان الفاظ کی گردان اس کے ذہن میں چلتی رہی۔ اچانک کسی کی یاد اس کے اندر ابھری تھی وہ جلدی سے مگ رکھ کر بکھری چیزوں کو مزید بکھیرتا اپنا موبائل ڈھونڈنے لگا' تھوڑی سی کوشش کے بعد موبائل اسے مل گیا۔ اس شخصیت سے بات کرنے کے لیے شاید بڑا حوصلہ درکار تھا۔ اس نے اپنے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنے کے لیے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بہت آہستگی سے وزنی لکڑی کا بھاری دروازہ دھکیل کر کھولا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا اندر سو رہا ہے' وہ اس سے آخری بار ملنے آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ کاش وہ جاگ رہا ہوتا۔ وہ اس سے چند باتیں کر لیتی مگر یہ بھی شکر تھا کہ وہ سو رہا تھا اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو اس سے سوال و جواب کرتا' جانے نہ دیتا جبکہ اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اس نے تو بڑی ہی ہمت سے قسمت کی چال کو ہموار کیا تھا مگر زندگی ہمیں وہی دیتی ہے جو قسمت میں لکھا جا چکا ہو اور قسمت لوح محفوظ الفاظ سے بھرتی ہیں۔ دھیرج سے قدم اٹھاتی ہیل کی آواز پیدا کیے بغیر وہ سنگل بیڈ پہ کروٹ لیے بچے کے سرہانے آ بیٹھی۔ بچے نے سینے تک کمبل اوڑھا تھا ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھے وہ گہری نیند میں تھا۔

کتنے ہی لمحے وہ معصوم فرشتے سے نظریں نہ ہٹا پائی حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے اپنا سفید مرمریں ہاتھ اس کے سیاہ ریشم جیسے ماتھے پہ بکھرے بالوں میں پھیرا بالوں کو سنوارتی وہ کہیں کھو سی گئی۔ اس کی انگلیاں سرکتی ہوئی آنکھوں پہ آ رکیں۔ بچے کی آنکھیں بالکل اپنے باپ جیسی تھیں ویسی ہی چمک اور ذہانت سے بھرپور چھوٹی سی کھڑی ناک' گلابی مائل ادھ کھلے ہونٹ جن سے موتیوں کی مانند شفاف دانت ہلکی سی جھلک دکھلا رہے تھے۔ سوتے میں اس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے نکلتی گرم تپش غیر محسوس انداز میں چھوتے اس کے ہاتھ کو بھی گرما رہی تھی۔

یہ بچہ اس کا سات سال کا بیٹا اس کا خواب تھا جس کی تعبیر کے لیے اس نے جو رستہ چنا تھا تھوڑی دور جا کے ہی ناہموار اور دشوار گزار ہو گیا تھا۔ واپسی بھی ممکن نہیں رہی تھی' سراب سے جلتے ہی رہنا تھا چاہے کتنی ہی کھائیاں آتیں۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے اپنی ممتا کی آگ کو بجھانے کے لیے وہ اسے جھک کر چومنے لگی ابھی وہ مکمل سیراب بھی نہ ہو پائی کہ اس کی ماں دروازے پہ آ کھڑی ہوئی۔

"یہ اٹھ جائے گا۔" اس نے محتاط آواز میں اسے احساس دلایا۔

جس کا مطلب تھا اب اسے مزید بچے کے پاس رکنا نہیں چاہیے۔ اس نے شفقت سے بچے کو چھوتے' دھندلائی آنکھوں سے ماں کو دیکھا اس کا بے قرار دل بیٹے کو سینے سے بھینچ لینے کو چاہ رہا تھا' اس کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام کر اٹھا دیا۔ اسے نواسے کے اٹھ جانے کا خدشہ بہت زیادہ تھا' جسے سنبھالنا اس کے لیے لحہ مشکل ترین ہوتا تھا۔ اپنی بیٹی کے جذبات کی اسے قطعاً" پروا نہیں تھی۔ دروازے میں رک کر اس نے اپنے لخت جگر پر ترچی الوداعی نظر ڈالی اور اپنے کٹے جگر کے ساتھ باہر آ گئی۔

بیرونی برآمدے کے ستون کے پاس زنک کلر کے پینٹ کوٹ میں ملبوس سگار کے کش لگاتا بارعب پرسنالٹی والا شخص اس کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جیسے اس کے انتظار سے کوفت میں مبتلا ہو۔ اپنی ماں سے گلے مل کر اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ پھر بند کر لیے۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے پھنس رہے تھے۔ ماں نے دلاسا دینے کے لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ یوں بھی اسے اپنی بیٹی کی اس قدر بے قراری سے چڑ تھی۔

"آر یو گوئنگ ماما؟" ابھی وہ ستون کے پاس کھڑے شخص کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اس آواز نے اٹھتا اگلا قدم روک لیا۔

آسمانی رنگ کے گاؤن میں ملبوس' آنکھوں میں نیند کی ہلکی ہلکی سرخی اور آواز میں ناراضی نمایاں تھی۔

اس کے پاس بیٹے کے سوال کا جواب جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا جس ماں نے اپنی اولاد کو سات سال تک راست گوئی کا سبق پڑھایا ہو' خود اپنے پڑھائے سے انحراف کرنا کتنا مشکل تھا وہ ہاں یا ناں میں سر بھی نہ ہلا پائی۔

اس کے برابر کھڑے شخص نے ناگواری سے بچے کو دیکھا۔

"ماما! آپ نے لاسٹ ٹائم پرمس کیا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر جائیں گی۔"

اس نے ماں کا کہا دہرایا "میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے نانو کے پاس نہیں رہنا۔" وہ بھاگتا ہوا ماں کے پاس پہنچا اور مضبوطی سے ہاتھ دبوچ لیا۔

"میں نیکسٹ ٹائم' آپ کو ضرور ساتھ لے جاؤں گی۔"

اپنے امڈتے آنسوؤں کو روکتے' خود کو مضبوط بناتے

لگالی ہے۔" اس کی آواز سنتے ہی وہ شروع ہو گیا تھا۔

"کیا تم نے داڑھی لگالی ہے، مگر کیوں؟ کل تک تو تمہاری شیو تھی۔"

غنودگی میں ڈوبے ذہن نے الفاظ کو اور ہی رنگ دے دیا تھا جبکہ دوسری طرف ارسل کے قہقہے نے اس کے سوئے ہوئے حواس کو یکدم الرٹ کردیا۔

"کیوں فون کیا ہے؟" اس نے دانت پیسے۔

"تمہیں ویکنگ کال دی ہے، اب اٹھو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ، ساڑھے بارہ بجے تک مجھے لنچ پہ ملو۔" ارسل نے اسے وجہ بتائی جسے جاننے کے باوجود بھی وہ روز پوچھتی تھی۔

"تم نے کیا قسم کھا رکھی ہے روز میرے ساتھ لنچ کرنے کی۔"

وہ اس کی نیند خراب کرتا تھا تو وہ بھی اسے تپائے بغیر اتنی جلدی اس کا کہا نہیں مانتی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے ہم کل مجھے جوائن کرلینا، فی الوقت میں اپنے آفس کی کسی ورکنگ گرل سے کام چلا لیتا ہوں، کیونکہ تم تو جانتی ہو مجھ سے لنچ کسی کی کمپنی کے بغیر نہیں کیا جاتا۔"

جان بوجھ کر لاپروائی سے کہتے اس نے کافی ہٹ دھرمی دکھائی تھی۔

"سن، تمہارا زندہ رہنے کا ارادہ ہے کہ نہیں؟" اس کے سیل فون آف کرنے کے خیال سے اس نے تیزی سے پوچھا۔

"مر تو میں چکا ہوں، تم، اب ساتھ نہیں دوگی تو مجھے تو ادھر ادھر منہ ماری کرنا پڑے گی۔" وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"آلینے دو مجھے، تمہارا منہ ہی توڑ دینا ہے میں نے بچو گے نہیں تم۔"

چبا چبا کر کہتے اس نے فون بند کردیا تھا اور سستی سے اٹھ بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

ساڑھے گیارہ بجے اس نے پورچ میں گاڑی کھڑی کرکے اندر قدم رکھا تھا تو ابھی تک سارے گھر میں خاموشی اور نیند کا غلبہ چھایا تھا۔ گھر میں نوکروں کے علاوہ اسے ملا کر کل پانچ افراد تھے۔ ایک اس کی محبوب چہیتی بیوی ماہم، دو کیوٹ سے ٹوئنز بیٹے اور ایک لاڈلی سالی شاہم۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گورنس تھی باقی وہ دونوں ابھی تک سو رہی تھیں۔

اس کی شادی کو تقریباً" چار سال ہو چکے تھے مگر پہلے دن سے لے کر آج تک اس کی یہی روٹین تھی کہ صبح وہ ناشتے کے بغیر تیار ہو کر گھر سے نکل جاتا اور پھر گیارہ، ساڑھے گیارہ کے قریب گھر آکر ماہم کو اٹھاتا اور دونوں مل کر ناشتہ کرتے۔

بیڈ روم میں پردے برابر ہونے کی وجہ سے ابھی تک اندھیرا تھا جسے اس نے لائٹ جلا کر دور کیا۔ بیڈ کے وسط میں بے خبر سوئی ماہم کو مسکرا کر دیکھا اور بیڈ پہ ایک ٹانگ چڑھا کے بیٹھ گیا۔

"ماہی، ماہی پلیز! اٹھو ناں، کتنا وقت ہو گیا ہے۔"

اس کے ایک ہاتھ کو اپنائیت سے پکڑے دوسرے ہاتھ سے اس نے کندھا ہلایا۔

ماہم کو وقت سے کیا لینا دینا تھا جو وہ حساب کتاب رکھتی۔

"ماہی! اٹھو یار بہت بھوک لگی ہے۔"

اس نے مزید قریب ہوتے اس کے چہرے پہ بکھرے بالوں کو نرمی سے ہٹایا۔

اس کے لہجے میں اپنی بیوی کے لیے مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔ اس کی پکار میں محبت بہت واضح تھی۔

"نہیں منصور! ابھی نہیں پلیز۔"

اس نے ہلکا سا کسمساتے ہوئے غنودگی میں ڈوبی آواز میں صاف انکار کردیا۔

"جلدی اٹھو یار! مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے وہ اس کا گال تھپک کر بولا۔ ماہم کے یہ لاڈ، نخرے روز کا معمول تھے۔ منصور جاری تھا روزانہ اسے جگانے میں پندرہ بیس منٹ ضائع کرتے۔

"نہیں، میری نیند ابھی پوری نہیں ہوئی۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے سر مزید تکیے میں گھسیڑ لیا۔ ماہم کی آنا کانی جانے کتنی دیر اور جاری رہتی مگر منصور نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

"پلیز منصور! آپ بارہ بجے آیا کریں۔"

چہرے سے بال سمیٹتے وہ اپنی نیند پوری نہ ہونے پر روہانسی ہو رہی تھی۔

اسے منصور کی اسی عادت سے بہت چڑ تھی۔ وہ اس کی ہر بات مانتا تھا یہ واحد امر تھا جس میں وہ اس کی بات سنی ان سنی کردیتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ لنچ بھی گھر آکر کرتا۔ اس کے چپل پہن کر واش روم میں جانے تک وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ جب تک وہ فارغ ہو کر باہر آئی۔ وہ ٹیبل کا جائزہ لے کر آچکا تھا۔

منصور کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے خود سے چھوٹی بہن شاہم کے دروازے پر بھی دستک دی۔

"شاہم! بریک فاسٹ از ریڈی پلیز کم۔"

منصور نے اس کے لیے کرسی سیٹ کی اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔

"بچوں نے ناشتہ کرلیا؟" دودھ کا جگ رکھتی ماجدہ سے اس نے پوچھا۔

"جی صاحب!"

"ماہی! تم نیند کچھ زیادہ ہی نہیں لینے لگی؟" اس کے لیے بریڈ پیس پر جیم لگاتے منصور نے پوچھا۔ آج کل اسے ماہم کو اٹھانے میں کافی دقت پیش آرہی تھی۔

"یہ بھی آپ ہی کی مہربانی ہے بلکہ میں تو حیران ہوں، آپ اتنا صبح اٹھ کر آفس کیسے چلے جاتے ہیں؟" اس نے جوس کے بھرے ہوئے گلاس کو گھور کر دیکھا۔

وہ منصور کی طرح اتنا ہیوی ناشتہ نہیں کرسکتی تھی مگر منصور اسے کھانے پینے کے معاملے میں بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا، اگر وہ ہاتھ روک لیتی تو خود نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگتا۔

منصور نے زبردست قہقہہ لگایا جبکہ ماہم کو منصور کی اتنی ڈھٹائی پہ کوفت ہونے لگی۔

"شاہم آرہی ہے۔" اپنی طرف جھکے منصور کو اس نے فوراً" پرے دھکیل دیا۔

"یوں کہو، ہڈی آرہی ہے۔" شاہم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

"گڈ مارننگ، ہاؤ آر یو؟" اپنی رسٹ واچ پر ٹائم دیکھ کر وہ بیٹھنے کے بجائے منصور کی کرسی کے پاس رک گئی۔

"فائن، تم بتاؤ کہاں جارہی ہو؟" اس نے شاہم کے کندھے پر لٹکتے ہینڈ بیگ کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

"وہ۔ ب۔ بس ایک دوست کی طرف، ضروری کام ہے۔" وہ سٹپٹا سی گئی۔

ماہم اسے روک لیتی تو وہ انکار نہیں کرسکتی تھی جبکہ ارسل سے وہ لنچ کا کہہ چکی تھی۔

"روزانہ دوست کے ساتھ ٹائم ویسٹ کرنے سے بہتر ہے۔ کوئی کورس وغیرہ کرلو۔" سلائس کا نوالہ چباتے منصور نے بھی اسے ٹوکا۔

وہ شاہم کے ایم اے کو کافی نہیں سمجھتا تھا۔

"آپ بھی نا منصور! پھر سے کتابوں کا جھنجھٹ، بچی ہے، یہی تو دن ہیں اس کے گھومنے پھرنے کے۔"

ماہم کو ہمیشہ کی طرح منصور کے ہر فیصلے اور مشورے سے یہاں بھی اختلاف تھا۔ وہ شاہم سے بہت محبت کرتی تھی اسی حساب سے اسے رعایت بھی دیتی رہتی تھی۔

"ایکسکیوزمی آپی! مجھے آپ کا خود کو بچی کہنے پر اعتراض ہے، پلیز منصور بھائی!" منصور کے کندھے پر بازو پھیلا کر اس نے احتجاجاً" دہائی دی۔

"ڈونٹ کرائے بے بی! تمہاری آپی محاورتاً" کہہ رہی ہیں، دراصل یہ تمہیں بچی بنا کر اپنی عمر چھپانے کے چکر میں ہیں۔"

"واٹ منصور! میں تمہیں۔" ماہم شروع ہو گئی۔ منصور نیوز پیپر پر سر جھکائے مسکرائے جارہا تھا۔ شاہم

نے اس لمحے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ وہ نان اسٹاپ بولتی ماہم کے گال پر بوسہ دے کر "خدا حافظ" کہہ کر باہر بھاگی۔

وہ جانتی تھی اس کے منظر سے ہٹتے ہی منصور اپنی بلبل کو چپ کروا لیں گے۔

☼ ☼ ☼

"کیوں بلوایا ہے مجھے؟" ارسل کے سامنے بیٹھ کر اس نے کمال بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جیسے اس نے آکر ارسل پر احسان عظیم کیا ہو۔

"بڑی فرماں بردار ہو میری' میں نے بلایا اور آگئی۔" اس کے چہرے کو ہر زاویے سے اپنی نظروں میں مقید کرتا وہ دوبدو بولا۔ ان کی اکثر ملاقاتیں ناخوشگوار ہی ہوتی تھیں' اس کے باوجود ایک دن جو ایک دوسرے کی شکل دیکھے بغیر گزر جاتا' دونوں کو سالوں پہ محیط لگتا۔

"اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو وہ وقت دور نہیں' جب تم ایک بار چھوڑ سو بار بلواؤ گے تو میں تب بھی نہیں آؤں گی۔" یہ صاف جھوٹ اس نے نظریں چرا کے بولا تھا۔

"ہاں اور خود تم کیا کہہ رہے تھے؟ وہ آفس گرل" اس نے بھی ارسل کی دھمکی اسے یاد کروائی۔

"تم سے پہلے تھی ناں۔" ارسل نے بڑی روانی سے اس کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "چونکہ تم سے میرے اتنے پرانے مراسم ہیں' یقیناً" تمہیں اسے دیکھ کر دکھ ہوتا اسی لیے میں نے جلدی فارغ کردی۔"

وہ اسے ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس کے ساتھ پوری مقابلہ بازی کرتا تھا۔

"اوکے' فائن تم اس کی کمپنی میں لنچ کر چکے ہوگے تو پھر میں چلتی ہوں۔" ایک جھٹکے سے وہ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

"سنو تو' ایسا تو مت کرو' رکو' میری بات تو سن لو' پلیز ٹھہو یار!" وہ اسے روکنے کی ناکام کوشش میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوٹل سے پارکنگ ایریا تک آگیا۔ وہ منہ پھیر' کان لپیٹے چلتی جارہی تھی۔

"شانی! میری بات...."

"خبردار جو میرا نام اپنی زبان سے لیا' آئندہ مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی بھی کوشش نہ کرنا' تمہارا میرا ہر تعلق ختم۔"

وہ ایسی ہی تھی جذباتیت میں آخری حدوں تک جانے کے لیے تیار' معصوم' سادہ دل اور محبت کرنے والی۔ جبکہ ارسل اس کے بالکل برعکس تھا شوخ و چنچل' غیر سنجیدہ بات کو گھما دینے والا مگر تحمل مزاج۔ فی الحال اس کا سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے کا موڈ نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے' مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں' صبح سویرے تمہاری منحوس آواز سننے کی' بلاوجہ ہی سر چڑھتی جارہی ہو' بس نخرے کیے جاؤ میڈم کی۔" شاہم کے اتنے سخت الفاظ اسے بھی تپا گئے تھے' اپنے غصے میں وہ بالکل بھول گیا تھا کہ شروعات اس کی طرف سے ہوئی تھی۔

"کیا کہا تم نے؟ میری منحوس آواز....." اس کی آنکھوں میں نمی بھرنے لگی تھی۔ ان کی زیادہ تر لڑائیوں کا اختتام شاہم کے رونے یا ارسل کی معافی پہ ہوتا تھا۔

"نن... نہیں یار! وہ میں... میں' ہاں' منحوس کہہ رہا تھا' یونو' مانوس۔" اس کا اگلا اقدام بھانپ کر وہ ہکلاتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

"سب سمجھتی ہوں میں' اب میری اردو اتنی بھی کمزور نہیں ہے' بس تم ہٹ جاؤ میرے رستے سے۔" آنکھوں میں آئی نمی کو رگڑتے ہوئے وہ اسے اپنی گاڑی سے پیچھے ہٹانے لگی۔

"دیکھو شانی! اگر تم گئیں ناں تو... تو میں... میں کسی گاڑی کے نیچے آکر خودکشی کرلوں گا اور میرے اس فعل کی سراسر ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔" اس نے مصنوعی جذباتی پن سے کہتے سامنے رواں دواں ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔

"گاڑی کے نیچے کیوں آتے ہو؟ اس کی تو بریکیں

ہوتی ہیں' خدانخواستہ تم معجزانہ طور پہ بچ بھی سکتے ہو' مرنا ہے تو ٹرین یا گاڑی کے نیچے آؤ۔"

اس کی ایکٹنگ سے متاثر ہونے کے بجائے اس نے خودکشی کی نئی نادر و نایاب قسم بتائی ساتھ ہی ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے وہ اسے زہر لگا تھا۔ وہ اس کی گاڑی کے سامنے مزید بازو پھیلا کر جم گیا۔

"ارسل! اب اگر تم باز نہ آئے تو میں سامنے کھڑی پولیس کو بلالوں گی۔"

"میں بھی انہیں بتادوں گا کہ یہ چورنی ہے۔" گاڑی کی چھت پر انگلیوں کو ایک ردھم سے بجاتے وہ خاصی بے نیازی سے بولا۔

"میں چورنی ہوں۔" ارسل کے اس الزام پر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"میں نے کیا چرایا ہے تمہارا...؟"

"میرا دل۔" اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتا وہ گنگنایا۔

"ارسل! میں تمہیں بہت ماروں گی۔" زور سے پیر پٹختے ہوئے وہ اس پر جھپٹ پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس سے گھر آکر وہ سیدھا بچوں کے کمرے میں گیا تھا۔ انہیں پیار کرکے وہ اوپر آگیا۔ خالی کمرہ پاکر کوٹ اور بریف کیس ایک طرف پھینکتے وہ کافی جھنجلایا۔ ماہم سے وہ کتنی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ۔

"جب میں آفس سے آؤں' تم مجھے بیڈ روم میں ملا کرو' نہ کہ نیچے میرا انتظار کرتی ہوئی۔" ماہم نے کبھی منصور کی کسی بات پر کان نہیں دھرا تھا۔ وہ سنتی ضرور تھی لیکن کرتی اپنے من کی تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا باہر آگیا۔

کچن کاؤنٹر کے قریب اس کی طرف پشت کیے وہ کچھ پکارہی تھی۔ گھر میں کل وقتی شیف موجود تھا۔ منصور کو اس کا کچن میں آنا قطعاً" پسند نہیں تھا۔ خود وہ بھی اپنے موڈ کے تابع ہی آتی تھی۔

اسے دیکھ کر وہ اندر تک شاد ہوگیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے والی تھکن خاصی کم ہوگئی تھی۔

"یہیں ہے میری زندگی؟" اس نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹ لیے۔

"کیا کررہے ہیں منصور! یہ کچن ہے بیڈ روم نہیں' کوئی آجائے گا۔" وہ اس کی مضبوط گرفت میں ہلکا سا کسمسائی۔

وہ منصور کی اس طرح کی حرکتوں سے اکثر نالاں ہی رہتی تھی وہ اس کے التفات سے بچتی تھی۔ منصور اسے جتنی محبت دیتا وہ اتنا ہی اس سے بدکتی۔ اس کا اندازہ منصور کو بھی بخوبی تھا مگر محسوس وہ کبھی کبھار ہی کرتا تھا۔

"بیڈ روم ہو یا کچن۔ گھر تو ہمارا ہے اور پھر تم میری جائز' شرعی اور قانونی بیوی ہو۔ کسی کو بھلا کیوں اعتراض ہوگا؟" اس کے گرد بازوؤں کا گھیرا مزید تنگ کرتے وہ بڑی دلکشی سے بولا۔

"اچھا چھوڑیں بھی' بریانی کو دم پہ رکھنا ہے' پھر سارے کام ختم۔" اس نے مسکراتے ہوئے منصور کو زبردستی خود سے الگ کیا۔

"مائی پلیز! تم کچن میں مت آیا کرو' اب یہ روٹین کی ڈشز شیف بھی تو بنا سکتا ہے' آخر اتنے ملازم تمہارے آرام کے لیے تو رکھے ہیں۔" وہ وہیں کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے اسے دیکھنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

"شیف بالکل بنا سکتا ہے' بلکہ روز بناتا ہے مگر آج میرا دل چاہ رہا تھا' بور ہوجاتی ہوں منصور!" چاولوں کی برابر تہہ لگا کر ڈھکن دیتے برنر کی آنچ ہلکی کردی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں' باہر نکلو شاپنگ پلان کرو' کلب یا جم جاؤ خود کو تھوڑا سوشل کرو' کم از کم گیٹ ٹو گیدر پارٹیز ہی اٹینڈ کرلیا کرو۔" اس کے ساتھ کچن سے باہر نکلتے منصور نے اسے ہمیشہ والا مشورہ دیا۔

"مجھ سے نہیں ہوتا۔" اس کا بھی ہمیشہ والا جواب حاضر تھا۔ باتیں کرتے ہوئے وہ بیڈ روم میں داخل ہوگئے۔ منصور کی وجہ سے اس نے سارا پھیلاوا سمیٹنے کا کام ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اس سے قبل کہ منصور تنہائی پاکر پھر سے

رومانٹک ہوتا وہ جلدی سے وارڈروب کی طرف بڑھ گئی۔

"منصور! آپ شاور لیں، میں جب تک کپڑے نکال لوں۔" اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس نے تیزی سے کہا۔

"کرلیتا ہوں چینج یار! ادھر میرے پاس تو آکر بیٹھو۔" منصور نے اس کا ہاتھ بے خودی کے عالم میں پکڑا تھا۔

"چینج اس کے بعد کچھ اور...!" اس نے بھنویں اچکا کر نرم مسکراہٹ سے اسے ٹوکتے ہوئے واش روم کی طرف دھکیل دیا۔

"ابھی آتا ہوں، کہیں غائب مت ہوجانا۔" اس کے حاکمانہ انداز پر سر جھکاتے اس نے ماہم کی ناک کو چھوا۔

"جی۔" وہ مؤدب ہو کر بولی۔

واش روم کے بند دروازے کو دیکھ کر اس نے لمبی سانس خارج کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ماہم آپی!" اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"شاہم! آؤ اندر آجاؤ۔" وہ جو بڑے انہماک سے مووی دیکھ رہی تھی۔ شاہم کے آنے سے سیدھی ہو گئی۔

ماہم کے کمرے میں وہ کبھی کبھار ہی آتی تھی، اسے اچھا نہیں لگتا تھا کسی کی پرائیویسی میں مداخلت کرنا، آج بھی وہ ارسل کا ذکر کرنے آئی تھی۔

اس کی ملاقاتیں جوں جوں ارسل سے بڑھنے لگی تھیں ماہم کی نظروں میں بھی وہ آنے لگی تھی۔ ماہم اس کے آنے جانے کی بہت کم خبر رکھتی تھی۔ وہ نوکروں کو پیغام دے کر کہیں بھی چلی جاتی تھی، مگر اب ہر بار واپسی پر ماہم ضرور پوچھتی تھی کہ وہ کہاں سے کس دوست سے مل کر آرہی ہے؟ وہ اس کی تمام فرینڈز کو جانتی تھی، پھر وہ کب تک بہانے گھڑ سکتی تھی۔ ارسل نے اور اس نے اپنے گھر والوں کو بتانے کا مشورہ کیا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ بزنس میں سیٹل ہوچکا تھا اور شاہم کو بھی کوئی پرابلم نہیں تھی۔

"کچھ کہنا چاہتی ہو؟" اس کی گومگو کی کیفیت کو ماہم جانچ گئی تھی۔

"نن... نہیں تو...!" وہ یکدم گھبرا کر ماہم کے پاس جا بیٹھی۔

وہ کتنا کچھ سوچ کر آئی تھی۔ اب ماہم کے بڑے پن کا لحاظ آڑے آرہا تھا۔ اس نے ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ماہم کی شادی ہو گئی، سو وہ بہنوں والی چھیڑ چھاڑ ان میں کبھی ہوئی ہی نہیں۔ ویسے بھی ماہم ریزروڈ سی تھی اور ہمیشہ شاہم کو معصوم بچی کی طرح ہی ٹریٹ کرتی۔

ماہم نے مسکرا کر اس کے سر میں انگلیاں پھیریں۔

"شادی سے پہلے آپ کے بال شارٹ تھے نا؟"

اس نے ماہم کے لمبے ریشمی بالوں کو پکڑ کر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں مگر منصور کو لمبے بال اچھے لگتے ہیں۔" اس کے ہاتھ میں کیچر پکڑاتے اس نے بال بڑھانے کی وجہ بتائی۔

"میں نے منصور بھائی میں ایک بات ایکسٹریملی فیل کی ہے، وہ جو چیز عورتوں میں لائیک کرتے ہیں، سب آپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، ایم آئی رائٹ۔" اس نے آگے کو جھک کر ماہم سے تصدیق چاہی۔

"یس، یو آر رائٹ۔" ماہم نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"آپ بھی ویسا ہی کرلیتی ہیں، آپ کا اپنی مرضی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" ٹھوڑی کے نیچے وہ ہاتھ دبائے ماہم سے پوچھ رہی تھی۔

اس نے شادی کے بعد کبھی ماہم کو سجتے سنورتے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ ماہم ایسی تو نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید منصور بھائی کو عورتوں کا بننا سنورنا پسند نہیں، جبکہ سادگی کا لبادہ ماہم کی اپنی من مرضی تھی۔

"منصور میرے شوہر ہیں، پھر ان کی ماننے میں حرج

نا کیا ہے؟" اس نے شاہم کو مطمئن کرنے کے لیے بے پروائی سے کندھے اچکائے، جبکہ اس کے اندر ایک کسک سی اٹھی تھی۔

"ویسے منصور بھائی! آپ کو بہت چاہتے ہیں، بے تحاشا، اگر آپ چند منٹ کے لیے انہیں نظر نہ آئیں تو باؤلے ہو جاتے ہیں۔" شاہم نے شرارت سے مسکراتے ہوئے منصور کی حالت یاد کی۔

"آئی نو ویل۔" اس میں بلاشبہ کوئی شک نہیں تھا۔

"آپی! آپ بھی ان سے محبت کرتی ہیں، آپ نے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا؟"

شاہم کے پہلے سوال کا جواب وہ غلط بیانی میں دے سکتی تھی، مگر دوسرے میں اس کی پکڑائی تھی۔ شاہم اس گھر کی فرد اور چشم دید گواہ تھی۔ وہ بے اختیار انگوٹھے کو مروڑتی کھڑکی سے نظر آتے سفیدے کے درختوں کو بار بار دیکھنے لگی۔

"شاید کبھی کسی کی بے تحاشا محبت کی گرماہٹ بھی آپ کے سرد جذبات کو حدت نہیں پہنچا پاتی، آپ ترستے ہوئے زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہر کوئی اپنے انداز سے محبت کرتا ہے۔" جو کہنا تھا اور جو کہا تھا، شاہم کے خاک پلے نہیں پڑا تھا۔

"ماہم آپی، اگر محبت ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے؟" سر جھکائے بیڈ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے اس نے بڑی ہمت کی تھی۔ موضوع گفتگو خود بخود ہی محبت پہ آرکا تھا۔

"اسے حاصل کرلینا چاہیے، چاہے وہ اچھا ہو یا برا، محبوب کو پا کر جو نقصان حصے میں آئے وہ پھر بھی قابل برداشت ہوتا ہے، مگر جو نقصان اسے کھونے سے ہو وہ آپ کی باقی ساری زندگی کو خلا میں معلق کر جاتا ہے۔"

ماہم نہ جانے کون سی راہوں پہ بھٹکی، اس کے تمام سوالات کا بڑی روانی اور تحمل سے بغیر نوٹس کیے جواب دیتی جارہی تھی۔

شاہم نے سر اٹھا کر بڑی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ تب ہی ماہم نے بھی کھڑکی سے باہر ٹکی نظریں ہٹا کر اس کو دیکھا۔ شاہم کتنی ہی دیر پلک نہ جھپک پائی۔ جو راز وہ خود سے کہنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی، ماہم کی زیرک نگاہیں پڑھ گئیں۔

جو خود اس کیفیت سے گزرے ہوں وہ دوسروں کے بھید بن کہے ہی پڑھ لیتے ہیں۔

"کون ہے وہ؟" اس نے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

"کک... کون؟" وہ ماہم کے اس قدر صحیح اندازے پر یکدم سٹپٹا گئی، ماہم خاموش رہی۔

"یونیورسٹی میں مجھ سے سینئر تھا، ارسل نام ہے، اپنے بابا کے ساتھ بزنس کرتا ہے۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر ابھی اتنا ہی بتایا تھا کہ ماہم بول پڑی۔

"اسے جلد از جلد گھر بلواؤ۔" ماہم کے لہجے میں چھپی بے چینی بہت واضح تھی۔

شاہم محسوس نہ کر سکی، اسے تو ماہم کے منہ سے نکلے الفاظ پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اسے ماہم سے اتنی جلدی مان جانے کی توقع نہیں تھی۔

"وہ... وہ منصور بھائی...."

"میں منصور سے بات کرلوں گی۔" وہ اسے بیچ میں ہی ٹوک گئی۔

☼ ☼ ☼

ماہم نے منصور کو ارسل کے گھر آنے کے متعلق بتا دیا تھا۔ منصور اس شام جلدی گھر آگیا تھا۔ ارسل شام کی چائے پر آرہا تھا۔

چھ بجے کے قریب گاڑی کا مانوس ہارن سن کر شاہم اردگرد کی پروا کیے بغیر باہر کی طرف لپکی، منصور صرف مسکرا کے رہ گیا۔ مگر ماہم کو ذرا اچھا نہ لگا تھا۔

"اتنی دیر کردی آنے میں، کب سے کال ملا رہی ہوں؟" وہ ابھی آدھا گاڑی کے اندر اور آدھا باہر تھا کہ وہ کلاس لینے لگی۔

"تم نے مجھے چھ بجے کا ٹائم دیا تھا اور چھ بجنے میں ابھی سات منٹ باقی ہیں۔" گاڑی کو لاک کرتے اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"دیکھو، ذرا تمیز کے ساتھ ملنا، منصور بھائی مہذب

"میری تو سمجھ سے باہر ہے کہ تم اتنی ہائپر کیوں رہی ہو؟ جبکہ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ ارسل کو اپنی زندگی کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرنے کا پورا حق ہے۔"

"میرا کوئی حق نہیں ہے' میں مر گئی ہوں۔" انہوں نے جان بوجھ کر لہجہ گلوگیر کر لیا۔

ان کی ناراضی کی وجہ ان کی کروڑوں کی جائیداد کی مالک بہن کی اکلوتی بیٹی تھی۔

"آپ کیوں مرنے لگیں ماما؟ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے' بڑے تینوں کی دفعہ تو آپ کو کچھ ہوا نہیں' میری ساری خوشیاں آپ کے دم قدم سے تو ہیں۔"

ماں کی جذباتی بلیک میلنگ سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔

"تم ہمارے گھر کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے ہو' مجھے تمہاری شادی کا بڑا ارمان ہے۔ میں تمہاری شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہوں۔"

"کس سے کرنا چاہتی ہیں ارسل کی شادی؟"

ارسل سے پہلے مطیع الرحمان بول پڑے۔

"ارے اپنی مائرہ کی بیٹی ایمن ہے نا۔"

"وہ فضول لڑکی۔" وہ ماں کی بات بیچ میں ٹوک کر بھڑک اٹھا۔

ابھی وہ ایمن کی مزید خوبیاں گنواتیں کہ سائرہ رحمان کا موبائل بجنے لگا' انہوں نے غنیمت جانا تھا۔ باپ' بیٹے تک وہ اپنی مرضی پہنچا چکی تھیں۔ باقی کی بحث پھر کسی دن پہ اٹھا کر وہ موبائل لے کر اٹھ گئیں۔

"ماما کو ہمیشہ میرے ہر فیصلے پر اعتراض ہوتا ہے' انہیں کبھی میری خوشی میں خوش ہونا نہیں آیا۔"

مایوسی سے سرہلا کر کرسی گھسیٹ کر وہ ناشتا پورا کیے بغیر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈونٹ ڈسٹرب بیٹا! کچھ غلط نہیں ہوگا۔" مطیع الرحمان نے اپنے مخصوص انداز میں دلاسہ دیا۔

"پر بابا جانی! میں شاہم کی فیملی سے مل چکا ہوں' اب وہ آپ لوگوں کا ویٹ کر رہے ہیں' میں کب تک اسے ٹالوں گا؟"

"تم ایسا کرو کہ فی الحال شاہم کو مجھ سے ملواؤ گے"

ارسل کی پریشانی اور مایوسی کو کم کرنے کے لیے انہیں فی الوقت یہی تدبیر سوجھی تھی۔

وہ اثبات میں سرہلاتا آفس کے لیے اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

ماہم نے چہرے پر کلینزنگ مساج کرتے ہوئے شیشے میں نظر آتے بیڈ پہ بیٹھے منصور کو دیکھا۔ جو فائل یوں ہی گود میں رکھے گاہے بگاہے اس کے عکس پر میٹھی میٹھی محبت بھری نظریں ڈالتا جا رہا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز صرف ماہم تھی۔

ماہم اور منصور کمرے میں ہوتے تو ماہم کچھ بھی کرتی' منصور کی نظریں ماہم کا طواف کرتی رہتیں۔ ماہم کے ٹوکنے پر وہ "محبت مجبوری ہے" کہہ کر مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیتا۔

"منصور! آپ کو ارسل کیسا لگا؟" منصور کا ارتکاز محسوس کرکے اسے اٹھتے ہی بنی۔ مساج کرتے ہوئے وہ وہیں بیڈ کے کونے پر ایک ٹانگ اوپر چڑھا کے بیٹھ گئی۔

"بہت اچھا ہے۔" "مجھے ارسل واقعی بہت پسند آیا تھا۔"

"منصور! آپ ایسا کریں؟ اس لڑکے کے بارے میں معلومات کروائیں' اس طرف سے تسلی ہو جائے تو وہ بھی اپنے پیرنٹس کو لے آئے گا' تب ہمیں سب فائنل کرنے میں آسانی ہوگی۔"

ماہم کو بھی ارسل اچھا ہی لگا تھا۔ مگر وہ اس کی ظاہری شخصیت سے مرعوب ہونے والی نہیں تھی۔ شاہم سدا سے اس کے نزدیک ایک بے وقوف اور جذباتی لڑکی رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی بھر کا فیصلہ صرف محبت کی بنیاد پہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ اسے ارسل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"میرے خیال سے تو معلومات کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔" پنسل کے آخری سرے سے فائل بجاتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"واٹ نان سینس منصور! شاہم کی زندگی کا اتنا اہم معاملہ ہے اور آپ فرما رہے ہیں ضرورت ہی نہیں' کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" وہ کل سے ہی نوٹ کر رہی تھی کہ منصور' ارسل کے جانے کے بعد سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے جو اس کے نزدیک جلد بازی تھی۔

"وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور پھر شاہم بھی۔"

"پلیز منصور! کیا آپ نے اچھے اچھے کی رٹ لگا رکھی ہے' آپ کوئی اس کے اندر گھسے ہیں' شاہم تو ابھی بچی ہے' میں نے جو کہا ہے وہ کریں' خود سے قیاس آرائیاں نہ کریں پلیز' ایویں فضول میں۔"

منصور کی بات کاٹتے اسے اپنے لہجے کی تیزی اور بگڑتے تیور کا بالکل احساس نہیں رہا تھا۔ منصور کی خود پہ ٹکی ساکت نگاہوں نے اسے خفیف سا کر دیا۔ مگر اسے اپنے رویے کی بدصورتی کا کبھی افسوس نہیں ہوا تھا' اس کے نزدیک کسی دوسرے کے احساسات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ یکدم اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

پہلی بار۔ نہیں ہوا تھا' نہ ہی غیر ارادی ایسا ہوتا تھا' وہ اکثر منصور کے ساتھ بدتمیزی کر جاتی اور ڈھٹائی یہ کہ معافی تو دور وہ کبھی شرمندہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر منصور کوئی غلطی کرتا تو فوراً اس سے معافی مانگ لیتا اور آئندہ سے اس بات یا کام کے لیے خاص محتاط ہو جاتا جو اس کے غصہ اور ناراضی کا باعث بنے۔ اسے حسرت ہی رہی تھی کہ کبھی ماہم بھی اپنے کیے کا احساس کرے گی۔ اب بھی وہ فائل سائیڈ پر رکھ کر لیٹ گیا۔

وہ ماہم کے اتنے شدید اور تلخ ردعمل پر ناراض نہیں ہوتا تھا' بس کچھ دیر کے لیے اسے عجیب سی چپ لگ جاتی۔ جس کی ماہم کو قطعاً پروا نہیں ہوتی تھی پھر وہ اسے منانے میں خود ہی پہل بھی کر لیتا۔

آدھی رات کے قریب اس نے کروٹ کے بل لیٹی ماہم کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور اس کے سر کے نیچے اپنا بازو رکھ دیا۔ وہ اس کے اتنا قریب لیٹ کر بھی دور ہی تھی۔ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔ دونوں چت لیٹے کافی دیر خاموش رہے۔

"منصور! آپ ارسل کی اتنی طرف داری کیوں کر رہے ہیں؟" اس کا ذہن ابھی بھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اپنی بدتمیزی وہ بھول چکی تھی۔

"کیا یہ جاننا ضروری ہے؟" اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' بہت ضروری ہے' کیونکہ شاہم میری چھوٹی بہن ہے۔" اس نے قطعی انداز میں کہا۔

"میں نے ارسل میں اپنا آپ دیکھا ہے' شاہم پہ ٹھہری آنکھوں میں وہ ہی روشنی بھرا تاثر جو تمہارے لیے میری آنکھوں میں ہوتا ہے' حق جتاتا' اس کے ہر ہر انداز میں شاہم کے لیے ایک خاص والہانہ پن جھلکتا تھا' جیسے۔ جیسے وہ اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتا ہو صرف اپنا بنا کر' بالکل میری طرح محبت کی لو دیتی گرم نگاہیں' مضطرب رکھنے والی بے قراری اور اپنی محبت کو سر کر لینے کی جستجو' بے قراری میں بھی پوشیدہ سکون۔"

یہ سب بتاتے ہوئے وہ بہت بے اختیار سا کہیں اور ہی پہنچا ہوا لگ رہا تھا۔ ماہم سانس روکے اسے سنتی چلی گئی' اس نے کتنی باریک بینی سے ارسل کا تجزیہ کیا تھا۔

"اور شاہم۔" اس نے ذرا خائف ہوتے پوچھا۔

شاہم کی بڑی بہن ہونے کے دعوے کے ساتھ منصور سے یہ سوال کرتے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ خود کہیں غائب ہو جائے' منصور کی نظروں سے دور۔ اس نے ٹھنڈی سانس خارج کی۔ جس کی ساری ٹھنڈک ماہم کے وجود میں سرایت کر گئی۔

اب موازنہ اس کا اور شاہم کا تھا۔

"شاہم کی آنکھوں میں جو محبت تھی' اس پہ خوف کی تہہ چڑھی ہوئی تھی' عورت مرد سے محبت میں کتنی سچی ہے اس کی گواہی عورت کی آنکھوں میں ٹھہرا خوف دیتا ہے' محبوب سے بچھڑنے کا دھڑکا' اپنی بے قراری کو پوشیدہ رکھنے کے لیے عورت' مرد کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کرتی ہے' شاہم کا سرخ ہوتا چہرہ' ہونٹوں کے کناروں میں چھپی مسکراہٹ اور جھکا سر بہت

کچھ عیاں کر رہے تھے۔"

"آپ نے اتنے غور سے مشاہدہ کیا شاہم کا۔" اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی تھی۔

"ہاں' اسی لیے میں نے ارسل کو کھانے کے لیے روک لیا تھا' میں نے پہلی بار اتنے قریب سے کسی عورت کے چہرے پر بکھرتی۔۔۔ سمٹتی محبت کو دیکھا' محبت کے ایسے ایسے دھنک بھرے رنگ جو اپنے لیے تمہارے چہرے پہ دیکھنا چاہتا ہوں' بہت سالوں سے۔" بلاارادہ ہی منصور کے منہ سے آخری جملہ نکل گیا تھا۔

گزرے عرصہ میں اس نے کبھی بھی یہ گلہ نہیں کیا تھا۔ تاہم اپنی سرد مہری اور بے اعتنائی سے منصور کو بے خبر ہی سمجھتی تھی۔

اب پتا چلا تھا کہ بے خبر وہ خود تھی۔ [illegible] محبت کرنے والے محبوب سے بے خبر نہیں ہوتے۔

"میری اور شاہم کی نیچر ٹوٹلی ڈفرنٹ ہے۔" کافی توقف کے بعد اس نے منصور کی دلجوئی کرنے کی غرض سے کہا۔ منصور بھلا کب مطمئن ہو سکتا تھا۔

"نیچر کا اتار چڑھاؤ انسانوں میں ہوتا ہے جانی! محبت کی ازل سے ابد تک ایک ہی نیچر رہے گی۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے منصور!" منصور جانتا تھا اب وہ یہ ہی کہے گی۔

اس کا سر منصور کے بازو پر ہی رہتا تھا کیونکہ اس کی وہ عادی تھی' رخ وہ اس کی طرف سے پھیر گئی تھی۔

"سو جاؤ۔"

اسے سلا کر وہ خود ساری رات جاگتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ آفس کے لنچ آورز میں شاہم کو مطیع الرحمان سے ملوانے لایا تھا۔ اگر مطیع الرحمان شاہم کو اوکے کر دیتے تو پھر سارا معاملہ ہی سیٹ ہو جاتا اس کا کام صرف سہرا سجانا ہی رہ جاتا۔

"اگر تم نے اپنے سسر پر خود کو نیک بی بی ثابت کرنے کے لیے شلوار قمیص پہن ہی لی ہے تو کم از کم دوپٹہ تو ٹھیک سے سنبھال لو۔" ارسل نے گز بھر دوپٹہ پیچھے زمین پر رلتے دیکھ کر اسے ٹوکا۔

"واٹ ڈو یو مین نیک بی بی' مجھے کسی کو انسپائر کرنے کے لیے اس طرح کی کوشش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں' شلوار قمیص کا مشورہ تمہارا ہی تھا۔" وہ آفس میں داخل ہوتے ہوئے وہیں اڑ گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا اب بھی میں ہی کہہ رہا ہوں' دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کے لو' سارے کوریڈور میں جھاڑو پونچھا کر رہا ہے۔"

ارسل نے رات سے اس شاہم میں دم کر رکھا تھا کہ کپڑے ایسے ہونے چاہئیں' بابا کے سامنے نظریں نیچی رکھنا' دھیمی آواز میں بولنا' کسی بات پہ منہ کھول کر قہقہہ مت لگانا' کچھ شرمانے کی ایکٹنگ بھی کر لینا وغیرہ وغیرہ۔ وہ "فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن" والا معاملہ چاہتا تھا۔

ایک تو شاہم اس کے بابا سے ملنے سے خوف زدہ تھی اور کل سے اوپر تلے ارسل کے فون اور ہدایات نے اسے مزید کنفیوز کر دیا تھا۔

"مجھے نہیں ملنا تمہارے بابا جانی سے۔" ساتھ ہی حسب عادت آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

تب ہی مطیع الرحمان آفس کا دروازہ کھول کر اچانک نمودار ہوئے تھے۔ آفس کے بالکل باہر کھڑے دونوں بری طرح چونکے۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بابا یہ شاہم۔۔۔ اور شاہم میرے بابا جانی۔" ارسل نے گھبراہٹ میں بونگوں کی طرح دونوں کا تعارف کروایا۔

"السلام علیکم!" شاہم نے دھیرے سے سلام کرتے سر کو تھوڑا سا جھکا دیا۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے مبہم سا مسکراتے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر پر شفقت سے ہاتھ دھر دیا۔

"تم لوگ باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر آؤ۔" وہ انہیں لیے واپس مڑ گئے۔

"پیار کرتی ہو آپ بیٹا!" صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے نرمی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی بہت کام کاج۔" جواب شاہم کی بجائے ارسل کی طرف سے موصول ہوا۔

"پڑھ چکی ہو؟" وہ نوٹ کر رہے تھے کہ شاہم کافی جھجک رہی ہے۔

"جی ماسٹرز میں لٹریچر کیا ہے۔"

اس نے تھوک نگل کر خود کو پراعتماد ظاہر کرنے کے لیے جتنی برجستگی دکھائی تھی اتنا ہی غلط بول گئی تھی۔ ارسل کے ساتھ مطیع الرحمان کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ شاہم سر جھکا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہ سکی۔

"ہابیز کیا ہیں؟" انہوں نے مزید پوچھا۔ وہ اس کی جھجک پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

شاہم کی بار بار اٹھتی' گرتی پلکیں' گھبراہٹ میں پنہاں خفیف [illegible] پر اعتماد ہونے کی کوشش [illegible] پہلی نظر لڑکی اپنے بیٹے کے لیے دل و جان سے پسند آئی تھی۔ اگر وہ اتنی معصوم اور اچھی نہ بھی ہوتی' وہ تب بھی اسے قبولیت کی سند بخش دیتے کیونکہ یہ ان کے لاڈلے بیٹے کی چاہ تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ ہابیز۔۔۔" اسے کوئی مناسب سا جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ ہابیز تو اس کی کبھی کوئی خاص نہیں رہی تھیں مگر وہ خود کو بہترین ثابت کرنا چاہتی تھی۔

"ہابیز اس کی مجھے سارا دن ایس ایم ایس کرنا' چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے کال کر کے میرا دماغ چاٹنا' وقت بے وقت لنچ اور ڈنر کی فرمائش کر کے میری جیب ہلکی کروانا اور سب سے اہم مجھ سے بے تحاشا محبت اس کے معمول کا حصہ ہے۔" اس کی ایک لمحے کی خاموشی نے ارسل کی زبان کی رفتار بڑھا دی تھی۔

"جھوٹ بول رہا ہے انکل! میں اتنا سب کچھ نہیں کرتی' سارے کام یہ خود کرتا ہے' الزام تراشی ہے یہ۔۔۔"

گردن موڑ کر ارسل پہ خفگی سے آنکھیں نکالتے ہوئے اپنی صفائی دیتی وہ رو دینے کو تھی۔ کل سے اسے سبق پڑھانے والا سب کچھ خود ہی بھولے بیٹھا تھا۔

"اچھا تو سب کچھ یہ کرتا ہے۔" مطیع الرحمان نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھور کر باز رہنے کو کہا۔ اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے' انس او کے۔" انہوں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا۔

"سر! آپ لنچ نہیں لیں گے؟" اس نے مؤدب ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہم تینوں مل کر لنچ کرتے ہیں۔" مطیع الرحمان نے ان سے رضامندی چاہی۔

"سوری بابا جانی! آپ کا یہ لنچ ادھار رہا' کیونکہ آج لنچ کی پلاننگ آپ کی بہو پہلے سے کر چکی ہیں' اب آپ کی اجازت ہو تو ہم نکلیں۔"

ارسل نے اس کی جان خشک کرنے کے لیے نیا جھوٹ گھڑا۔

اس کی اس درجہ غلط بیانی پہ شاہم اسے دیکھتی رہ گئی۔ پریشانی میں اس کے منہ سے اپنی صفائی کے لیے ایک لفظ بھی نہ نکل پایا۔

"یہ تمہیں اسی طرح تنگ کرتا ہے۔" انہوں نے آنسو پیتی شاہم سے پوچھا۔ وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلا گئی کیونکہ بولنا دشوار ہو رہا تھا۔

"چلو ہم باپ' بیٹی مل کر اس سے نپٹا کریں گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"دس از ناٹ فیئر بابا جانی! آپ نے قبل از وقت ہی پارٹی بدل لی۔" ارسل نے باپ کی بے وفائی پہ دہائی دی۔

"یہ میرے بیٹے کی گڈ لک ہے کہ تم اتنی نائس بچی ہو' اگر تم ایسی نہ بھی ہوتیں تب بھی ہم تمہیں ہی اپنی بیٹی بناتے کیونکہ تم میری جگر گوشے کی محبت ہو۔"

انہوں نے شاہم کو پیار دیتے ان دونوں کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ارسل نے تشکر بھری نظروں سے باپ کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

پارکنگ تک وہ دونوں بہت خاموشی سے آئے تھے۔ اندر ہی اندر بے حد خوش مگر بظاہر لڑنے کو پھر

تیار۔

"میں کیب سے گھر جا رہی ہوں۔" وہ گاڑی کا لاک کھول رہا تھا' جب شاہم نے آغاز کیا۔ ارسل نے جتنا تنگ اسے باپ کے سامنے کیا تھا وہ سب کا بدلہ لینے والی تھی۔

"کیوں؟ لنچ کیا' میں انفرادی طور پر کروں گا۔" لاک کھول کر وہ ایڑی کے بل اس کی طرف گھوما۔

"انفرادی طور پر کرو یا اجتماعی' مجھے گھر جانا ہے۔" اس نے اسے دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"گھنی' میسنی وہاں تو بڑی مؤدب' فرماں بردار بنی بیٹھی تھیں اور اب باہر آتے ہی اپنی اصلیت پہ آگئی ہو۔"

"اور تم بدتمیز انسان! نصیحتیں کر کر کے میرا دماغ پلپلا کر دیا' اور خود وہاں کیا جھک مار رہے تھے۔" وہ بھی دوبدو بولی۔

"ایک تو میرے بابا جانی نے تم جیسی معمولی لڑکی کو اپنے لاڈلے' ڈیشنگ' چاکلیٹی ہیرو' ویل ایجوکیٹڈ' ڈیسنٹ بیٹے کے لیے منتخب کر لیا اور اب تم ماسی نفضلیت کی طرح نخرے دکھا رہی ہو۔" شاہم کے حیرت سے کھلے منہ کی پروا کیے بغیر وہ بولتا جا رہا تھا۔

"شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔" شاہم چبا چبا کر صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ اسے ارسل کی چلتی زبان کی برابری کرنا نہیں آتی تھی۔

"روز دیکھتا ہوں۔"

بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس کی بے نیازی عروج پہ تھی۔

"مگر تم پھر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔" ارسل کو تپانے کے لیے اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"تعریف کا تو کبھی ایک لفظ نہ پھوٹا' اور اتنی بکواس کس خوشی میں کر رہے تھے۔" اس نے تیوریاں چڑھائے تنک کر پوچھا۔

"گاڑی میں بیٹھو بتاتا ہوں کیوں؟" اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

پھر گاڑی ریورس کرتے ہوئے وہ بے حد اطمینان سے بولا تھا۔

"ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ مائی شاہی' میں ایک راست گو بندہ ہوں' پھر اچھا دوست تو وہی ہوتا ہے نا جو ہماری خامیاں چھپائے اور خوبیوں سے ہمیں آگاہ کرے' تاکہ مزید امپروومنٹ ہو سکے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت کا عکس نمایاں تھا۔

"واٹ' تم۔" شاہم کو بہت جلد اس کے جملے کا ردوبدل سمجھ میں آگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترتی ارسل گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"منصور! اب بس بھی کریں۔" اس نے جھنجلا کر سر دائیں سے بائیں طرف مارا۔ اسے اپنے سر پر چلتی منصور کی انگلیاں بھاری بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔

چھٹی والے روز بھی منصور کوئی نہ کوئی کام نکال کر رکھتا تھا۔ اسے چین سے بیٹھنا ہی نہیں آتا تھا۔ ابھی بھی وہ ماہم کو گھیرے ہوئے تھا۔

"ابھی تو صرف دو منٹ ہوئے ہیں' دس منٹ اور۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی رفتار مزید تیز کر دی۔

"منصور! میرے سر میں درد شروع ہو جائے گا۔" اب اس کے اصرار میں سخت کوفت تھی۔ اسے اپنی جان بچانا مشکل لگ رہا تھا۔

"پین کلر لے لینا۔" چلتی انگلیاں روکے بغیر بڑا ہی نادر مشورہ دیا گیا۔

اسی وقت شاہم بھی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ درمیانے صوفے پر بیٹھے منصور اور کارپٹ کشن پہ برے برے منہ بنائی بے زار سی ماہم کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ منصور کے قریب ہی تیل والی شیشی پڑی تھی۔ ماہم اپنے کمر سے نیچے تک جاتے بال کھول کر احتجاجاً اس کے آگے بیٹھی سر میں تیل لگوا رہی تھی۔ منصور بڑی مہارت سے اس کے سر کا مساج کر رہا تھا۔ شاہم کے لیے یہ منظر حیران کن تھا۔ پھر دلچسپ ہو گیا۔

"واؤ منصور بھائی' امیزنگ۔" اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ماہم اسے دیکھ کر بلاوجہ ہی خفیف سی ہوئی جبکہ منصور نے اس سے بھی زیادہ زور کا قہقہہ لگا کر اس کا لطف بڑھایا۔

"آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں منصور بھائی! کہ آپ مالشیے بھی ہیں۔" شاہم نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"ہم آج جو کچھ بھی ہیں' سب تمہاری بہن کی محبت کی دین ہے۔" اس کی شرارت کا برا منائے بغیر وہ بولا تھا۔

"توبہ کریں منصور بھائی! ایک بزنس ٹائیکون ہو کر آپ کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں؟ اگر آپ کا کوئی فرینڈ دیکھ لے تو یقیناً" صدمے سے اس کا انتقال ہو جائے۔"

ماہم کے لیے منصور کی محبتوں کے رنگ وہ اکثر و بیشتر دیکھتی رہتی تھی۔ ماہم کو وہ اس لحاظ سے بہت خوش قسمت لوگوں میں گردانتی تھی۔

اس دن چھٹی والے روز ان دونوں سے وہ واقف ہی سارے گھر میں ماسی' بی اماں پھرتے ایک ٹائم کے لیے بھی ماہم کو اس کی نظروں سے دور ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

"بہت بولنے لگی ہو تم شاہم!"

ماہم نے مصنوعی گھوری اس پہ ڈالی اور اوپر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"منصور بھائی! کارڈ کھیلیں۔" وہ بھی ٹی وی بند کر کے نیچے کارپٹ پہ آ بیٹھی۔

"بہت شوق ہے تمہیں مجھ سے ہارنے کا۔" منصور اٹھ کر دراز سے کارڈز نکالنے لگا۔

"ہار جیت کا فیصلہ کھیل کے اختتام پہ ہوگا۔" اس نے اتنے یقین سے یہ سب کہا کہ منصور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

☼ ☼ ☼

"تو پھر تم نے کیا ڈیسائڈ کیا ارسل؟"

سائرہ رحمان کندھے پہ بیگ لٹکائے ہوئے آئی تھیں بالوں میں گلاسز بھی اٹکے ہوئے تھے وہ شاید کہیں جا رہی تھی۔

"مجھے کچھ ڈیسائڈ کرنا تھا ماما؟"

وہ نا سمجھی سے الٹا ان سے پوچھنے لگا۔

"میں ایمن کے متعلق پوچھ رہی ہوں' اگر تم نے اپنا مائنڈ سیٹ کر لیا ہے تو میں مائرہ کو کوئی حتمی جواب دوں۔ ویسے بات تو طے ہے یہ تو صرف فارملٹی ہے دنیا دکھاوے کے لیے' ورنہ تم دونوں اپنے گھر کے ہی بچے ہو' ایمن' مائرہ کی اکلوتی اولاد ہے' جس کے وہ سارے ارمان پورے کرنا چاہتی ہے پھر ہمارے گھر کی بھی آخری شادی ہوگی۔"

ارسل کی خاموشی کو قدرے رضامندی جان کر وہ بیگ گود میں رکھے اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں جبکہ ارسل نے ماں کی ساری گفتگو بڑے تحمل سے سنی تھی۔ وہ ابھی سو کر اٹھا تھا' آفس سے اس نے آف لیا تھا اور اب چائے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ سائرہ رحمان تک اپنی پسندیدگی واضح طور پر پہنچا چکا تھا اس دن کی بحث کے بعد ان کے بیچ یہ ٹاپک پھر نہیں چھڑا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بھی اس قصے کو بھول چکی ہیں۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ سائرہ رحمان بھولنے والی نہیں تھیں۔

"میرا مائنڈ آل ریڈی سیٹ ہے اور کس کے لیے ہے یہ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں۔" اس نے بہت سکون سے جواب دیا۔ وہ ان کے ساتھ کوئی تلخ کلامی نہیں چاہتا تھا کیونکہ مطیع الرحمان گھر پر نہیں تھے۔

"تو تم اس لڑکی کے چکر سے باہر نہیں نکلو گے' اپنی ماں کو انکار کرو گے اس کی وجہ سے' میں کیسی ماں ہوں؟ کہ میرا اپنا بیٹا' میرا خون' میری چھوٹی سی خواہش نہیں پوری کر سکتا' کسی دوسری عورت کو اپنی ماں پہ ترجیح دے رہا ہے۔" سائرہ رحمان ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"چھوٹی سی خواہش ماما!" اس نے ماں کے الفاظ

وہ دو بدو تیزی سے بولی۔

"اچھا چلو اس سب میں اللہ کی رضا بھی تو شامل ہے اب جو ہو گیا سو ہو۔"

"تم مردوں نے اپنے فائدے اور حصول کے لیے ہم عورتوں کو خدا کے نام پہ ڈرانے دھمکانے کے لیے ایسی بہت سی آیتیں اور احادیث یاد کی ہوتی ہیں مگر میں کوئی ٹیپیکل وومن نہیں ہوں جو تمہاری باتوں میں آجاؤں گی اگر تمہیں یونہی بچوں کی لائن لگانی تھی تو چک 42 کی کسی جاہل گنوار سے بیاہ کرتے منصور! جو تمہارے درجن بھر بچوں کی ماں بنتی۔" وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

"درجن بھر نہیں ماہی! صرف تین۔"

"مجھے نہیں چاہیے مزید بچہ دو بیٹے کافی ہیں۔" اس نے گویا فیصلہ سنایا۔

"ماہی! ہر عورت اس دور سے گزرتی ہے یہ سب تو قدرتی ہے۔"

"میں مزید ایک لفظ نہیں سنوں گی۔" اس نے منصور کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔

"کیا کرو گی تم؟" اس نے بھی ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ہو گا یہ بچہ میں اس کا..."

"جسٹ شٹ اپ ماہی! شرم آنی چاہیے اتنا گھٹیا سوچتے ہوئے۔"

اس نے پہلی بار اسے اتنی سختی سے ٹوکا تھا۔ اس کے ماتھے پر پڑے بل ماہم کو مزید غضب ناک کر گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی ماجدہ دودھ لائی۔ اس سے دودھ کا گلاس لیا اور وہ پھر اس کے پاس آبیٹھا۔

"یہ پی لو۔" اس نے نظریں چراتے گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"نہیں پینا میں نے دودھ کچھ نہیں کھانا مجھے اب تم مجھ پر چلاؤ گے۔ محبت کا ڈھونگ رچاتے ہو میری ٹینشن کی تمہیں پروا نہیں زر خرید غلام ہوں میں کوئی مشین ہوں۔"

دودھ کا گلاس اس نے ہاتھ مار کر گرا دیا۔ وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ منصور سے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بابا جانی!" اس نے آفس میں داخل ہوتے ہی حسب معمول سلام کیا۔

مطیع الرحمان فون پر بزی تھے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دے کر وہ جلدی سے بات سمیٹنے لگے۔

"ٹھیک ہے آپ میری سیکریٹری سے ڈیٹیل لے لیجیے گا میں اسے بریف کر دوں گا۔

جی او کے اللہ حافظ۔"

ریسیور کریڈل پہ ڈال کر انہوں نے حیرانی سے ارسل کو دیکھا۔

"ارسل! آپ نے تو آن آف کرنا تھا۔"

"ہاں گھر میں سکون ملتا تب نا۔" تھکا ہوا لہجہ بہت دھیما سا تھا۔

"تمہاری ماں نے کچھ کہہ دیا۔" وہ لمحہ بھر میں معاملہ بھانپ گئے۔

"بابا آپ صرف "کچھ" کہتے ہیں شاہم میری زندگی ہے اور اس سے جدائی کا لفظ بھی موت ہے میرے۔"

"ارسل" ان کا دل ڈوب سا گیا۔

"تمہاری حسب خواہش ہی سب ہو گا اسے میں خود ہینڈل کروں گا۔ تم ناحق ٹینشن لے رہے ہو۔"

"بابا جانی! وہ مجھے ٹارچر کرتی ہیں میں کیسے انہیں سمجھاؤں کہ شاہم ایک اچھی لڑکی ہے۔" وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ "اور اگر اچھی نہ بھی ہوتی تو تب بھی بابا جن سے محبت کی جاتی ہے۔ ان کے عیبوں کو انگلیوں پر نہیں گنا جاتا۔"

انہوں نے ارسل کو نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے سائرہ سے اس موضوع پر پھر بات کی تھی ان کے انکار کا اٹل اور حتمی انداز ایسا تھا کہ مطیع الرحمان سمجھ گئے کہ وہ کسی بھی صورت ماننے والی نہیں ہیں۔

"بابا جانی! آپ لوگ ابھی تک شاہم کی فیملی سے نہیں مل سکے وہ تو مجھے فراڈ سمجھیں گے۔ میں کب تک اسے ٹالوں۔"

اب اس کی پریشانی میں غصہ شامل ہونے لگا تھا۔

"مجھے ہی کوئی حتمی فیصلہ لینا پڑے گا۔" وہ پرسوچ انداز میں بولے۔

"سائرہ بہت ضدی ہے جب اڑ جاتی ہے تو پھر بمشکل ہی مانتی ہے تمہیں یاد ہو گا معاذ (بڑا بیٹا) کی دفعہ اس نے کیسا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ معاذ اور اس کی بیوی کا جینا حرام کر دیا تھا حالانکہ وہ تمہاری ماں کا منتخب کیا ہوا تھا مگر اس سے معاذ کی بیوی کا وجود برداشت نہیں تھا کیونکہ وہ معاذ کی پسند تھی۔ اب۔ اب تمہاری شادی اس کی رضا مندی کے بغیر اور میرے ایما پر شاہم سے کر دی جاتی ہے وہ بھی اس صورت میں کہ تم اس کی بھانجی کو ریجیکٹ کر رہے ہو تو اندازہ لگا لو کہ وہ شاہم کا کیا حال کرے گی۔

"آئی تھنک.... تم آل ریڈی ہی اپنی زندگی الگ سیٹل کر لو تو یہ ہم دونوں باپ بیٹا کے لیے بہتر ہو گا۔" یہ سب ارسل سے کہتے ہوئے وہ ہچکچا رہے تھے۔

ایک بیٹا پہلے ہی ماں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر جا چکا تھا دوسرے کو وہ دل پہ پتھر رکھ کر خود جانے کا کہہ رہے تھے۔

"پلیز بابا جانی! میں آپ سے ایک دن بھی دور نہیں رہ سکتا۔"

وہ باپ کی پلاننگ سن کر بھونچکا رہ گیا۔

"میں کون سا تم سے دور جا رہا ہوں ہمارا آفس ایک ہے میں تمہاری طرف آجایا کروں گا بس کچھ عرصہ کے لیے جب تمہاری ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو تم ہمیشہ کے لیے واپس آجانا۔" انہوں نے بڑی شفقت سے اسے سمجھایا۔

"آپ پھر سے اچھی طرح سوچ لیں بابا جانی! کہیں ممی اتنی بڑی جرأت پر ماما مجھے ہمیشہ کے لیے گھر سے بے دخل نہ کر دیں۔ ساتھ میں آپ کا ناطقہ بھی بند۔"

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا تم اپارٹمنٹ کی چابی مجھ سے لے لو اس کا فرنیچر چینج کرواؤ ڈیکوریٹ کرو میں تمہاری ماں کے ساتھ لاسٹ ٹرائی لوں گا۔ شاید وہ مان جائے ورنہ اب میں تمہاری شادی میں تاخیر نہیں چاہتا۔"

اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

اس رات سے ہی ماہم نے پراسرار سی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ منصور سے بہت کھنچنے لگی تھی۔ منصور نے بھی اس کی بدتمیزی اور غلط سوچ کا احساس نہیں دلایا وہ معاملے کو مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ ماہم نے دوبارہ بچے کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اتنے پہ ہی خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ وہ کوئی بات کرتا یا پوچھتا وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیے جاتی۔ منصور کو اس کی یہ لاتعلقی بہت چبھ رہی تھی۔ اس پہ مستزاد وہ کھانے پینے پہ بالکل توجہ نہیں دے رہی تھی۔ ٹیبل پہ سب سے آخر میں آتی۔ اور تھوڑا سا کھانا ٹونگ کر اٹھ جاتی۔ ان دنوں اسے خوراک کی زیادہ ضرورت تھی۔ عمیر اور حمزہ کی دفعہ بھی اس نے اپنے ساتھ منصور کی جان بھی عذاب میں ڈالے رکھی تھی۔

رات کو اس کی ضروری میٹنگ تھی۔ وہ ڈنر کیے بغیر ہی گھر سے نکل گیا پھر ساڑھے گیارہ بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ دن بھر آفس کے بکھیڑے اور اس میٹنگ نے اسے بہت تھکا دیا تھا۔ وہ تھوڑا سستانے کے لیے اوپر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے لاؤنج کے صوفے پر اپنا کوٹ اور بریف کیس پھینک کر ٹانگیں آگے کو پھیلائے بیٹھ گیا۔

"صاحب جی چائے پئیں گے۔" ماجدہ ابھی تک کچن میں مصروف تھی اس کی آمد پر پوچھنے آگئی۔

"نہیں تم ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں؟"

اس نے صوفے کی پشت سے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھا

کر پوچھا۔

"وہ بی بی جی کھانا نہیں کھا رہی تھیں دوبار میں پڑے لگا کرنے گئی۔ شاہم بی بی نے بھی منت سماجت کی مگر مانی نہیں' ان کا بی پی لو تھا' بہت [illegible] اس لیے میں لیٹ ہو گئی۔"

ماجدہ کی بات سن کر وہ یکدم سیدھا ہو گیا۔ مایوسی اور فکر مندی اس کے چہرے پر ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ سیدھا اوپر چڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور لائٹ بھی جل رہی تھی۔

"ماہی!" اس نے بے تابانہ اس کے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔

"کچھ سنبھلی تمہاری طبیعت یا ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

اس کی آنکھوں اور چہرے سے فکر مندی عیاں تھی۔

ماہم یونہی اسے تکے چلی گئی۔

"میں اب بہتر ہوں منصور! پلیز مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"بالکل جھوٹ' بھوکے پیٹ بھلا کیسے نیند آتی ہے؟"

اس نے فوراً" تردید کی تھی۔

"میرا جی کھانا کھانے کو نہیں چاہ رہا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"او کے' مگر دودھ اور ایک سیب تو کھا لو' میڈیسن لو اور سو جاؤ۔" وہ ذرا بھی اس کے انکار کو خاطر میں نہ لایا۔

اس نے بیڈ کراؤن کے دراز میں لا کر رکھی گئی اس کی میڈیسن چیک کیں ساری کی ساری دوائیاں ویسے ہی دھری تھیں۔ اس نے ایک گولی بھی نہیں لی تھی۔ جو یقیناً" منصور سے واضح ناراضی کا اظہار تھا۔

وہ خود کچن میں چلا آیا۔ ماجدہ شاید جا چکی تھی۔ اس نے دوبارہ بلانا مناسب نہ سمجھا۔ فریج میں سے دودھ نکال کر ساس پین میں گرم کرنے لگا۔ پھر سیب نکال کر سنک میں دھویا اور پلیٹ میں چھری کے ساتھ رکھ لیا۔

خود اس نے بھی کب کچھ کھایا تھا مگر اس کے ناز نخرے کس نے اٹھانے تھے ماہم نے تو مروتاً بھی نہیں پوچھا تھا۔

"اب سے صبح ہے ماہی' تم تو ناراضی کی آڑ میں اپنی صحت برباد کر لو گی۔" سیب کی قاش کاٹ کر اس نے ماہم کے منہ میں ڈالی۔ دوسری قاش کے لیے منصور کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ اس نے پکڑ لیا خود دانتوں سے کتر کتر کر کھانے لگی۔

پلیٹ اس کی گود میں دھر کے وہ چینج کرنے کے لیے اٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس نے مایوسی سے موبائل آف کر کے بیڈ دراز میں ڈال دیا۔ وہ پچھلے تین دن سے ارسل سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کا سیل فون مسلسل [illegible] رہا تھا۔ [illegible] نے آخری دفعہ شاہم سے بہت روتے اندازمیں بات کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ چار دن کے لیے کہیں جا رہا ہے۔ شاہم نے بھی غصے میں آ کر اپنا فون بند کر دیا۔ اس کا کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب عجیب سے وہم اسے ستاتے رہتے۔ ارسل کی ماما [illegible] وہ جانتی تھی۔

متضاد سوچوں سے اس کے اندر گھٹن بڑھنے لگی تو اس نے گھبرا کر کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ نیچے لان کے منظر میں ماہم اور منصور بیٹھے ہوئے تھے۔ ماہم اسے کچھ بتا رہی تھی منصور اس کی بات پہ ہمہ تن گوش تھا۔ منصور کو دیکھ کر اسے پھر ارسل یاد آنے لگا۔ بظاہر بہت لا ابالی' کھلنڈرا' شوخ سا ارسل اس کی ہر سیدھی بات کو توڑ موڑ کر اپنے مطلب کے جملے میں ڈھال لینے والا بالکل اسی طرح اس کے چہرے پر نظریں گاڑے بہت انہماک اور محبت سے اس کی گفتگو سنا کرتا۔

منصور دھیما دھیما مسکرا رہا تھا۔ اس کی نظریں ماہم کے چہرے کا گھیراؤ کیے ہوئے تھیں پھر ماہم کے اٹھنے کے ساتھ ہی منصور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں اندرونی حصے کی طرف آ رہے تھے جب

منصور کو شرارت سوجھی وہ ماہم سے دو قدم پیچھے تھا۔ اس نے گھاس پر پڑے پانی کے پائپ کو بہت محتاط انداز سے اٹھالیا اور سیدھا رخ ماہم کی پشت کی طرف موڑ دیا۔ ماہم بجلی کی سی سرعت سے پلٹی وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔

وہ اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ منصور کو وارن بھی کرتی جارہی تھی۔

پانی پانی کے اس کھیل سے لطف اندوز ہوتی شاہم بھی اپنا سارا دکھ بھول کر کھلکھلانے لگی۔

ماہم نے شیفون کی باریک ہاف سلیوز کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ پوری کی پوری بھیگی ہوئی اپنا بچاؤ کرتی منصور تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے تھوڑی سی کوشش سے منصور کے ہاتھ سے پانی کا پائپ جھپٹ لیا۔ اب پانی کی موٹی دھار منصور کی طرف مڑ چکی تھی۔ مگر منصور نے جلد ہی ماہم پر قابو پالیا۔

"یہ منصور بھائی کبھی کبھی ارسل کی طرح شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ بالکل بچوں جیسی...؟" وہ پھر بے خیالی میں ارسل کو سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

پانچویں دن شام کے وقت ماہم لان میں بیٹھی تھی۔ ملازم نے ارسل کے آنے کی اطلاع دی۔ ماہم نے اسے وہیں اپنے پاس بلالیا۔

"السلام علیکم ماہم آپی!" وہ مؤدب سا بولا۔

"وعلیکم السلام' آؤ ارسل! بیٹھو۔" ماہم نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ شاہم ہے گھر پر؟" وہ ذرا نروس ہوا۔

"ہاں گھر پر ہی ہے اس نے کہاں جانا ہے' جب سے تم اسلام آباد گئے ہو' وہ سارا دن اپنے کمرے میں زبردستی رہتی ہے۔"

ارسل کے اسلام آباد جانے کا جھوٹ شاہم نے ہی ماہم کو سنایا تھا۔

ارسل' شاہم کے جھوٹ کی گہرائی جان کر دل ہی دل میں شرمندہ ہوا۔

"چائے پیو گے یا کافی؟" ماہم نے گود میں دھرا اخبار اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر دھر دیا۔

"نہیں' تھینک یو' ابھی آفس سے چائے پی کر آرہا ہوں' آپ سے ایک پرمیشن لینی تھی بلکہ ریکویسٹ ہے۔" اس نے بہت عاجزی سے کہا۔

"ہاں کہو۔" ملازمہ کو پکارتی ماہم رک گئی۔

"وہ میں شاہم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں' ڈنر کا پروگرام ہے' ایکچوئیلی وہ ناراض ہے تو...؟" اس نے زمانے بھر کی مسکینیت اپنے چہرے پر طاری کر لی۔

"ٹھیک ہے مگر۔ مگر ذرا جلدی چھوڑ جانا ورنہ منصور ناراض ہوں گے۔"

اس نے ماجدہ کو شاہم کو بلانے کے لیے کہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں سر جھاڑ منہ پہاڑ شاہم حاضر تھی۔

جہاں ارسل کو اتنے دن بعد دیکھ کر شاہم کو دل میں خوشی اور حیرانی ہوئی تھی۔ وہاں ارسل بھی اسے اس حالت میں دیکھ کر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"شاہم! ارسل تمہیں لینے آیا ہے' جاؤ جلدی سے اپنا حلیہ درست کرو۔"

"جی۔" وہ ماہم کے حکم کی تعمیل کے لیے تیزی سے پلٹی۔

ماہم یہاں موجود نہ ہوتی تو وہ بھی اسے خوب کھری کھری سنا کر ساتھ جانے سے انکار کر دیتی۔

پھر سارے رستے گاڑی میں بھی ارسل چپ رہا۔ شاہم کی بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ایک بلڈنگ کے نیچے اپنی گاڑی پارک کرنے لگا۔ ایک اپارٹمنٹ کے باہر اسے رکنے کا کہہ کر وہ خود اندر چلا گیا۔ اپارٹمنٹ اندھیرے میں ڈوبا تھا لائٹس روشن کر کے وہ اسے لینے باہر آیا۔

"اب آؤ۔" اس نے بیرونی دروازہ کھول دیا۔

وہ جو ڈیڑھ گھنٹے سے ارسل کی سنجیدگی سے شش و پنج میں مبتلا تھی آگے بڑھی مگر دہلیز پہ قدم دھرتے ہی وہ رک گئی۔ گلاب کی پتیوں کا ریڈ کارپٹ کافی اندر تک

ماسٹر بیڈ روم شاید کسی کمرے پہ ختم ہوتا تھا۔ اسے یونہی کھڑا دیکھ کر ارسل نے اس کا ہاتھ تھام لیا اپنے پیچھے ایک بہت سے دروازہ بند کرتے ہوئے وہ اس کے ہمراہ بڑا دلہن دلہن چلنے لگے۔ گلاب کی بھینی بھینی سی خوشبو چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بہت معنی خیز سی پراسرار خاموشی ان کے حواسوں پر چھائی جارہی تھی۔ ارسل نے ہینڈل گھما کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی جیسے ابھی یہاں کسی دلہن نے آکر سیج پر بیٹھنا ہو۔

عنابی بیڈ شیٹ عنابی پردے اور عنابی ہی رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ بیڈ کا سارا وسط گولائی میں گلاب کی پتیوں سے بھرا تھا چھت سے بہت نازک خوبصورت سا کرسٹل کا فانوس لٹک رہا تھا۔ بیڈ کے اطراف میں باریک ریشم جیسا ریڈ کلر کا پردہ بہت اچھا تاثر دے رہا تھا۔ کمرے میں صرف کینڈل اسٹینڈ کی روشنی تھی۔ اس ٹھنڈی مدھم روشنی میں کمرہ بالکل سی حیرت کدے کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ وہ سانس روکے بت بنی کھڑی تھی۔

"ارسل یہ... جیسے ڈرائنگ کی حالت میں بولی۔

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا۔

"واٹ از دس؟"

"یہ سب کا سب تمہارے لیے ہے۔" وہ ایک جذب سے مدہوشی میں بولا۔

ریڈ کڑھائی والی وننگ شرٹ اور تنگ چوڑی دار پائجامہ میں ہلکا سا سنگھار کیے وہ اسے مکمل طور پر اس کمرے میں سیج کے بیٹھنے والی چیز لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ جب شاہم اس کمرے میں آئے تو اس نے ریڈ کلر پہنا ہو۔

"اب بس ایک چیز کی کمی ہے' آں۔ آں۔ کہاں گئی؟ جسٹ ون سیکنڈ۔" وہ اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کے تلاشی لے رہا تھا۔

"مل گئی۔" اس نے گولڈن کلر کا کیس نکالا تھا۔ پھر اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ڈائمنڈ رنگ بڑی محبت سے پہنادی۔

"یہ کس لیے؟" اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ارسل کی محویت توڑی۔

"جہاں تک میری معلومات ہے' منہ دکھائی کا تحفہ دیا جاتا ہے۔"

اپنے نچلے ہونٹ کا بایاں کونا دانتوں تلے دبائے اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

"ارسل! تم...!" اسے مارنے کے لیے آنکھیں نکال کر اس نے بازو اٹھایا مگر پہلی دفعہ اسے سچ مچ پیار آگیا۔

"یو نو' میں ناراض تھی تم سے' بہت زیادہ۔" شاہم نے یاد آنے پر اسے بتایا۔

"ہم نہ ہوں گے تو کون منائے گا تمہیں۔"

یہ بری بات ہے' ہر بات پہ روٹھا نہ کرو۔"

مدھم لہجہ کی سرگوشی اسے مدہوش کیے دے رہی تھی۔

"ارسل! تم یہاں کیوں شفٹ ہو گئے ہو؟"

اس نے ماحول کے فسوں کو کم کرنے کے لیے موضوع بدل دیا۔

"یہاں شفٹ نہیں ہوا فی الحال' باقی تفصیل فارغ وقت میں سناؤں گا' ابھی ہم ڈنر کے لیے جارہے ہیں۔ میں نے ماہم آپی سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں جلدی چھوڑ جاؤں گا۔" اس نے ابھی اسے کچھ بھی بتانا مناسب نہ سمجھا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج منصور کے بے حد اصرار پر شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ اسے خریداری کرنا' دکان سے دکان تک پھرنا' بھاؤ تاؤ گھنٹوں کپڑوں کی چھان پھٹک سے سخت چڑ تھی۔ اس کی ہر طرح کی شاپنگ منصور ہی کرتا تھا۔ کبھی کبھار منصور اس کا ہر اعتراض اور بے زاری بالائے طاق رکھ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لاتا۔ یہ الگ بات تھی کہ تب بھی ہر چیز منصور کی مرضی کی ہوتی۔

الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے مطابق اس بار بیٹی کی پیدائش متوقع تھی منصور بہت خوش تھا۔ بار بار ماہم

کزن بتا سکتا تھا۔" غنی نے تاسف سے کہا۔

"غنی۔۔۔" اس نے کچن کے شیلف کے قریب ایستادہ غنی کو یکدم ہی گریبان سے دبوچ لیا۔ "ایسی لڑکی جسے کوئی بھی پیسے دے کر لے جا سکتا ہے، اسے اپنی ماں، بہن بنالوں؟" اس کی سرخ آنکھوں میں غراہٹ تھی۔

"میرا گریبان چھوڑ کاشا!" غنی نے اپنا گریبان دبوچے اس کے دونوں ہاتھوں پہ دباؤ بڑھایا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ ہٹالیے۔

"سات سال سے تم کاشا کو نہیں سمجھ سکے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ "پی کر میں آرہا ہوں، مدہوش تم ہو رہے ہو۔" نفی میں سر ہلا کر اس نے اطمینان سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔

"اب میرا منہ نہ دیکھ، بیٹھ کھالے تو بھی۔" اس بار بت بنے کھڑے غنی کو بھی دعوت دی۔

"تھینک یو، میں کھا چکا ہوں۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"یوں مسکینوں کی طرح کھڑا نہ ہو، جا میرے لیے ایک کپ چائے بنا دے، پلیز!" اس نے پچکارا۔

غنی نے چپ چاپ اس کے لیے چائے کا کپ بنادی۔ وہ کھانا ختم کر چکا تو اس نے برتن اٹھا کر سنک میں دھر دیے۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوتے دروازے میں رک گیا۔

"غنی! آج میں نے مارکیٹ میں ماہم کو دیکھا تھا۔" اتنا کہہ کر اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ غنی اس کے الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼
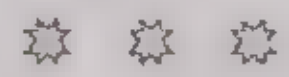
اس کے آفس جانے تک وہ نیند میں تھی۔ وہ تیار ہو کر آفس کے لیے نکل گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ ناشتے کے لیے آیا تو ماہم نہ صرف اٹھ گئی تھی بلکہ گم صم سی بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

منصور نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔ ایک ہی رات میں اس کی آنکھوں کے گرد مدھم سے حلقے پڑ گئے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی ابھی بھی تھی۔ چہرہ بہت ہی ڈل لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے ماہم؟" اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نظریں جھکا دی تھیں یا چرالی تھیں۔ وہ جان نہ پایا۔

"اوں۔۔۔ ہوں، تم اچھی بھلی تھیں۔ شاپنگ کے دوران بہت فریش تھیں، پھر اچانک کیا ہو گیا تھا؟" منصور نے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے وہ بھونچکا رہ گئی۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے منصور!" اس نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "یو نو ویل، میں ہمیشہ شاپنگ کرنے سے گھبراتی ہوں، تم نے اتنا اصرار کیا تو میں چلی گئی۔" اس نے بوکھلا کر وضاحت دی۔

"آپ بریک فاسٹ لیں منصور! میں روم میں جا رہی ہوں۔" وہ اس سے نظریں کتراتی اٹھ کر چلی گئی۔

"تو تم کہتی ہو کچھ خاص نہیں۔" اپنے برابر ماہم کی خالی جگہ دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔

اتنے سال بعد [illegible] مارکیٹ میں کاشا کو دیکھتے ہی بیدار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے تئیں منصور سے شادی والے روز اپنا ماضی دفن کر چکی تھی۔ وہ ماضی جو نظر اندازی کے باوجود ہمیشہ اس کے سنگ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے ماضی کو بھول چکی تھی تو منصور کے ساتھ اس کے اکھڑے اور قدرے لاتعلق رویے کی وجہ کیا تھی؟

منصور کی محبت وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی، جہاں دینے کی باری آتی وہ خود پہ بے نیازی، بے حسی کا خول چڑھا لیتی، منصور کے حصے میں بے زاری، اکتاہٹ اور اس کی ہٹ دھرمی ہی آتی۔ اور یہ سب کرنے میں وہ خود کو حق بجانب ٹھہراتی۔

گزرے کل سے وابستہ اس شخص سے اس کی رفاقت محض دو برس کی تھی۔ منصور کے ساتھ کو پانچ سال ہونے کو آئے تھے۔ منصور اس کا شوہر، بچوں کا باپ، اس کا سائبان، اس کی عزت کا محافظ تھا۔ اس کی عقل، یہ سب تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے آنکھیں بند کر کے، ذہن کو سونے پر آمادہ کرنا چاہا، پر تھوڑی دیر میں بے چینی سے آنکھیں کھول دیں۔ منصور کو تکنے لگی جو سو رہا تھا۔ منصور کا بازو ابھی بھی اس کے سر کے نیچے تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنا سر اٹھا کر منصور کا بازو نیچے سے نکال دیا اور اس جگہ پہ تکیہ درست کر لیا اور کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ بیڈ شیٹ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے اس کے نظروں کے سامنے کسی کا چہرہ تھا۔

پچھلے تین دن سے وہ اذیت سے گزر رہی تھی۔ جو ہو چکا وہ اسے یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو تھا اس کے پاس، اس کے ساتھ رہنے میں بھی اسے دشواری ہوتی تھی۔

وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، رخ موڑ کر منصور کو دیکھا۔ کتنی دیر اس بے خبر کو تکتی رہی۔

"میں بے وفا نہیں ہوں مگر تم سے وفا نہ کر سکی۔" اس نے دل میں ہی اسے مخاطب کیا۔

تکیے کے پاس دھرا موبائل اٹھایا، احتیاط سے چلتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آگئی۔ مدھم سی روشنی میں وہ صوفے میں دھنس کر اسی لینڈ لائن نمبر کو یاد کرنے لگی جو کبھی اس کی فون بک کا اکلوتا نمبر ہوتا تھا۔ جو اتنا عرصہ گزرنے پر بھی اسے یاد تھا۔

بیل ہو رہی تھی، مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔

وہ رات کو اپنے بیڈ روم فون سیٹ کا پلگ نکال کر سوتا تھا۔ اس رات اسے یاد نہیں رہا تھا۔ بجتی گھنٹی نے اس کی نیند خراب کر دی تھی۔ منہ پر رکھا تکیہ اس نے پرے ہٹایا، مندی ہوئی سرخ آنکھوں سے فون کو گھورا۔ حواس تو بیدار ہو ہی چکے تھے۔ اوندھے منہ لیٹے ہی اس نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو۔۔۔" اس کی آواز میں کھا جانے والی غراہٹ تھی۔

دوسری طرف مکمل سکوت چھا گیا۔ الفاظ اس کے حلق میں ہی پھنس گئے۔

"ہیلو۔۔۔" اب وہ کافی سختی سے بولا۔

اب بھی اگر جواب نہ ملتا تو وہ گالیوں کا طوفان اگلنے والا تھا۔

"ہ۔۔۔ ہیلو۔۔۔" خاموش گھر میں اس کی مدھم سی آواز دل کی دھڑکنوں کو منتشر کر گئی۔

کاشا کی آنکھیں اس ڈری سہمی "ہیلو" پہ کھل گئیں۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی، اس یادداشت نے تو اسے اب تک خوار کر رکھا تھا۔ وہ پہچان گیا تھا۔ اسے خود بھی اس کال کا شدت سے انتظار تھا۔

"ماہم۔۔۔" اس نام کو لیتے وہ سیدھا ہو گیا۔

"ابھی تک یاد ہے تمہیں۔" اس کے منہ سے اپنا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"بھولی ہی کب ہو؟" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہو؟" اس کے اقرار نے اسے حوصلہ دیا۔

یہ احساس بہت پرسکون کرنے والا ہوتا ہے کہ جس کے لیے ہم بے چین رہتے ہیں چین اسے بھی نہیں۔

"ہاں تقریباً" "اینڈ یو؟" کاشا کے لہجہ میں آپوں آپ نرمی گھلتی جا رہی تھی۔ ورنہ کاشا کی نیند خراب کرنے والے کی شامت بہت بری آتی تھی۔

"چھوڑو میری۔۔۔"

"تمہیں ہی تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

ماہم کے اندر کا قفل ٹوٹ گیا، اس کے خود پر بٹھائے گئے سارے پہرے اٹھ گئے۔

"مل سکتے ہو؟"

کاشا کے ایک جملے نے اس سے کتنا بڑا فیصلہ کروالیا تھا۔ اپنے اس اقدام کی وجہ اور نتیجہ وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ)

☼

حرا قریشی

کھلا کسی پہ کیوں
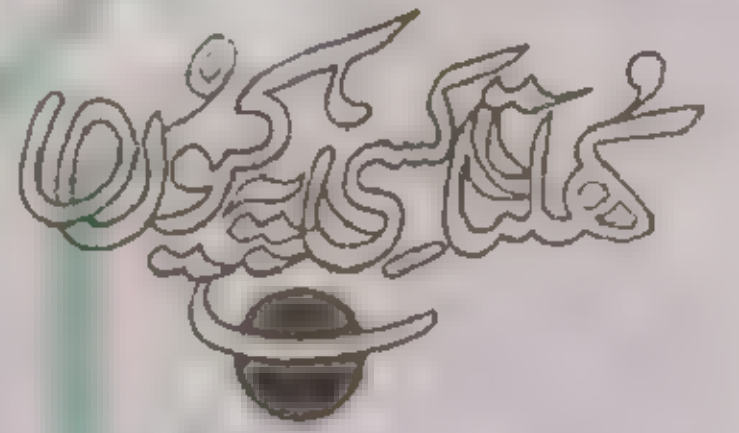
"اف وردہ! کس مصیبت میں ڈال دیا۔" ناجیہ نے بیچارگی سے کہتے ہوئے کتاب بند کی اور وردہ کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

"خبردار جو میرے بھائی کو مصیبت کہا۔" وردہ نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے بولی۔

"تمہارے بھائی کو کون کہہ رہا ہے۔ مگر یہ شاعری تو کسی مصیبت سے کم نہیں۔ مجھ سے یاد ہی نہیں ہو رہی۔ تم انہیں صاف صاف بتا دو' تم نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے شاعری کا کوئی شوق ووق نہیں ہے۔" ناجیہ نے اپنی طرف سے بہت اچھا حل بتایا تھا۔

"واہ واہ۔ کیا بات ہے محترمہ کی۔ لیکن میری محبت میں اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔ صرف چند دن کی تو بات ہے۔ بس شادی ہو جائے پھر بے شک بھائی پر تمہاری اصلیت کھل جائے۔ پھر تم جانو اور بھائی جانیں۔ میری تو اس فوزیہ سے جان چھوٹ جائے گی نا!" وردہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کچھ ہمت بھی دلائی۔

"تمہاری اس فوزیہ سے جان چھوٹ جائے گی اور میری جان ہمیشہ کے لیے اس شاعری کی وجہ سے عذاب میں آ جائے گی۔" ناجیہ نے اسے گھورتے ہوئے ایک دفعہ پھر فرحت عباس شاہ کی "کہاں ہو تم" اٹھالی تھی۔

"اچھا ایک آئیڈیا ہے۔" وردہ کو اس کی مسکین صورت پر ترس آ گیا تھا۔ "ایسا کرتی ہوں میں تمہیں کچھ مشہور اشعار' غزلیں وغیرہ اور کتابوں کے نام ایس ایم ایس کر دیتی ہوں۔ تم کل ایسے شو کرنا جیسے میسجز چیک کر رہی ہو اور جو یاد نہ ہو' وہ دیکھ کر پڑھ لینا۔" وردہ نے التجا طلب نظروں سے ناجیہ کی طرف دیکھا۔

"زبردست! یعنی اب یہ سب نہیں رٹنا پڑے گا۔ اف وردہ! تم کتنی اچھی ہو۔ میری اتنی بڑی مشکل آسان کر دی۔ بس اب تمہیں اس فوزیہ سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری ہونے والی بھابھی تمہارے ساتھ ہے۔ دیکھنا میں کیسے دھاک بٹھاتی ہوں۔ فوزیہ کی شاعری میرے سامنے پانی بھرتی نظر آئے گی۔"

اتنی دیر سے ناجیہ جو وردہ کی تسلیاں سن کر بھی پریشان تھی مصیبت ٹل جانے پر جلدی جلدی اسے یقین دلانے لگی۔

☼ ☼ ☼

ارے آپ اب تک ہماری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکے؟ دراصل کچھ دن پہلے میرے بڑے بھائی جان نے اپنی بچپن کی دوست ناجیہ کی انجینئرنگ کرائی ہے۔ ویسے تو اب کوئی پریشانی کی بات نہیں مگر میری کزن فوزیہ اب بھی بھائی کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ جس نے مجھ سمیت ناجیہ کی بھی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میرے بھائی ایک مصروف ترین بزنس مین ہونے کے باوجود شاعری کے عشق میں مبتلا ہیں۔ ذرا فارغ وقت ملا اور وہ کوئی موٹی سی شاعری کی کتاب لے کر بیٹھے نظر آئیں گے۔ یہاں تک بھی بات ٹھیک ہے۔ انسان کو کسی چیز کا شوق ہے تو کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

شوق لینے تک رہتا تو بات پریشان کن نہ تھی مگر کچھ دن پہلے امی کے دل میں بھائی کی شادی کرنے کا ارمان جاگا۔ امی کے پوچھنے پر بھائی نے ارشاد فرمایا ان کی صرف ایک خواہش ہے کہ ان کی ہونے والی بیگم شاعری سے شغف رکھتی ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں کافی باذوق بھی ہونا چاہیے۔

بھائی کی اس عجیب و غریب فرمائش پر جہاں مجھے غصہ آیا وہیں امی نے اپنے لاڈلے کی واحد فرمائش

پوری کرنے کی ٹھان لی اور میرا وہ اپنی بچپن کی دوست ناجیہ کو بھابھی بنانے کا ہمیشہ کا خواب کھٹائی میں پڑتا دکھائی دیا۔

امی کے لیے بھی یہ بات پریشان کن تھی کہ آخر باذوق بہو کیسے تلاش کی جائے؟ پھر بھائی اور امی کی پریشانی میں نے ناجیہ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر دور کر دی۔ بھائی کو اس کے شاعری کی شیدائی ہونے کی بڑی مشکلوں سے یقین دہانی کروائی گئی تھی۔ ناجیہ اور ہمارا سالوں سے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ کیا سب اسے جانتے نہیں تھے؟ جس نے کورس کی کتابوں کو بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگایا ہو وہ بھلا شاعری کی کتابیں کہاں پڑھتی ہو گی۔ مگر میں نے ان دونوں کو اچھی طرح یقین دلا دیا کہ وہ اپنے فارغ وقت میں شاعری کے علاوہ کچھ پڑھتی ہی نہیں۔ بلکہ خالی پڑھتی ہی نہیں وہ تو خود شاعری کرتی بھی ہے۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ جھوٹ کی ایک حد تک بولنا چاہیے جتنا نبھ جائے۔ میں بھی کیا کرتی۔ امی کی چہیتی بھانجی فوزیہ کا بھوت ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا تھا۔ جو بات کا جواب بھی کسی کے شعر یا کسی اردو میں دیتی تھی کہ میرا تو سانس اٹکنے لگتا تھا۔ اسے مستقل طور پر گھر لے آنے کا مطلب تھا کہ چلتے پھرتے اردو ادب کو سر پر سوار کر لیا جائے جو مجھے کسی طرح منظور نہیں تھا۔

میری اتنی تعریفوں پر یقین تو ان دونوں کو کسی نہ کسی طرح آ ہی گیا۔ پھر کیا تھا' بھائی نے تو سب امی اور مجھ پر چھوڑ دیا اور ہم نے چٹ رشتہ اور پٹ منگنی کروا کر ہی دم لیا۔ میرا بس چلتا تو نکاح بھی پڑھوا دیتی مگر وہ کچھ ماہ بعد ہونا طے پایا تھا۔ اب بس مجھے ان کچھ ماہ بھائی اور ناجیہ کا سامنا نہیں ہونے دینا تھا۔ تاکہ بھائی کو ناجیہ کی شاعری سے لگاؤ کے جھوٹ کا پتا نہ چلے مگر برا ہو میری قسمت کا۔ ہر کام میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔ ابھی جب منگنی ہوئے کچھ ہی ہفتے گزرے تھے ناجیہ کی سالگرہ پر ہمیشہ کے خاموش' سیدھے سادے لگنے
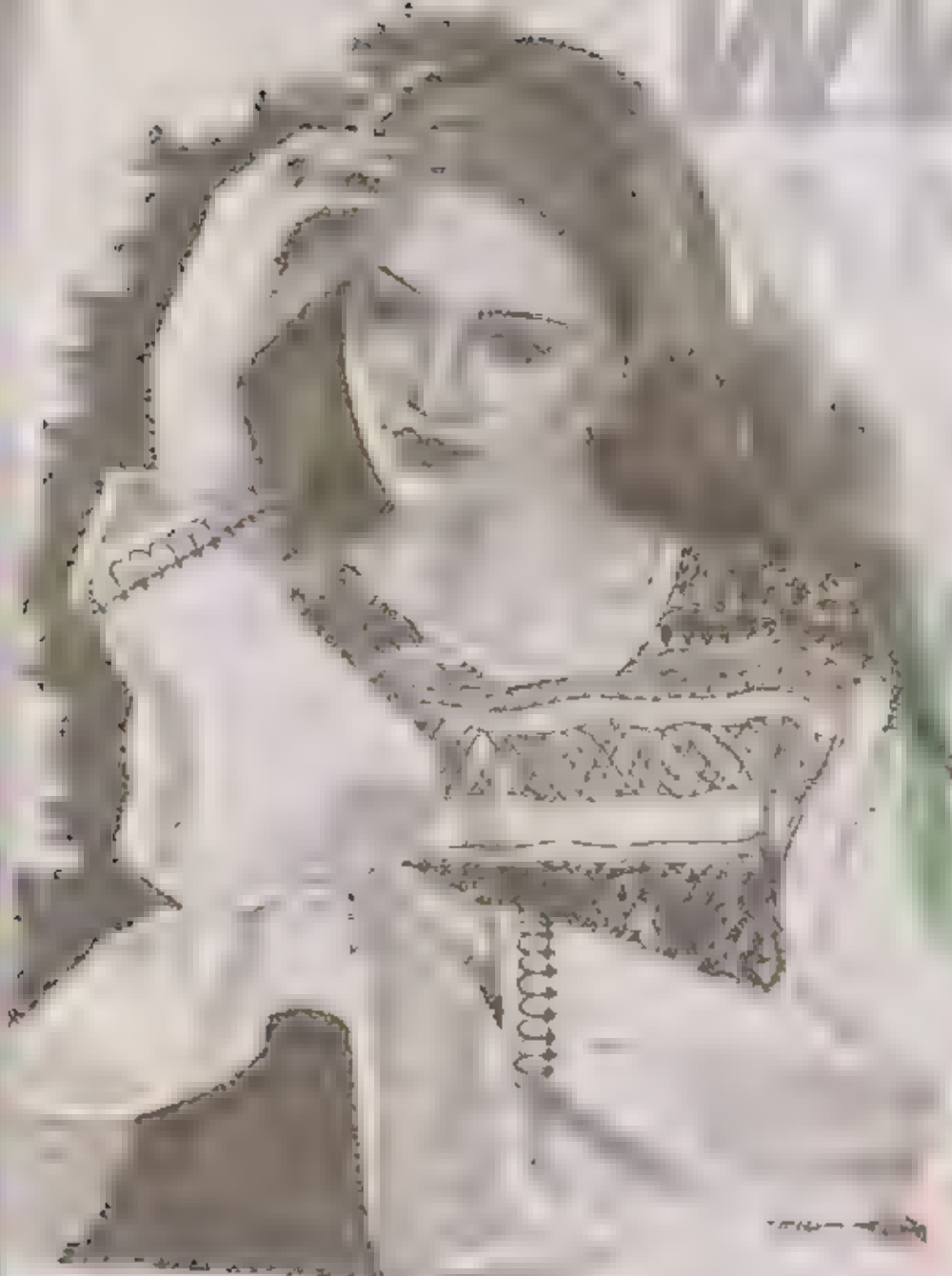
والے ہمارے بھائی محترم کی اسے ڈنر پر لے جانے کی فرمائش نے میرے ہوش ہی اڑا دیے۔

مجھے پورا یقین تھا ناجیہ کے گھر والے اسے جانے کی اجازت نہیں دیں گے مگر حیرت کا جھٹکا تو تب لگا جب امی نے بتایا کہ میں بھائی اور ناجیہ کے ساتھ ڈنر پر جا رہی ہوں۔ وہ بھی ٹھیک دو دن بعد پھر کیا تھا۔ مجھے جو بھی کرنا تھا ان دو دنوں میں کرنا تھا۔ ورنہ بھانڈا پھوٹتا تو میری خیر نہیں تھی۔

ایک گھنٹے بعد میں ناجیہ کے قدموں میں موجود تھی۔ پہلے اسے سچائی سے آگاہ کیا تو وہ آگ بگولہ ہی ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے اسے ٹھنڈا کیا۔ پھر اسے اپنے مشن میں شامل کرنے کے لیے پاپڑ بیلے۔ اگلے پچھلے سارے احسانات یاد دلانے سے وہ نہ مانی تو منتیں کر کے' دنیا کی سب سے بے ضرر نند ہونے کے بہانے خواب دکھا کر راضی کیا۔ فوزیہ سے اسے بھی چڑ تھی اور

ویسے بھی اب کوئی لڑکی بھائی کی طرف یا بھائی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیتے تو ناجیہ اس کی جان کی دشمن ہو جاتی تھی۔ ماننا تو تھا وہ تھی آخر۔ اس کی زندگی کا معاملہ تھا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن شام میں ہم نے ناجیہ کو اس کے گھر سے پک کیا اور بھائی کے فیورٹ ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ ناجیہ جو کل تک بہت نروس تھی اب اس کا اعتماد دیکھنے والا تھا، بس اپنا موبائل کسی متاع کی طرح ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ آرڈر دے کر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں شکر ہی کرتی رہی کہ بھائی کا شاعری کی طرف دھیان ہی نہیں جا رہا مگر شاید ناجیہ بی بی کو اپنی دھاک بٹھانے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ خود ہی بھائی سے ان کے فیورٹ شاعر کا پوچھ بیٹھیں اور بھائی تو جیسے ان کے منہ سے شاعری کا ذکر سن کر کھل اٹھے تھے۔ اچھی خاصی دیر پتا نہیں کون کون سے شعراء اور ان کی مشہور کتابوں کے نام لیتے رہے۔

میں نے ناجیہ کو گھورا جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنا سر ایسے ہلا رہی تھی جیسے سب کچھ سمجھ میں آ رہا ہو۔ جبکہ میں لکھ کر دے سکتی ہوں کہ آدھے سے زیادہ شعرا کا نام اس نے پہلے کبھی سنا ہی نہیں تھا۔

"آپ بھی تو بتائیں۔ آپ کس کا کلام پسند کرتی ہیں؟" بھائی کا یہ پوچھنا تھا اور میں نے ناجیہ کی طرف دیکھا۔ تیاری تو اس نے کافی کی تھی پھر بھی اگر کچھ یاد نہ رہتا تو موبائل ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس لیے میں نے اطمینان سے اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"مجھے تو فرحت عباس شاہ بہت پسند ہیں۔ ان کی شاعری میں اتنی خوب صورتی سے احساسات بیان کیے گئے ہوتے ہیں کہ انسان پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں ناجیہ کی ایکٹنگ کو داد دی۔

"بلکہ میں تو کہوں گی فرحت عباس شاہ میری فیورٹ شاعرہ ہیں۔" میں جو بڑے اطمینان سے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھی اپنی کرسی سے گرتے گرتے بچی۔

"شاعرہ! نہیں ــ" میں نے بے ساختہ پکار کر فخریہ مسکراتے ہوئے بیٹھی ناجیہ کو دیکھا۔ بھائی جو دونوں کا سب سے رہے تھے کیسے کنٹرول کر کر ان کی آنکھوں سے پانی آ گیا۔ ناجیہ بھی کچھ گھبرائی۔

"اوفوہ بھئی، یہ کیا آپ دونوں شاعری کی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ میں بور ہو رہی ہوں اور بھائی ویٹر سے کہیں جلدی کھانا لائے۔ بھوک کے مارے میرا حشر ہو رہا ہے۔"

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر میں کیا کرتی ناجیہ خود ہی اپنی جان کی دشمن بنی بیٹھی تھی۔

"ارے وردہ، اب تو باذوق لوگوں میں تم بدذوق بور ہی ہو گی۔" ناجیہ نے بڑے اسٹائل سے کہا تھا اور میرا دل چاہا اس کو کچا چبا جاؤں۔

"اچھا تو فرحت عباس شاہ آپ کی فیورٹ شاعرہ ہیں ویسے ندا فاضلی کی شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

عالیان بھائی نے اپنے اوپر بڑی مشکل سے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا اور میں ناجیہ کی بوکھلاہٹ پر ہو کے رہ گئی۔ بھائی کے سوال پر وہ کچھ گڑبڑائی کیونکہ یہ نام تو اسے میں نے رٹایا ہی نہیں تھا۔ میری طرف حسب عادت نظروں سے دیکھا تو میں نے بھی غصے سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ "اب بھگتیں محترمہ...!"

"ندا فاضلی ــــ اوہ ہاں۔ وہ بھی کافی اچھی شاعری کرتی ہیں۔ بلکہ ان کی کئی غزلیں میں نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھی ہیں۔"

"شاعری کرتی ہیں۔" سن کر میرا دل چاہا بال نوچ لوں۔ اپنے نہیں برابر میں بیٹھی ناجیہ کے۔ اس نے ایک اور شاعر کو شاعرہ بنا دیا تھا۔ مجھ سے مزید ہضم نہیں ہوا اس لیے وہاں سے اٹھ گئی۔

"میں ابھی امی کو کال کر کے آتی ہوں۔" میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی کہ اسے ایس ایم ایس کر کے ہی بتاؤں کہ اپنا شاعری نامہ بند کرے ورنہ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ مگر میرے مسلسل میسجز کرنے کے باوجود اس نے اپنے موبائل کی طرف نہ دیکھا تو میں واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ وہاں جیسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"وردہ تم نے بتایا نہیں، ناجیہ شاعری کی اتنی زیادہ فین ہے اور تم اس کے ساتھ کئی دفعہ مشاعروں میں جا چکی ہو۔"

میرے بیٹھتے ہی بھائی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اس جھوٹ پر ناجیہ کی طرف دیکھا مگر وہ میری طرف کب دیکھ رہی تھی۔ پٹر پٹر بولتی وہ اپنے باذوق ہونے کے نت نئے ہی ثبوت دیتی جا رہی تھی۔

"ارے خالی جاتے ہی نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک جگہ محسن نقوی بھی مدعو تھے۔ ان کی شاعری کا تو آپ کو پتا ہے۔ ایک دنیا دیوانی ہے۔ میں کتنے ہی ضروری کام چھوڑ کر صرف ان کی وجہ سے گئی تھی اور ناکامی ہی نہیں تھی ان سے آٹوگراف بھی لیا تھا۔"

ناجیہ تو لگتا تھا اپنی اداکاری پر بہت ہی خوش تھی۔ محسن نقوی جو اب اس دنیا میں نہیں تھے یہ محترمہ ان سے نہ صرف ملی تھیں بلکہ ان سے آٹوگراف بھی لیا تھا۔ میں اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ ناجیہ کو چپ کروانا اب میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا وہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر نان اسٹاپ ہوتی ہے۔

"یہ تو کافی تشویش ناک بات ہے۔" بھائی کی بڑبڑاہٹ میں نے واضح سنی تھی مگر شاید وہ نہیں سن سکی۔

"آپ تو شاعری کے بارے میں کافی معلومات رکھتی ہیں۔" بھائی نے امپریس ہونے کی اداکاری کی تو مجھے ان پر بھی غصہ آنے لگا۔ ناجیہ پرسکون بیٹھی تھی۔

"مجھے یاد ہے میں نے سب سے پہلے محسن نقوی کی شاعری کی کتاب لی تھی۔ شاید نائنتھ کلاس میں تھا میں، آپ کب سے شاعری کی شوقین ہیں؟ سب سے پہلی کتاب کون سی لی تھی؟" بھائی تو لگتا تھا اس کا امتحان لینے بیٹھے تھے۔ خوب مزے لے رہے تھے۔

"میں نے ـــ" ناجیہ اٹکی ـــ اسی وقت ویٹر ڈنر سرو کرنے لگا تو اس نے فوراً اپنے موبائل سے رجوع کیا۔ میں نے بھی شکر کا سانس لیا کہ شاید اب کچھ عقل مندانہ جواب آ جائے۔ مگر اس نے اپنا فون غصے سے بیگ میں ڈالا تو یہ آس بھی ختم ہو گئی۔

"تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" ویٹر کے جاتے ہی بھائی نے پھر پوچھا تھا۔

"وہ ــــ میں نے، میں نے سب سے پہلی شاعری کی کتاب وصی شاہ کی "میرے ہو کے رہو" لی تھی۔ میں تب نائنتھ کلاس میں تھی۔" ذہن پر زور دیتے ہوئے آخر کار ایک کتاب کا نام لے ہی لیا تھا۔ مگر افسوس ــ میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کھانا کھانا شروع ہو گئی۔ یہاں تو جو ہونا تھا، وہ ہو کر رہے گا۔ میں کیوں اس کے غم میں بھوکی رہوں۔

باقی کا وقت خاموشی سے کٹا۔ ناجیہ کو گھر ڈراپ کرتے وقت بھائی کی بات سن کر ناجیہ کے سارے کے سارے طبق روشن ہو گئے تھے۔

"وردہ نے بتایا تو تھا مگر مجھے آج سے پہلے یقین نہیں آیا تھا کہ آپ کو شاعری سے اس قدر لگاؤ ہے۔" بھائی نے بات شروع کی تو ناجیہ کی فخریہ مسکراہٹ دیکھنے والی تھی۔

"کیا اعلا ذوق پایا ہے ـــ اپنی باذوق دوست کے ارشادات تم بھی ذرا غور سے سن لو وردہ!" انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

"فرحت عباس شاہ ان کی فیورٹ شاعرہ ہیں، شاعر نہیں۔" عالیان نے شاعرہ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سات سال پہلے پہلی شاعری کی کتاب وصی شاہ کی "میرے ہو کے رہو" لی تھی۔ یعنی اس وقت جب وصی شاہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ کتاب بھی چھپنی ہے اور محفل مشاعرہ میں جانے کا جنون کی حد تک شوق رکھتی ہیں، کبھی کوئی مس نہیں ہوا۔ ابھی پچھلے مہینے "محسن نقوی" کے مشاعرے میں گئی تھیں۔ اور نہ صرف یہ کہ مشاعرے میں گئی تھیں بلکہ ان سے آٹوگراف بھی لے کر آئی ہیں۔ ویسے ایک بات پوچھ سکتا ہوں ناجیہ؟ یہ کون سے باذوق لوگ ہیں جو شعراء کا قبرستان تک پیچھا کرتے ہیں۔ محسن نقوی کی عرصہ ہوا ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

عالیان نے بامشکل اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے بتایا تو ناجیہ کا دل چاہا کہ وہاں سے غائب ہو جائے۔

"کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی وردہ؟" ناجیہ نے گھبرا کر سرگوشی کی تھی۔

"تم اب بھی پوچھ رہی ہو؟ یعنی اتنا زبردست کارنامہ کرنے کے بعد بھی؟" میں تو تپی بیٹھی تھی۔

"تو اب میری کیا غلطی ہے کہ فون کی بیٹری ہی لو تھی۔ خبیث چل کر ہی نہ دیا۔ پھر مجھے جو جو یاد آیا بولتی گئی۔" اس نے معصومیت سے اپنا دفاع کیا۔

"اور میں جو کھانس کھانس کر تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر تم کسی طرف دیکھتیں تو کچھ سمجھتیں نا تم تو اپنی فیورٹ شاعرہ فرحت عباس شاہ کی غزلوں کے ٹائٹلز گنوا رہی تھیں۔ ان میں سے بھی آدھے تو پروین شاکر کی غزلیں تھیں۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا وردہ! مجھ سے نہیں ہو گا یہ ڈراما۔ مگر تم پر تو بھوت سوار تھا۔ مجھے تو تمہارے بھائی ہی کچھ کھسکے ہوئے لگتے ہیں۔ اب آج کل کون پڑھتا ہے ایسی مشکل شاعری اور اگر پڑھتا ہے تو خود سو دفعہ پڑھیں بے چاری منگیتر کا کیا گناہ ہے۔ وہ بھی رٹے لگائے۔ اب ضروری تو نہیں نا ہر کسی میں بڑھی روح سمائی ہو۔" ناجیہ بھی جھنجلا گئی تھی۔ اتنے گھنٹوں کی محنت اور ٹینشن کا یہ نتیجہ اس کے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں عالیان کی موجودگی فراموش کر چکے تھے اور وہ ان باتوں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

"ہیں ہیں ۔۔۔ جھوٹ کی حد ہے۔ میں نے کب فورس کیا تھا تمہیں؟ تم نے خود چیلنج قبول کیا تھا۔ میں نے صرف فوزیہ کا بتایا تھا کہ وہ شعر سنا سنا کر اپنے آپ کو بہت باذوق ظاہر کرتی ہے۔ تم بھی کچھ رٹ لو۔ مستقبل میں کام آئیں گے۔ دھاک بٹھانے کا شوق تمہیں ہوا تھا اور غلطی ساری کی ساری تمہاری ہی ہے۔ موبائل چارج نہیں کر سکتی تھیں؟ کیا فائدہ ہوا اتنی محنت کا جو لکھ لکھ کر میسجز محفوظ کیے تھے۔"

مجھے اب اپنی محنت ضائع ہونے کی فکر ہوئی۔

"بس رہنے دو ۔۔۔ تمہارے میسجز بھی تمہاری ہی طرح بے وفا نکلے۔ عین وقت پر ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اب کیا میں چپ بیٹھی اسے آن کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ بیٹری لو ہو گئی تھی موبائل کی۔"

ناجیہ نے مجھے کو جھاڑتے ہوئے نظریں اٹھائیں تو عالیان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر گڑبڑا گئی۔ پھر دل کڑا کر کے بولنا شروع کیا۔

"دیکھیں، مجھے شاعری کا کوئی شوق نہیں تھا۔ یہ سب وردہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے میرے بارے میں سب جھوٹ کہا تھا آپ سے۔ نہ تو مجھے شاعری سے کوئی لگاؤ ہے، نہ ہی کسی شاعر کو جانتی ہوں۔ آج جو سب میں نے کہا، وہ کل وردہ کی منتیں کرنے پر رٹے مارے تھے۔ آپ کی بھی غلطی نہیں۔ انسان کو ایک دفعہ زندگی ملتی ہے اس میں اپنی مرضی کا ساتھی چننے کی پوری آزادی ہونی چاہیے اس لیے ۔۔۔ اس لیے ۔۔۔" آخر تک آتے آتے ناجیہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"یہ تو کچھ اس قسم کا معاملہ لگتا ہے۔
کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے"

عالیان کے شعر سنانے پر ناجیہ کو شاعری پر مزید غصہ آ گیا کہ یہ ساری رسوائی اس شاعری کی وجہ سے ہی ہوئی تھی۔

"بھئی جب آپ میرے لیے اتنا کچھ کر سکتی ہیں تو میں ایک فضول سی فرمائش نہیں چھوڑ سکتا۔" عالیان نے اسے رونے کی تیاری کرتے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔

"کیا فضول سی فرمائش؟" میں خوشی سے چیخی تھی۔ "آپ کو ناجیہ کے بدذوق ہونے پر کوئی اعتراض نہیں؟"

عالیان نے نفی میں سر ہلایا اور ناجیہ نے اپنے آپ کو بدذوق کہنے پر مجھے گھور کر دیکھا مگر اور پھر ہم تینوں ہی ہنس پڑے تھے۔

☆

دوسری قسط

"سنہ سوٹ کرے، آئی ڈونٹ کیئر۔ مجھے تو یہ کلر پسند ہے۔ میں وہی پہنوں گی۔"

"ہاں تمہیں کون سا عقل شریف ہے۔ تمہیں تو مشورہ دینا بھی فضول ہے۔"

"مشورہ..... یہ تم مجھے مشورہ دے رہی ہو یا طنز کر رہی ہو۔"

"بے وقوف ہو تم، ہر سیدھی بات کا الٹا مطلب لیتی ہو۔ اسٹوپڈ تمہیں تو کچھ کہنا عذاب ہے۔" میرب کی قوت برداشت ختم ہو گئی تھی۔ وہ غصے سے اسے دیکھ کر چیخی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ تم دونوں نے؟" میرب کی چیخ سن کر سارا اعلوی فوراً نکل کر آئی تھیں۔

"یہ چیخ رہی ہے۔ اس سے پوچھیں۔" ماہین نے اسے گھورا۔

"ماما! میں نے اس سے صرف اتنا کہا ہے کہ تم یہ کلر مت پہنا کرو۔ بہت ڈارک ہے لو تم یہ چڑ گئی ہے۔" میرب نے طنز سے اسے دیکھ کر ماں کو بتایا۔

"ماہین! میرب تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ یہ اگر تمہیں کوئی مشورہ دیتی ہے تو سمجھ لیا کرو۔"

"مشورہ..... اس نے مشورہ نہیں دیا تھا۔ طنز کیا تھا۔ مذاق اڑا رہی تھی میرا۔"

"سن لیں ماما! ایک تو اس کی ایگو چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہرٹ ہو جاتی ہے۔ مائی فٹ، میں آئندہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔" میرب نے بڑے نخرے سے کہہ کر کشن کو زور سے صوفے پر پھینک دیا تھا۔

"مت کہنا۔ مجھے تمہارے ان مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم میرا بھلا نہیں چاہتیں، طنز کر کے مذاق اڑاتی ہو، چھوٹی بہن....." ماہین نے دانت پیسے "دشمن ہو تم میری۔"

"سنا آپ نے ماما..... اسنا پاگل ہے یہ سائیکو کیس۔" میرب تو دوبارہ آپے سے نکل گئی تھی۔ وہ چیخی۔

"بکواس بند کرو ماہین! اپنی بہن کے بارے میں یہ کہتے شرم نہیں آتی تمہیں۔" سارا نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"اور اس نے مجھے کیا کہا ہے۔" یکدم اس کے گلے میں گولہ سا اٹکا تھا۔

"اسے تم سے زیادہ عقل ہے۔ فیشن کی سمجھ بوجھ ہے۔ تمہارے فائدے کے لیے اگر کچھ کہتی ہے تو تمہیں مرچیں کیوں لگتی ہیں۔" اور یہ پہلی بار نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ میرب کے ساتھ جھگڑے میں ماہین کے بجائے میرب کا ہی ساتھ دیتی تھیں۔ غلطی نہ ہونے کے باوجود اسے ہی ڈانٹ پڑتی تھی اور وہ روتی دھوتی اپنے کمرے میں بھاگ جاتی تھی۔ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، میرب کی طنزیہ باتیں سن کر وہ نظرانداز کر دیتی تھی مگر آج وہ نہیں سہہ پائی تھی اور سارا اعلوی کا یہ ایک جملہ جل تھل مچا رہا تھا۔

"یہ..... میرا رنگ مجھ پر برا لگتا ہے نا۔ یہ رنگ....." اس نے پرپل کلر کے بے حد قیمتی اور خوب صورت سوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔

"بالکل بینگن لگتی ہو تم اس سوٹ میں۔" طنزیہ ہنسی کمرے میں ابھری تھی۔ اس نے سارے ٹکڑوں کو جمع کر کے شاپر میں ڈالا اور چہرہ صاف کر کے باہر آ گئی۔ لان کی بیرونی دیوار کے ساتھ دائیں جانب خالی پلاٹ تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر بڑے زور سے شاپر باہر کی جانب اچھال دیا۔

"ماہین! کھانا نہیں بنانا۔ دوپہر ہو رہی ہے۔" سارا نے لاؤنج سے اسے دیکھ کر پکارا تھا۔

"میرب کی باری ہے آج۔" اس نے سنجیدگی سے انہیں اطلاع دی۔

"مجھ سے نہیں ہانڈی بنتی..... اتنی گرمی میں کریلے پکاؤں، بابا کو بھی پتا نہیں یہ کڑوے کریلے کھانے کا اتنا شوق کیوں ہے۔ ماما میں نے کل ہی اسکن پالش کروائی ہے۔ میں چولہے کے آگے نہیں جاؤں گی۔" میرب نے نخرے سے صاف جواب دے دیا تھا اور مزے سے صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ ماہی بنا لے گی ہانڈی۔ ویسے بھی نواز کو ماہی کے ہاتھ کے کریلے گوشت پسند ہے۔" سارا اعلوی نے بڑی چالاکی سے اسے گھیرا تھا۔

"ہاں بنا لیتی ہوں، پہلے بھی کئی بار میں نے اس کی باری میں کھانا بنایا ہے۔" اس نے جاتے جاتے سنجیدگی سے جتایا تھا۔ میرب نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"دیکھا ماما دیکھا۔ کیسے طعنہ دے کر گئی ہے۔"

"اوکے۔ خیر ہے تم چپ کرو۔" سارا نے اسے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میرب "ہونہہ" کہہ کر دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی تھی ساتھ ہی ریموٹ اٹھا کر چینلز کی رفتار بھی تیز کر دی تھی وہ کچن میں آئی تو خالد کریلے نکال کر بیٹھا تھا۔

"ہاں بی بی..... کاٹ دیں کریلے تم نے، چلو جلدی سے کاٹ دو میں پیاز کاٹ دوں۔"

"آپ نے کھانا بنانا ہے۔ آج تو میرب باجی کی باری ہے۔"

"جانتی ہوں..... جو تمہیں کہا ہے وہ کرو۔" فریزر کھولتے ہوئے اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ خالد نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی اور جلدی جلدی کریلے چھیلنے لگا۔

"میں آتی ہوں....." اسے کچھ یاد آیا تو وہ خالد کو بتا کر باہر نکلی۔ لاؤنج اب خالی پڑا تھا۔ یقیناً ماما اور میرب اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں۔ اس نے اے سی آف کیا۔

"توبہ ہے۔ یہ لڑکی کبھی بھی اے سی آف نہیں کرتی۔" سارے گھر کی لائٹس، پنکھے اور اے سی اکثر ماہین ہی بند کرتی تھی۔ کیونکہ اسے بابا کی محنت سے کمائی جانے والی رقم کا احساس تھا۔ جو ہزاروں کی تعداد میں بل کی صورت نکل جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو پھپھو!" ثروت کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ ہمیشہ بہت خوشگوار ہو جاتا تھا۔

"ہاں میری جان! کیسی ہو، کیا ہو رہا تھا۔" ثروت بھی اسی گرم جوشی، محبت سے جواب دیتی تھیں کہ اس کی ساری بوریت، اداسی اور محرومی اڑنچھو ہو جاتی تھی۔

"بابا کے لیے کریلے گوشت بنا رہی تھی۔ خالد کریلے کاٹ رہا تھا۔ مجھے ایک دم یاد آیا۔ آپ کو بتا دوں۔ صبح بابا گاڑی بھیج رہے ہیں۔ آپ تیار رہنا۔" اس کی بات سن کر وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گئی تھیں۔

"ماہی بچے! ضد مت کرو۔ میں ابھی نہیں آ سکتی ہوں۔ سمجھا کرو نا۔"

"نو..... میں کچھ نہیں سننا چاہتی ہوں۔ وہی آپ کے گھسے پٹے مصروفیت کے بہانے، صاف صاف کہیں آپ میرے پاس آنا ہی نہیں چاہتی ہیں۔" ماہین کو اس کی ٹال مٹول پر ہمیشہ کی طرح غصہ نہیں آیا تھا۔ رونا آ گیا تھا اور اس کے لہجے میں گھلی نمی سیدھا ثروت کے دل پر اثر کر گئی تھی۔

"ماہی..... رو رہی ہو؟ رونا نہیں جانو دیکھو۔"

"آپ آ رہی ہیں کہ نہیں۔" اس نے ثروت کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی تو ثروت نے بے بسی سے گہرا سانس لیا۔

"یہ ماہین مجھے ہمیشہ مجبور کر دیتی ہے اور ہر بار میرا خود سے کیا وعدہ بھی تڑوا دیتی ہے کہ میں اب دوبارہ کبھی نواز کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

"اوکے....." انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"ہرا..... یہ ہوئی نا بات۔ بس آپ تیار رہنا۔ ڈرائیور دس بجے تک آپ کو لینے آ جائے گا۔ اوکے۔" ماہین کی بے پناہ خوشی اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"اوکے۔" ثروت نے مسکرا کر کہا اور فون نیچے رکھ دیا۔ ماہین دوبارہ کچن میں آئی تو اس کا موڈ اور انداز دونوں بالکل بدلے ہوئے تھے۔

"ہاں بھئی کٹ گئے کریلے؟"

"جی باجی! کاٹ دیے۔ ٹماٹر بھی کاٹ دوں۔"
سبزی کاٹنے میں وہ ماہر تھا۔
"ہاں کاٹ دو اور ہری مرچیں بھی۔" ماہین نے کڑاہی میں تیل ڈال کر چولہے پر رکھا۔ اب اسے گرمی بھی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ مطمئن سی، خوش خوش گرمی میں کھانا بنا رہی تھی۔
خوشی سکھ اور آسودگی دیتی ہے اور آسودگی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ غم، بے چینی، اضطراب اور پھر اذیت میں بدل کر جسم و جاں کو سلگا دیتا ہے۔ ثروت پھپھو سے بات کر کے اس کے اندر کے اضطراب، بے چینی اور جلن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی کہ ثروت نے آنے کی ہامی بھر لی تھی۔ اب کچھ دن ان کے ساتھ بہت اچھے خوشی سے بھرپور گزریں گے۔ یہ تصور ہی بڑا پیارا تھا۔ اسی لیے وہ ماما کی ناراضی، غصہ اور متوقع ردعمل کو بھی نظر انداز کر گئی تھی۔
محبت کے جذبے میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اپنا آپ منوا لیتا ہے اور ماننے والا سراپا بدل جاتا ہے۔ اس کے انداز میں محسوس کی جانی والی خوشی تھی اور اسے نواز اکرم نے خوب محسوس کیا تھا۔
"بابا! پھپھو کے لیے کل گاڑی بھیج دینا، دس بجے صبح۔" اس کی اطلاع پر نواز اکرم بے ساختہ چونکے تھے۔
"ثروت آ رہی ہے۔" ان کے انداز میں ایک عجیب سی بے چینی تھی جسے نہ خوشی کا نام دیا جا سکتا نہ افسوس کا۔ ہاں خوف کی پرچھائیاں ان کی آنکھوں سے بے چینی بن کر ظاہر تھیں۔
"جی بابا!" ماہی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔
"مگر... تم نے اپنی ماما سے بات کی۔"
"کیا...؟" ماہین نے بغور انہیں دیکھا۔
"وہ تم جانتی ہو نا، ثروت کا آنا سارا کو پسند نہیں ہے۔ پھر جھگڑا ہو گا۔"
"ماما کو تو آپ بھی پسند نہیں ہیں۔ میں بھی پسند نہیں ہوں۔ تو کیا ہم بھی گھر میں نہ رہیں۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔ نواز اکرم کچھ لمحوں تک کچھ بول ہی نہیں سکے تھے۔ [illegible] اور اب تک ہی [illegible] کچھ جملوں کی بازگشت میں تھے۔
"ماما کو تو آپ بھی پسند نہیں ہیں۔ میں بھی پسند نہیں ہوں تو کیا ہم بھی گھر میں نہ رہیں۔" آج ماہین کی بات سن کر انہیں شدت سے احساس ہوا تھا کہ سارا کے رویے نے ماہین کو کتنا ہرٹ کیا تھا۔ وہ کتنی غلط سوچ رکھتی تھی۔ ماں کے متعلق۔
"سارا کا سارا پیار، محبت اور نرمی میرب کے لیے ہے۔ میں تو شاید ان کی سوتیلی بیٹی ہوں۔" ماہی اکثر بابا سے یہ شکایت ضرور کرتی تھی۔ اور نواز اکرم اسے اس کا احساس کمتری سمجھ کر کبھی تو نظر انداز کر دیتے تھے اور کبھی اسے سمجھانے بیٹھ جاتے تھے۔ مگر آج اس نے ایسی بات کی تھی کہ نواز اکرم کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ [illegible] سارا کی آمد کو بھی محسوس نہیں کر سکے تھے۔
"نواز! کیا بات ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟" وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ نواز نے چونک کر اپنے سامنے دھری پلیٹ کو دیکھا۔ ان کی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن اور روٹی پڑی ہوئی تھی۔
"کچھ نہیں۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔
"شہناز بھابھی کا فون آیا تھا۔ وہ سمیر کی خوشی میں کوئی پارٹی کر رہے ہیں۔ سب ہی کو بلایا ہے۔"
"ہاں... مجھے بھی آفس فون کیا تھا انہوں نے۔"
"اس عورت کے گھر جانے کو میرا تو بالکل دل نہیں کرتا۔ بڑا اکڑتی ہے کہ وہ بیٹوں کی ماں ہے اور مجھے یوں ترس بھری نظروں سے دیکھے گی جیسے میں اس سے مانگ کر کھاتی ہوں۔ مجھے ایسی مغرور عورتیں بالکل پسند نہیں ہیں اور اب تو اس کے تو دونوں بیٹے لائق فائق ہیں۔ اچھی جابز پر ہیں۔ بالکل ہی آؤٹ ہو جائے گی۔" سارا ناپسندیدگی سے منہ بنائے کہہ رہی تھیں، نواز کو بھی اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ شہناز اور سارا میں کبھی بھی نہیں بنی تھی۔ حالانکہ رضا ان کا

[illegible] دوست تھا۔ بہت گہرا مگر ان کی دوستی کے [illegible] ان کی بیویاں ایک دوسرے کے خلاف اپنے [illegible] میل اور حسد رکھتی تھیں۔
"[illegible] کی بات نہیں ہے سارا! شہناز بھابھی بہت [illegible] خاتون ہیں۔ ہمارے بچوں سے بہت محبت کرتی [illegible]۔"
"میں کون سا کہہ رہی ہوں بری ہے اور مائنڈ اٹس [illegible] ہمارے بچوں سے نہیں۔ صرف میرب سے اور میرب سے اس کی محبت کی وجہ بھی میں جانتی ہوں۔ اتنی محبت کرنے والی ہیں تو ماہی کا رشتہ کیوں نہیں مانگا اس نے اپنے بیٹے کے لیے۔" جو بات نواز نے صرف سوچی تھی۔ سارا نے لگی لپٹی رکھے بغیر ٹھک سے کہہ دی تھی۔ نواز نے بے اختیار انہیں دیکھا۔
"اور میرب کے لیے سمیر کا..."
"میرب نہیں مانتی۔" سارا نے ان کا جملہ مکمل [illegible] ایک دیا تھا۔
"کیوں... کیا کمی ہے اس میں۔ سمیر تو بہت اچھا لڑکا ہے۔" نواز کو اس انکار سے حیرانی کے ساتھ ساتھ [illegible] ہوا تھا۔
"اس کے لیے میرے پاس زیادہ اچھے لڑکے مل جائیں گے مل رہے ہیں۔ اگر تم دونوں نے دوستی نبھانی ہے تو ماہین کے لیے کہہ دیں۔"
"سعد کے لیے شہناز بھابھی اپنی بھانجی لانا چاہتی ہیں۔"
"جھوٹ، کل بھی لڑکی دیکھنے گئی تھی مسز کمال کے ساتھ۔" سارا کے طنز پر نواز نے سر جھکا لیا تھا۔ اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ رضا نے انہیں ٹالا ہے۔ مگر انہیں [illegible] نہیں سکے تھے۔ وہ بہت لحاظ والے تھے۔ بہت سے لوگوں کی بہت سی زیادتیاں وہ لحاظ داری میں بھلا دیتے تھے۔
"تمہارا اتنا بڑا سوشل سرکل ہے۔ تم اس کے لیے کوشش کرو نا!"
"اسے ایک بار دیکھ کر جو جاتا ہے وہ واپس پلٹ کر نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔" طنز، حقارت اور بے زاری سے پر لہجہ۔ دروازے میں کھڑی ماہین [illegible] میں جا [illegible] کھڑا تھا۔
"مجھے اس کی بہت فکر ہے سارا!" نواز کا لہجہ کیسا بجھا بجھا سا تھا، ملتجی بے بس اور منت بھرا۔ ماہین نے [illegible] سکی [illegible] بھی
"تو کیا مجھے فکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے میرب کی عمر بھی بڑھ رہی ہے۔ میں میرب کی شادی پہلے نہیں کرنا چاہتی، لوگ بڑی باتیں بناتے ہیں کہ چھوٹی کی شادی پہلے کیسے ہو گئی، بڑی کی اب تک کیوں نہیں ہوئی اور بڑی بھی ماہین جیسی ہو تو..." سارا کا لہجہ ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔ نواز اکرم کے چہرے پر تاریک سایہ لہرایا تھا۔
"کیا کمی ہے میری بیٹی میں؟ سگھڑ، تعلیم یافتہ، سلجھی ہوئی، سمجھ دار جو کسی کے بھی مکان کو گھر بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا لوگ ظاہری خوب صورتی کو اتنا اہم کیوں سمجھتے ہیں۔" نواز بڑے افسردہ اور تاسف بھرے انداز میں بات کر رہے تھے، یکدم سارا علوی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔
"ہاں واقعی، پتا نہیں کیوں لوگ ظاہری خوب صورتی پر مرتے ہیں اور کچھ تو اپنی شکل بھی نہیں دیکھتے۔" سارا علوی نے بڑے ہلکے پھلکے سرسری لہجے میں نواز اکرم پر چوٹ کی تھی۔ نواز بے اختیار چونکے تھے۔ مگر بولے کچھ نہیں، یہ ان کا وہ ویک پوائنٹ تھا، جس پر وہ کبھی بھی کچھ نہیں بولتے تھے۔ کیونکہ سارا علوی کی خوب صورتی اور ان کی بدصورتی دونوں ہی کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ مگر پھر بھی قدرت نے ان کی جوڑی بنا دی تھی۔ یہ تقدیر اور قسمت کی بات تھی۔ مگر سارا، نواز اکرم کی ماں کے اصرار، بہن کے اشتیاق اور خود نواز اکرم کے اصرار کو طعنہ بنا کر پیش کرتی تھیں اور رعب حسن سے متاثر بے چارے نواز اکرم ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ اگر ہم چاہتے تھے تو پھر تمہاری بھی تو مرضی تھی ورنہ یہ رشتہ کیوں کر ہو سکتا تھا۔ مگر آج تک انہوں نے یہ بات سارا کو نہیں کہی تھی۔
"اِٹس او۔ رضا بھائی کو صاف بتا دینا کہ وہ کسی آس میں نہ رہیں۔" سارا نے حسب عادت ہاتھ اٹھا کر

فیصلہ کن انداز میں کہا اور کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ان کا خوب صورت سانچے میں ڈھلا بدن اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ سفید رنگت سے جیسے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر جا رہی تھیں۔ ایک شاندار تمکنت آمیز چال اور غرور سے اٹھی گردن لیے۔ نواز اکرم مبہوت سے انہیں دیکھ رہے تھے وہ آج بھی اتنی ہی حسین تھیں وہ آج بھی اتنی ہی پُرکشش اور ہوشربا حسن کی مالک تھیں۔ ایک بار ان پر ”اتفاقاً“ نظر پڑتی تھی تو دوسری بار ارادتاً۔“

شادی کے اولین دنوں میں نواز اکرم نے انہیں کسی قیمتی موتی کی طرح چھپانا چاہا تھا۔ مگر وہ چھپنے والی چیز نہیں تھیں اور نہ ہی چھپنا چاہتی تھیں۔ انہیں اپنی بے پناہ خوب صورتی کا بے حد احساس تھا اور وہ سراہے جانا پسند بھی کرتی تھیں مگر نواز اکرم کو ساری عمر سراہنا نہیں آیا تھا اور نہ ہی ان کی زندگی یا فیملی میں کوئی ایسا موجود تھا۔ انہیں تو تعریفی لفظ بھی نہیں ملتے۔ بس ہکلا کر خاموش ہو جاتے تھے اور ان کے اس خوف کا فائدہ اٹھا کر سارا نے انہیں خوب رعب کے نیچے دبا رکھا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں فیشن ملبوسات، میک اپ کا طریقہ بھی آ گیا تھا۔ دولت اور حسن یکجا ہو جائیں تو سلطنتیں لٹ جایا کرتی ہیں۔ نواز اکرم کی سلطنت بھی پوری طرح سارا علوی کے قبضے میں تھی۔ ماہین نے ایک نظر جاتی ہوئی ماں کو دیکھا اور دوسری نظر باپ پر ڈالی۔ جو نادیدہ وجود پر نظریں جمائے مدہوش بیٹھا تھا۔ سارا علوی تو اس راستے سے کب کی گزر چکی تھی۔ مگر وہ ابھی تک مسحور تھے۔

سارا لاج کا سیاہ اور سنہری گیٹ ٹھیک پونے بارہ بجے چوکیدار نے کھولا تھا۔ گاڑی اندر آ کر روش پر رکی۔ ڈرائیور نے پھرتی سے اتر کر دروازہ کھولا۔ بیرونی برآمدے سے ماہین بھاگ کر آئی تھی۔

”السلام علیکم ..... ویل کم ویل کم۔“ وہ خوشی سے چہکتی ہوئی ثروت کے گلے لگ گئی تھی۔

”ڈرائیور ٹائم سے پہنچ گیا تھا نا!“

”ہاں.....“ ثروت نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ڈرائیور اس کا بیگ ڈگی سے نکال رہا تھا اور اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی سارا علوی نے یہ منظر بہت حیرت سے دیکھا تھا اور پل کے پل میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہ دونوں اب اندر آ رہی تھیں، سارا تیزی سے کھڑکی سے ہٹیں اور لاؤنج میں آ گئیں۔

”آپ کا مٹھو..... ضیا اور.....“ وہ اپنی دھن میں بولتی ہوئی ثروت کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ مگر سامنے ماں کو خطرناک تیوروں کے ساتھ کھڑے دیکھ کر یکدم خاموش ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم بھابھی! کیسی ہیں؟“ ثروت نے اخلاق نبھایا۔

”ٹھیک ہوں۔“ سارا نے پھر لڑھکائے پھر کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ماہی! تم میرے کمرے میں آؤ۔“ حکم دے کر ٹھک ٹھک کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اس نے مڑ کر ثروت کو دیکھا جو سنجیدہ اور پریشان سی لگ رہی تھی۔

”آئیں .....“ اس کے انداز میں لاپروائی نمایاں تھی۔ اس نے مسکرا کر ثروت کا بازو تھاما اور کمرے میں آ گئی۔

”آپ ریسٹ کریں۔ میں ماما کی بات سن کر آتی ہوں اور ساتھ کھانا بھی لگواتی ہوں۔“

”میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ.....“

”کم آن ... چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں پر پریشان مت ہوا کریں۔ آپ ریلیکس ہو جائیں۔ میں یوں گئی، یوں آئی۔“ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ ثروت نے وسط کمرے میں کھڑے ہو کر چند پل سوچا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی بیڈ کے قریب دھری کرسی پر آ بیٹھی۔

”کچھ محبتیں انسان کو اس قدر مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ اپنی انا اور خودداری کو بھی پس پشت ڈال دیتا ہے۔“ اس نے تھک کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ یہ دو دن

اب اسے سارا علوی کی بھرپور ناپسندیدگی اور نفرت کے تیر سہارنے تھے۔

”تم مجھے کبھی کبھی بہت آزمائش میں ڈال دیتی ہو ماہی!“ وہ دھیمے سے اس سے گلہ کر رہی۔

”محبت کرنے والوں کے لیے یہ بہت معمولی آزمائشیں ہیں جناب! ہمارے لیے تو آپ کو ایسی آزمائشیں سہنا پڑیں گی۔“ ماہین جواباً بڑے رومینٹک انداز میں کہتی تھی تو وہ ہنس پڑتی تھی۔

”اور اب سارا اسے نہ جانے کتنا برا بھلا کہے گی۔ ڈانٹ ڈپٹ کرے گی۔“ حالات کی سنگینی کا اندازہ اسے سارا کا چہرہ دیکھتے ہی ہو گیا تھا اور بالکل درست ہوا تھا۔ کیونکہ سارا علوی کے کمرے سے باہر آتی ان کی غصیلی دھاڑ سے ان کے موڈ کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

”میری اجازت کے بغیر تمہاری جرأت کیسے ہوئی اسے بلانے کی۔“

”وہ غیر نہیں ہیں ماما۔ بابا کی بہن ہیں اور اپنے بھائی کے گھر آئی ہیں۔“

”مائی فٹ ’بھائی کا گھر‘..... یہ اس کے بھائی کا نہیں، میرا گھر ہے سنا تم نے ’میرا گھر ہے‘۔“ سارا نے سینے پر ہاتھ مار کر حق جتایا تھا۔ ماہین کو بابا پر غصہ آ گیا۔ پتا نہیں کیوں یہ گھر، بابا نے ماما کے نام کیا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا، علیحدہ ایک تاج محل بنوا دیتے تاکہ یہاں تو بار بار میرے گھر کا طعنہ نہ سننا پڑتا۔ بابا اپنے ہی گھر میں ماما کے احسان مند ہو گئے تھے۔ جو دن میں ایک دو بار یہ حق ضرور جتاتی تھیں۔

”ماما! وہ آپ کا کیا بگاڑتی ہیں؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔

”نفرت ہے مجھے اس عورت سے۔ اس عورت نے میرا گھر اجاڑنے اور نواز کو ورغلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس گھر میں رہوں تو پھر اب میں..... میں کیسے اسے رہنے دوں یہاں..... ویسے بڑی ڈھیٹ عورت ہے۔ پچھلی بار میں نے اس کے ساتھ جو کیا تھا نا! اس کے بعد تو اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر ہے ہی ڈھیٹ اور.....

”میں نے بلایا ہے نہیں ماما اور جب تک میں اس گھر میں ہوں وہ آئیں گی۔“ ”اور آپ برائے مہربانی ان کے ساتھ جنگ چھیڑنے کا مت سوچنا ورنہ ..... ورنہ اس بار آپ مجھے ان کے ساتھ کھڑا دیکھیں گی۔“ ماہین نے یکدم ماں کی بات کاٹ کر حتمی اور دو ٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ اسے سنایا اور باہر نکل آئی۔

”دیکھ لوں گی میں تمہیں بھی اور تمہاری پھپھو کو بھی۔“

سارا کا مارے غصے اور طیش کے سرخ چہرہ ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیسے انہوں نے خود پر کنٹرول کیا تھا ورنہ دل تو چاہا تھا۔ ابھی جا کر ماہین کا دماغ درست کر دیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے سے قبل ماہین نے دوپٹے سے آنکھوں کے کنارے صاف کیے۔ ورنہ اسے روتا دیکھ کر ”فوراً“ ہی ثروت واپسی کی رٹ لگا دیتی اور یہ صورت حال ماہین کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوتا تھی۔

”ارے ..... آپ ابھی تک..... ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہیں۔ اٹھیں مجھے بتائیں، کھانا کہاں لگواؤں؟“

”جہاں مرضی لگوا لو..... یہاں بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تو ”فوراً“ سمجھ گئی۔

”آپ فریش ہو جائیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔ مل کر کھاتے ہیں اور..... کھانا میں نے خود اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ آپ کا فیورٹ۔“

”اوہ رئیلی پھر تو تم جلدی کرو۔ میں ایک مزے دار لنچ کے لیے بالکل تیار ہوں۔“

ثروت نے ہنس کر پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ وہ ”فوراً“ کچن میں آ گئی۔ خالد کو ساتھ لگا کر کھانا لگایا اور دونوں نے مل کر بڑے مزے، شوق اور لطف سے کھایا بھی، باتیں بھی کرتی رہیں۔

”آپ میرے لیے دعا کرتی ہیں نا!“

”میری جان! میری دعاؤں میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ ہر وقت ایک ہی دعا لبوں پر رہتی ہے، اللہ جلد از جلد میری ماہین کو اپنے گھر کا کر دو۔“

اس نے خفگی سے آنکھیں نکالیں۔

"میری ماہین دلہن بن کر بہت پیاری لگے گی۔" اس نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھام کر پیار سے کہا تو وہ شرما گئی۔

"خوش رہو۔ آباد رہو۔"

"آپ سے ..... ایک بات پوچھوں۔"

"ہوں ضرور۔"

"آپ اور بابا بالکل ایک جیسے ہیں۔ پھر آپ کی شادی نہیں ہوئی۔ بابا کی شادی ہوگئی۔ آئی مین ..."

"میں تمہارا سوال سمجھ گئی ہوں۔ ہمارے معاشرے میں مرد کی جیب اس کے سارے عیب چھپا لیتی ہے۔ جبکہ عورت کی تعلیم، ہنر سلیقہ شعاری۔ سب مل کر بھی اس کی بدصورتی چھپا نہیں سکتے۔ سارا کے گھر والوں کے لیے ہماری دولت ہی بہت تھی، باقی انہوں نے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہا۔"

"تو کیا میں بھی آپ کی طرح ....." ثروت نے یکدم اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"نہیں، نہیں ماہی نہیں ..... آئندہ کبھی ایسی بات مت کہنا۔ مجھے یقین ہے، میری دعاؤں کو ایک دن ضرور قبولیت حاصل ہوگی۔ تم دلہن بنو گی اور بہت پیاری لگو گی۔"

ثروت نے جھلمل جھلمل آنکھوں کے ساتھ کہتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ اس مہربان، نرم آغوش کی محبت بھری گرمی کو پاکر سرشار ہوگئی تھی۔ ہلکی پھلکی۔ پرسکون ہو کر اس نے آنکھیں بند کیں اور ثروت کے سینے پر سر رکھے ہی لیٹ گئی تھی۔

"ماہین! تمہیں پڑھائی نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ تعلیم ادھوری چھوڑ کر تم نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔ آج کوئی ڈگری تمہارے ہاتھ میں ہوتی تو تم یوں گھر بیٹھ کر بور ہونے کے بجائے خود کو کسی اچھے کام اپنے دماغ کو کسی مفید کام میں لگا کر زیادہ خوش رہ سکتی تھیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں .... کبھی کبھی تو مجھے بھی شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ مجھے تعلیم ادھوری نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ مگر میں کیا کرتی ..... میں کمزور تھی نا۔ لڑکیوں کے مذاق اور طعنوں کو سہہ نہیں سکی۔ جب سب لڑکیاں میرب اور میرا موازنہ کرتے ہوئے بڑی عجیب عجیب باتیں کرتی تھیں تو میں ان کے سوالوں اور مذاق سے بچنے کو چھپ جایا کرتی تھی۔ میرب بھی ان لڑکیوں کے ساتھ مل کر میرا مذاق اڑاتی تھی۔ کبھی کہتی تھی کہ میں اس کی سوتیلی بہن ہوں۔ کبھی کہتی تھی۔ ماما نے مجھے ترس کھا کر پالا ہے۔ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ ایسے ایسے مذاق اور طنز۔ میں نے کالج جانا ہی چھوڑ دیا۔"

"اور گھر میں قید ہو کر تم نے یہ سمجھا کہ اب محفوظ ہو۔ یہ دنیا ہے ماہی! دنیا سے تم جتنا ڈرو گی یہ تمہیں ڈرائے گی اور جتنا تم اسے ڈراؤ گی، تم بہادر ہوتی جاؤ گی۔ تعلیم انسان کو بہادری، خودداری کا ہتھیار دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ شخص محض اپنی تعلیم کے بل پر اپنے سارے معذوریت چھپا لیتا ہے۔ کوئی اندھا، لنگڑا، معذور کچھ بھی ہو، تعلیم یافتہ ہے تو عزت دار ہے۔ مجھے دیکھو ماں! میں تم سے بھی زیادہ بدصورت [illegible] رہتی ہوں۔ مگر میری تعلیم میرا اسرار ہے۔ سب میری عزت کرتے ہیں۔ میں بڑے اعتماد سے جس سے بھی چاہوں بات کرتی ہوں۔ کوئی میری شکل پر اعتراض کرتا ہے تو کرے۔ مگر میری قابلیت اور میری ذہانت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔"

"سوری ..... کئی بار سوچا مگر ہر بار پیچھے ہٹ گئی۔ کیونکہ کوئی بھی میری حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ ماما کہتی ہیں۔ اس بڑھاپے میں پڑھو گی تو مزید مذاق بنواؤ گی۔"

"غلط کہتی ہیں وہ۔ تم پر بڑھاپا آنے میں ابھی بہت وقت ہے۔ اگر تم یہ وقت بھی گنوا دو گی تو پھر واقعی مذاق بن جاؤ گی۔ پرائیویٹ بی اے کی تیاری کرو۔ ایگزام، تم ذہین ہو۔ شوق سے پڑھو گی تو ان شاء اللہ نکل جاؤ گی۔ اس کے بعد ماسٹرز۔ شادی زندگی کا آخری مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی شادی کے بغیر کسی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ٹھیک ہے یہ ایک اہم فرض ہے۔ مگر اسی کو جواز بنا کر زندگی کو جہنم بنانا تو بالکل جائز نہیں ہے۔ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب تمہاری شادی کا وقت ہوگا تو تمہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔ مگر ابھی تم اپنی اسٹڈی دوبارہ شروع کر دو۔"

وہ بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

"او کے باس، کل سے ہی پڑھائی شروع۔ ان شاء اللہ۔"

"گڈ....." ثروت نے اسے سینے سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

"ماما! میں کیسی لگ رہی ہوں۔" وہ تیار ہو کر ماما کے کمرے میں آئی تھی اور اب بڑے اسٹائل سے ماڈلز کے انداز میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔ سارا علوی نے بے اختیار اسے دیکھا تھا۔

"تم جانتی ہو تم کیسی لگ رہی ہو۔ مائی ڈیر!" انہوں نے معنی خیزی سے مسکرا کر اسے جتایا تھا۔

"ماما! میرب جھنجلائی۔ "کتنی کنجوس ہیں آپ بھی تو کھل کر تعریف کر دیا کریں میری۔" سارا علوی نے آئینے میں منہ بسورتے اپنی بیٹی کے عکس کو دیکھا تھا۔

"تم بالکل مجھ جیسی ہو میرب! سارا علوی بھی اپنی [illegible] بننے کی شوقین، سراہے جانے کی چاہ رکھنے والی اور ممتاز نظر آنے کی خواہش مند اور مرکز نگاہ بننا [illegible]" سارا علوی نے کھوئے کھوئے انداز میں [illegible] دیکھ کر کہا تھا۔

"[illegible] اور یہ صرف میری میرب نواز اور سارا علوی [illegible] خواہش نہیں ہے ماما! یہ تو ہر خوب صورت اور [illegible] لڑکی کی خواہش ہوتی ہے۔"

"ہوں ..... خوب صورتی اپنا حق مانگتی ہے نا۔"

"ویسے ماما ..... آج تو آپ بھی بہت غضب کی لگ رہی ہیں۔ گارجیئس۔" میرب نے ماں کے بے تحاشا [illegible] سراپے کو دیکھ کر بے ساختہ تعریف کی تھی۔

"شکریہ لو ....." سارا علوی نے کاجل کی سلائی [illegible] کے پیچھے بھی لگائی اور پھر میرب کو بھی لگا دی۔

"دو حسین ترین خواتین ایک ساتھ جا رہی ہیں۔ خدا خیر کرے۔ نظر سے بچنے کو ٹیکا لگایا ہے۔" سارا علوی نے پیار سے میرب کے کان کو سہلایا تھا اس کے لہجے اور انداز میں بہت زعم اور فخر تھا۔

"بابا آئیں گے۔" دونوں باتیں کرتے ہوئے لاؤنج میں آگئی تھیں۔

"ہاں۔ وہ مرزا صاحب کے ساتھ ہی آجائیں گے ادھر۔" ماہین نے اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر دونوں کو جاتے دیکھا تھا اور یکدم گہری سانس لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سارا علوی آج بھی اسے اپنے ساتھ لے جانے سے کتراتی تھیں۔

"کیا کرو گی تم جا کر۔ جانتی ہوں، کسی کونے کھدرے میں منہ چھپا کر بیٹھ جاؤ گی اور جو کسی نے مجھ سے پوچھ لیا تو مجھے منہ چھپانا پڑ جائے گا۔"

سارا علوی کی طنزیہ آواز لاؤنج میں گونجی تھی۔ یکدم اس کے اندر ایک آگ سی بھڑکی تھی۔ اس نے بہت زوردار ٹھوکر سامنے دھرے گلدان کو رسید کی تھی۔ شیشے کا نازک گلدان جس میں گلاب کے [illegible] بے حد خوب صورت چائنیز پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ زمین بوس اپنی موت پر ساکت تھا۔ اسے بری طرح رونا آ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صوفے پر بیٹھی کتنی ہی دیر روتی رہی تھی اور وہ آج پہلی بار ایسے نہیں رو رہی تھی۔ جب بھی سارا علوی اسے اپنے ساتھ لے جانے کے بجائے میرب کو لے کر جاتی تھیں۔ وہ روتی تھی۔ جب بھی سارا علوی نے اسے اس کی شکل کی وجہ سے نفرت اور حقارت کا اظہار کیا تھا۔ وہ روئی تھی۔

"باجی! رفعت باجی کا فون ہے۔" خالد نے آکر اطلاع دی تو وہ بے ساختہ چونکی۔ اپنے آنسو صاف کیے پانی پیا اور صوفے پر آبیٹھی۔

"ہیلو ہاں رفعت!"

"ہائے ماہی! کیسی ہو۔"

"ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک۔ لگ تو نہیں رہی تھیں۔" وہ اس کی آواز کو پہچانتی تھی۔

"کچھ نہیں میری ماں ـــ تم بتاؤ کیسے فون کیا ہے۔"

"مجھے تمہارا پرپل سوٹ چاہیے۔ کل میری کزن کی منگنی ہے اور میرے پاس کوئی نیا سوٹ بھی نہیں ہے۔"

"وہ تمہیں نہیں مل سکتا۔" ماہین کے دل میں اداسی اتر آئی تھی۔ وہ سوٹ اسے اور رفعت دونوں کو ہی بہت پسند تھا۔

"کیوں ـــ مانا وہ اچھا سوٹ ہے۔ مگر ـــ" رفعت کو اس کے انکار پر دکھ ہوا تھا۔

"مگر وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔"

"واٹ ـــ کیا مطلب؟" رفعت بے ساختہ چیخی تو ماہین نے اسے سوٹ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، بتا دیا۔

"او ظالم لڑکی! مجھے دے دیتیں۔" رفعت بے حد حسرت سے بولی۔

"غصے میں خیال ہی نہیں آیا۔"

"پاگل ہو تم، میرب کی باتوں پر چڑ کر تم اپنا ہی نقصان کرتی ہو۔ اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ بے وقوف وہ جب تمہیں تنگ کرتی ہے یا چڑاتی ہے تو تم بھی اسی طرح اس کو سبق سکھایا کرو۔ تب وہ سمجھے گی۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" وہ اس کی بات سے متفق تھی۔ مگر اتنی بہادر نہ تھی کہ میرب کو تنگ کر سکے۔

"مگر تم میں ہمت نہیں ہے۔ ہے نا!" رفعت نے طنز کیا۔ وہ ماہین کو بڑی اچھی طرح سمجھتی تھی۔

"تم کوئی دوسرا سوٹ لے لو۔ وہ پنک والا، جو میں نے پچھلے مہینے سلوایا تھا۔ تمہیں وہ بھی تو پسند ہے نا!" وہ بات پلٹ گئی تھی، بار بار اپنی انسلٹ دوسروں کے منہ سے سننا اور سہنا آسان تو نہیں ہوتا۔

"ہاں چلو وہ ہی بھیج دینا اور آئندہ احتیاط کرنا۔ کوئی سوٹ پسند نہ ہو تو اسے اللہ کے پاس بھیجنے کے بجائے میرے پاس بھیج دیا کرو۔" وہ زیادہ تر اپنے فنکشنز پر پہننے کے لیے ماہین کے سوٹ لے لیتی تھی۔ جو اکثر واپس کرنا بھول جاتی تھی اور جو سوٹ اسے زیادہ پسند آتا تھا۔ وہ حق دوستی جتاتے ہوئے ہتھیا بھی لیتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے فرماں برداری سے جواب دیا۔

"صبح جلدی ڈرائیور کے ہاتھ بھیج دینا اور ہاں تمہارے لیے کچھ بڑے شان دار دیسی نسخے لکھ کر رکھے ہیں میں نے، وہ بھی دے دوں گی۔ استعمال کرو گی تو پھر دیکھنا کیسا اثر ہو گا۔" رفعت ہمیشہ اپنا مطلب نکالنے کے بعد اسے خوش کرنے کو ایسی ہی باتیں کہہ کر خوش کرتی تھی۔

"بس بس رہنے دو۔ اپنے نسخے اور اپنے ٹوٹکے فضول میں وقت کا زیاں کوئی فرق نہیں پڑتا ان سے۔"

"تمہارا موڈ اچھا نہیں ہے اس وقت، اپنی باڈی استعمال کے بعد مجھے بتانا۔ اوکے۔" اس نے بند کی سے فون بند کر دیا تھا ماہین نے بھی سر جھٹک کے ریسیور کو گھورا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں ـــ مگر پھر بھی اس دوستی کو نبھا رہی ہوں۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہو، تم میری بچپن کی دوست ہو اور مجھے بچپن سے سمجھتی اور جانتی ہو اور میں اس اکلوتی دوستی کے بدلے تمہاری یہ چھوٹی موٹی بددیانتیاں بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

اس نے ٹی وی آن کیا۔ اس کا فیورٹ پروگرام آ رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں ایسی مگن ہوئی کہ باقی ساری باتیں ہی بھول گئی تھی۔

"ماہین بیٹا تم یہاں ـــ" یکدم اسے بابا کی آواز آئی تو وہ اچھل پڑی۔

"ہائے بابا! آپ نے تو ڈرا ہی دیا۔" اس نے دھڑ دھڑ کرتے دل پر ہاتھ رکھا اور گہرے گہرے سانس لیے۔

"تم رضا انکل کی طرف کیوں نہیں گئیں؟ میں نے سارا سے کہا تھا کہ تمہیں بھی وہ ساتھ لے کر جائے گی۔" نواز حیرت زدہ سا اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔ اس نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔

"یہ اچھا ہے بابا کو، ماما کی شکایت کی تو نہیں کرے گی نہیں، لیکن وہ ہی سمجھانے بیٹھ جائیں گے تو پھر ـــ" اس نے ایک ہزار وہیں جیسے میں سوچ۔

"بس بابا! دل نہیں چاہ رہا تھا۔" اس نے بہانہ بنایا۔ "شور شرابا ہنگامہ مجھے اب اچھا نہیں لگتا۔"

"تمہاری ماما ٹھیک کہتی ہیں، تم بہت آدم بے زار ہوتی جا رہی ہو۔ اس عمر میں تمہیں شور شرابا برا لگتا ہے۔ یہ عمر تو انجوائے کرنے اور ہلا گلا کرنے کی ہوتی ہے۔" اس نے تڑپ کے بابا کو دیکھا۔

"اور کیا کیا کہتی ہیں۔ ماما میرے بارے میں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ نواز چونکے۔

"ماہی! تم اتنی تلخ کیوں ہو جاتی ہو۔ ماما کو بھی غلط سمجھتی ہو، چھوٹی بہن سے بھی تمہارا جھگڑا رہتا ہے۔ بیٹا! خود کو اتنا تنہا کیوں کر لیا ہے تم نے۔"

نواز اکرم افسوس بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ماہین کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

"آپ نہیں گئے بابا ـــ؟" اس کے اندر رونے کا شور تھا۔ مگر آواز و لہجہ بے حد ہموار تھا۔

"میں ابھی جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کاغذات گھر رکھنے آیا تھا۔ تم میری سفید شلوار قمیص نکال دو، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" وہ اس کے سر پر چپت لگا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ماہین نے شاکی نظروں سے باپ کو دیکھا۔

"کوئی مجھے نہیں سمجھتا، آپ بھی نہیں بابا! آپ بھی نہیں۔" آنسو بڑی تیزی سے اس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے، جنہیں جلدی سے صاف کر کے وہ اٹھی اور نواز کے کمرے کی طرف چل دی۔

☆ ☆ ☆

"تم نے بہت اچھا کیا میرب! مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔ میری پارٹی کی رونق دوگنا ہو گئی ہے۔" سمیر کا بس نہیں چل رہا تھا وہ مارے خوشی کے بار بار میرب کا شکریہ ادا کرتا اس قدر احسان مند ہو رہا تھا کہ میرب کو بھی ہنسی آنے لگی تھی۔ مگر خود پر کنٹرول کیے وہ ایک شان بے نیازی سے سر اٹھائے اسے زیر احسان کرنے کا مزہ لے رہی تھی۔

پارٹی میں بہت زیادہ لوگ مدعو نہیں تھے، رضا انکل کے بہت ہی قریبی چند دوست اور ان کی فیملیز جو رضا اور نواز اکرم کے مشترکہ دوست بھی تھے اور اسی لیے یہاں کی تمام خواتین سارا علوی کو جانتی تھیں اور باری باری ان کے ساتھ بیٹھنے اور گپ لگانے کی کوشش میں تھیں۔ وہ مرکز نگاہ بنی ہوئی دو تین عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھیں۔ شہناز کے اندر حسد جاگ اٹھا تھا۔ وہ بھلا سارا علوی کی مقبولیت کو کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ ان کے گروپ کے پاس آ گئی تھیں۔

"اور سارا! ماہین کیوں نہیں آئی ـــ میں نے خاص طور سے تم سے کہا تھا کہ اسے لے کر آنا۔ بے چاری کہیں آتی جاتی نہیں ہے۔" شہناز نے بے حد ترس بھرے انداز اور لہجے میں سارا سمیت وہاں بیٹھی دیگر خواتین کو باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ماہین کیوں نہیں آئی یا پھر سارا اسے لے کر کیوں نہیں آئیں۔ سارا کا چہرہ پل بھر کو اترا تھا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ بڑی سرد مہری سے جواب دے کر دوبارہ اپنے ساتھ بیٹھی مسز شکیل کی طرف رخ کیا تھا۔ مگر شہناز انہیں اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھیں۔

"اس کی طبیعت تو اکثر ہی خراب رہتی ہے۔ کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھاتا تھا سارا! بیٹیوں کے معاملے میں لاپروائی نہیں برتتے، دو ہی تو بیٹیاں ہیں تمہاری۔" انہوں نے دو ہی پر خاصا زور دیا تھا۔

"ارے ہاں سارا! تم ماہین کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ نا بلکہ یہ اپنا سمیر بیٹا بھی تو ڈاکٹر بن گیا ہے۔ اس سے کنسلٹ کرنا تھا۔"

مسز شکیل کے مشورے پر سارا کا دل چاہا، مسکراتی ہوئی شہناز کا منہ نوچ لیں۔ کم بخت ہیر پھیر کر اپنے

بیٹوں کی طرف ہی آجاتی تھی۔

"ماشاءاللہ شہناز! تم بہت لکی ہو۔ دو بیٹے اور دونوں ہی لائق فائق۔"

مسز راشد نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ شہناز نے بڑے غرور سے سارا کو دیکھا تھا۔ ایک اسی پوائنٹ پر وہ اسے مات دے سکتی تھیں اور دیتی تھیں۔

"ایکسکیوزمی۔ میں ابھی آئی۔" سارا کے لیے اب ان خواتین کے ساتھ بیٹھنا قطعاً" دلچسپ نہیں رہا تھا۔ سب ہی ایک کے بعد ایک شہناز کے بیٹوں کی قابلیت اور ذہانت کی تعریفیں شروع کرنے والی تھیں۔ جو سارا کے لیے بالکل فضول تھیں۔ وہ ان ماؤں میں سے نہیں تھیں جو بیٹیوں کی ماں ہو کر بیٹوں کی ماں کے آگے پیچھے پھرتیں یا اس کی خوشامد چاپلوسی کرتیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ شہناز کی طلب کیا تھی اور ان کی طلب کے لیے سارا کو پریشان ہونے کی قطعاً" فکر نہیں تھی اور جس کے لیے وہ پریشان ہو سکتی تھیں۔ وہ شہناز کی لسٹ میں نہیں تھی تو پھر اس ناپسندیدہ عورت کے ساتھ بیٹھ کر اس کی باتیں سننے کا فائدہ؟

وہ اٹھ کر جا رہی تھیں تو دور تک سب ہی کی نظروں نے ان کا پیچھا کیا تھا۔

"توبہ۔۔۔ بڑی لاپروا عورت ہے۔ اپنے بننے سنورنے سے فرصت ملے تو بیٹی کو دیکھے۔ جب پوچھو' بیمار ہے' بیمار ہے۔ اصل میں تو وہ سائیکو ہو گئی ہے۔ رشتہ ہو نہیں رہا اور ماں کو کوئی فکر ہی نہیں۔ دوسری بیٹی بھی ماں جیسی ہی ہے۔" شہناز نے اپنے نظر انداز کیے جانے کی ساری کھولن ان کے اٹھنے کے بعد نکال دی تھی۔

"ہائے واقعی ماہین پاگل ہے۔ سائیکو ہے۔" مسز راشد کو جیسے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔ وہ کھسک کر شہناز کے قریب ہوئی تھیں۔

"تو اور کیا۔ آئے روز دورے پڑتے ہیں۔ شادی ہو نہیں رہی' عمر بڑھ رہی ہے بے چاری کی جو ایک بار دیکھ کر جاتا ہے۔ دوبارہ نہیں آتا۔"

"ہائے ہائے افسوس لیکن میرب کے تو بہت رشتے آ رہے ہیں' ورنہ سنا ہے' آپ بھی سمیر کے لیے میرب کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔" مسز شکیل کی بات پر یکدم ان کے چہرے پر لالی سی پھیلی تھی۔

"ہاں بھئی۔ بچوں کی خوشیاں' ان کی پسند ناپسند کا خیال بھی تو رکھنا ہوتا ہے نا۔" انہوں نے گول مول جواب دیا تھا۔ مسز راشد نے معنی خیزی سے دوسری خواتین کو دیکھا تھا اور مسکرائی تھیں۔

سارا علوی نے ان تمام خواتین کو اکٹھے دیکھ کر برا سا منہ بنا کر اپنا دھیان میرب کی طرف کیا۔ انہیں معلوم تھا ان کے اٹھتے ہی شہناز اور دیگر خواتین میں کیا گفتگو ہو رہی ہو گی۔

میرب اور سمیر باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے دونوں کو بغور دیکھا۔

"سمیر کے ساتھ میرب کی جوڑی تو بہترین ہے۔ بس میرب۔۔۔ نہ جانے اسے کس شہزادے کا انتظار ہے۔" سارا نے فکر مند ذہن سے تجزیہ کیا تھا۔

"سارا! تم یہاں اکیلی کھڑی ہو۔ خیریت۔" نواز نہ جانے کب ان کے پاس آ کر بولے تھے۔ وہ چونک کر پلٹیں۔

"ارے نواز۔" رخنا انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف لپکے تھے۔

"یار! اتنی دیر' کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے آؤ۔" رضا ان کا بازو تھام کر انہیں اپنے دوستوں کے حلقے میں لے گئے تھے۔

"ارے آپ لان میں آ گئی ہیں۔" اسے اندر گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی لیے فریش ہوا لینے کے لیے وہ باہر آ گئی تھی۔ مگر ابھی اسے آئے صرف چند منٹ ہی ہوئے تھے۔ جب سمیر پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔

"جی۔۔۔" اس نے گہرا سانس لے کر مختصر جواب دیا۔

"یہاں فریش ایئر ہے نا!" وہ خود بھی گہرے گہرے سانس لے کر بولا تھا۔

"ہوں۔۔۔ اندر چلیں۔" وہ فوراً" بولی تو وہ بری طرح چونکا۔

"کیوں۔۔۔ ابھی تو آپ باہر آئی ہیں۔ میرے ساتھ یہاں کھڑا ہونا اچھا نہیں لگ رہا۔"

"نہیں' ایکچوئیلی سب لوگ اندر ہیں۔ تو ہم دونوں کا یوں باہر تنہا کھڑے ہونا۔۔۔ آپ ان خواتین کی عادت کو تو جانتے ہیں نا۔" اس نے جھجکتے ہوئے وضاحت کی۔

"آپ بہت محتاط رہتی ہیں۔" سمیر اس کی بات سے بہت متاثر ہوا تھا۔

"جی۔۔۔ رہنا پڑتا ہے ورنہ۔۔۔" یکدم اس کی نظر لان کے داخلی دروازے پر پڑی تھی اور وہ چونک گئی تھی۔ اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ اسی لیے سمیر بھی چونک کر اس کی نظروں کی تقلید میں لان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر صاحب! مبارکاں۔ بہت بہت مبارکاں۔" وہ آتے ہی بے تکلفی سے سمیر کے گلے لگ گیا تھا۔

"تھینک یو۔ مگر تم بہت لیٹ آئے ہو۔"

"یار! لندن جا رہا ہوں۔ انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر آ رہا ہوں اور تم جانتے ہو یہاں سے ایئرپورٹ کا فاصلہ کتنا زیادہ ہے۔" اس نے وضاحت کی تو سمیر نے سرہلا کر اس کی جانب رخ موڑا۔

"میرب! یہ ایان واسطی ہے۔ انکل واسطی کا بیٹا۔ نواز انکل اس کے بابا کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" سمیر نے تعارف کی رسم نبھائی۔

"ہیلو۔" وہ بڑی نخوت اور شان سے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ بہت ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر چمکی تھی۔

"یہ میرب ہے۔ نواز انکل کی بیٹی۔" سمیر بے چارہ تعارف کے چکر میں الجھا ہوا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں تول رہے تھے۔

"ہیلو۔۔۔" میرب کے لہجے میں اس کے لہجے اور انداز سے بڑھ کر سرد مہری اور بناوٹ تھی۔

"اندر چلیں۔" سمیر نے ان سے کہا تو میرب فوراً" مڑی اور اندر آ کر سارا علوی کے قریب بیٹھ گئی اور پھر باتیں کرتے ہوئے' کھانا کھاتے ہوئے غرض ہر لمحہ' ہر جگہ اسے لگا' وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے اور جب جب ایسا احساس ہوا اس نے بے ساختہ' بے اختیار ایان واسطی کو دیکھا تھا اور اس کی نظروں سے نظریں ملی تھیں۔

"میرب! کیا بات ہے۔ کھانا کھاؤنا۔" وہ یونہی پلیٹ میں کانٹا چلا رہی تھی۔ جب سارا نے اس کی بے توجہی اور عدم دلچسپی کو محسوس کیا تھا۔

"ہوں' ہاں ایسے ہی ماما' بھوک نہیں ہے۔" وہ چونک کر بولی اور پھر کانٹا پلیٹ میں رکھ کر اٹھ گئی۔ سارا نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا۔ جوس کا گلاس تھامے ایک الگ تھلگ کرسی پر جا بیٹھی تھی اور اس کے بیٹھتے ہی جیسے وہ سنسان گوشہ آباد ہو گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔ میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔" ایان واسطی اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ بالکل بھی نہیں چونکی تھی۔ بڑی تمکنت اور غرور کے ساتھ مسکرائی تھی اور ایان واسطی کو دیکھا تھا۔

"میں نے حسین چہرے بے انتہا دیکھے ہیں۔ مگر ایسا رعب اور ایسا پرکشش باندھ دینے والا اور مبہوت کر دینے والا حسن پہلی بار دیکھا ہے۔ ایان واسطی یہی ہے تیری پسند' تیرا آئیڈیل۔ اسی کے لیے تو نے اب انتظار کیا تھا۔ اسی کے لیے تو نے اب تک بے شمار لڑکیوں کو ٹھکرایا ہے۔"

"ایکسکیوزمی اگر آپ کو کھڑے کھڑے سونے کا شوق ہے تو ضرور یہ شوق پورا کریں۔ مگر کہیں اور جا کر۔" وہ خود سے باتیں کرنا اتنا مگن ہو گیا تھا اسے پتا بھی نہیں چلا۔ میرب نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے چونکایا تو احساس ہوا' وہ کیا کر رہا تھا۔

"اوہ سوری۔۔۔ دراصل میں' میں بیٹھ کر بات کر لوں۔"

"ضرور۔۔۔" جونہی ایان بیٹھا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چل دی۔

"ارے' ارے۔" وہ ہاتھ اٹھا کر ہکلایا۔ مگر وہ تو

سے بغیر آگے چلی گئی تھی۔
"اوف۔" ایان نے میز پر مکا مارا۔ آج زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اسے نوٹس کا بورڈ دکھایا تھا۔ ورنہ ایان واسطی کی پرسنالٹی اور خوب صورتی ' وجاہت ' دولت ' اسٹیٹس سب کچھ نظرانداز کیا جانے والا نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کیفیت سے واقف تھا۔ یکدم اس کے اندر ایک ابال سا اٹھا تھا۔ خود کو نظرانداز کیا جانا اسے بہت برا لگتا تھا اور میرب نے تو اسے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایان واسطی ' جس کی دوستی اور قربت پر ہر لڑکی رشک کرتی تھی اور خواہش کرتی تھی کہ ایان اس سے دوستی کرلے۔ وہی ایان واسطی میرب نواز اکرم کے رویے سے بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔
"میں تم سے اپنا آپ منوا کر رہوں گا۔" اس نے کچھ دور کھڑی میرب کو دیکھ کر دل ہی دل میں عہد کیا تھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر ہال سے باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے رضا بھائی سے جھوٹ کیوں بولا کہ ماہین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"
واپسی پر نواز اکرم نے سارا سے پوچھ ڈالا اور انہوں نے گھور کر دیکھا۔
"تو کیا سچ بتا دیتی کہ وہ آنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ایسی پارٹیز میں آتے ہوئے شرم اور ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی ہے ' اسے احساس کمتری کا مرض ہے۔" سارا نے ایک سانس میں ماہین کی ساری خامیاں گنوا دی تھیں۔ نواز اکرم چپ رہ گئے تھے۔
"نواز! اس میں اتنا کانفیڈنس نہیں ہے کہ وہ کسی گیدرنگ میں نارمل لوگوں کی طرح شامل ہو سکے ' وہ گھبرا جاتی ہے۔ اسے اپنی بدصورتی کا کمپلیکس ہے۔" سارا کے بے رحم لہجے پر نواز بے اختیار چونکے تھے۔ پھر بے بسی سے کچھ سوچنے لگے۔
"یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے۔ شادی کے بعد نئے گھر میں نئے لوگوں کے ساتھ ' ایڈجسٹ ہونے میں اسے بہت پرابلم ہو جائے گی۔ سسرال میں تو بہت لوگ ہوتے ہیں اور سب کا رویہ اور انداز الگ۔ اگر ایسے تو وہ ایڈجسٹ ہی نہیں کر سکے گی۔"
"شادی کے بعد...!" سارا بے اختیار ہنسی تھیں "بڑی دور کی سوچی تم نے ' پہلے شادی تو ہو جائے۔"
"ہو گی۔ کیوں نہیں ہو گی۔" نواز نے فوراً امید سے کہا تھا۔
"تم نہ جانے کس دنیا میں رہ رہے ہو۔ حقیقت کا سامنا کرنا سیکھو نواز! اسے دیکھ کر جانے والے پلٹ کر نہیں آتے اور تم۔" سارا نے طنز سے انہیں لتاڑ دیا تھا۔ نواز اکرم بے بسی سے خاموش ہو گئے تھے۔ سارا علوی سے بحث نہ اس نے پہلے کبھی کی تھی نہ اب کی تھی۔ وہ سارا علوی کے سامنے بول ہی نہیں سکتے تھے۔
"ارے ہاں ' یاد آیا انور واسطی نہیں آیا تھا۔" [illegible] میرب چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔
"انور آج ہی [illegible] اسی لیے تو اس کا بیٹا ایان آیا ہوا تھا۔" نواز نے بتایا [illegible] سارا علوی پر سوچ انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھیں۔
"تم ایان واسطی سے ملے؟"
"ہاں بہت اچھا لڑکا ہے۔ زبردست بزنس مین ' باپ کی طرح شارپ ہے۔" نواز کی تعریف پر سارا نے پلٹ کر میرب کو دیکھا جو پہلے ہی الجھی الجھی نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"واہ بھئی واہ ' مزہ آگیا۔" رفعت نے چٹخارہ بھر کر لوازمات سے بھری ٹرے کو دیکھا۔ کتنے دن سے دل چاہ رہا تھا ' کباب اور سموسے کھانے کو۔ مگر اس کے گھر میں کہاں یہ عیاشیاں ہو سکتی تھیں۔ آدھ درجن بچوں کے پیٹ بھرنے کے لیے اس کی اماں ہر وہ سبزی بناتی تھی۔ جو سستی ترین ہوتی تھی۔ اسی لیے تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ اکثر ماہین کے گھر آجاتی تھی۔
"دکھاؤ ' مرو سب کچھ۔" ماہین کو بھی اس کی عادت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جب بھی آتی تھی۔ فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتا تھا۔ اسی لیے سارا علوی اس کے آنے سے چڑتی تھیں۔ مگر ماہین کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی اس اکلوتی دوست کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو اس کی ہم راز اور ہم دم تھی۔ جس سے اپنے سارے دکھ سکھ کہہ کر وہ ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔
"تمہاری ماما کہاں ہیں؟" سموسے ' کباب اور چنا چاٹ کا ملغوبہ پیالے میں ڈالے وہ جلدی جلدی کھا رہی تھی۔ ماہین کو ہنسی آگئی۔
"تسلی سے کھالو۔ اس وقت ماما اور میرب دونوں ہی گھر پر نہیں ہیں۔"
"ہوں۔" اس کا تیزی سے چلتا ہاتھ آہستہ ہوا تھا۔
"پھر کیوں نہیں بتایا ' میں ایسے ہی [illegible]" اس نے ایک اور کباب اٹھا کر پلیٹ میں ڈال لیا تھا۔
"توبہ توبہ ' [illegible] کروگی تم۔" ماہین نے طنز پر [illegible]
"ہاں کر لو تم۔ یہ سب کچھ مجھے صرف یہاں تمہارے گھر ہی کھانے کو ملتا ہے۔ کتنی لکی ہو تم۔" اس نے کچھ [illegible]
"لکی۔" ماہین کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی "میں لکی ہوں... تم کھانے کی ان چیزوں کی وجہ سے مجھے لکی کہہ رہی ہو؟" اس نے افسوس بھرے لہجے میں رفعت کو دیکھا۔
"جو تمہارے پاس ہے نا یہ نعمت ہے اور نعمت جسے مل جائے اس سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہو گا۔ مجھ سے پوچھو ' غربت کی بھوک اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے تڑپنا ترسنا کیا ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ اللہ کسی دشمن کو بھی غربت کی بھوک اور پیٹ آگ نہ دکھائے۔"
"کیا بات کر رہی ہو رفعت! پیٹ تو بھر ہی جاتا ہے۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی اور تر نوالے سے بھی مگر یہ جو بدصورتی کا احساس ہے نا! اس کی اذیت تمہیں نہیں معلوم۔" بکھرے کانچ سے لہجے میں کیسی حسرت تھی۔ رفعت منہ میں رکھا سموسہ چبانا بھول گئی تھی۔
"جو چیز جس کے پاس ہوتی ہے۔ اسے اس کی اہمیت کا علم نہیں ہوتا اور جو نہیں ہوتی۔ اس کی حسرت میں مرتا ہے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنا بہت مشکل ہے ماہین! صرف خوب صورتی کے احساس سے اسے بھرا نہیں جا سکتا۔"
"تم خود خوب صورت ہو نا ' تم نے کبھی کسی کو خود کو بدصورت کہتے نہیں سنا ہو گا۔ میں سنتی ہوں۔ اپنوں کے منہ سے بھی اور پرایوں کے منہ سے بھی ' بدصورت کالی بھونڈی جیسے الفاظ سنتی ہوں تو مت پوچھو۔ میرے دل پر کیسی قیامت گزر تی ہے۔ پوچھے کوئی مجھ سے ' میں پیٹ سوکھی روٹی سے بھر کر خوش ہو جاؤں۔ اگر میرا چہرہ خوب صورت ہو جائے۔"
رفعت کے حلق میں نوالہ پھنس گیا تھا ' اتنا بڑا دعوا اور وہ خود اپنے گھر والوں کو بتاتی تھی کہ ماہین بہت خوش قسمت ہے۔ دولت مند ' امیر باپ کی بیٹی ہے۔ جو چاہے ' حاصل کر لے۔ بڑھیا سے بڑھیا کپڑا ' قیمتی جیولری ' جوتے ' میک اپ کا ان گنت سامان ' کھانے کو ہر وہ چیز جو ہم لوگ مہینوں سوچ کر بھی نہ کھا پائیں۔ کیسی خوش قسمت ہے وہ ' جو چاہا پا لیا۔ جو پسند کیا ' لے لیا اور ہم۔" اس کے لیے اپنا اور ماہین کا مقابلہ بھی مشکل تھا۔
"خیر ' تم کھاؤ نا۔ رک کیوں گئی ہو۔" اسے گم صم دیکھ کر ماہین نے ٹوکا تو وہ چونکی۔
"ہاں بس! بس کھالیا۔ پیٹ بھر گیا ہے میرا۔" اس نے پلیٹ میں موجود چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔
"اوکے ' ٹی ' وی لگا دوں۔ دیکھو گی۔" ماہین نے ریموٹ اٹھایا۔
"ہاں یار! تمہارے اس سینما کی اسکرین جتنے بڑے ٹی وی میں تو ڈراما دیکھنے کا لطف ہی اور ہے۔" وہ چینل سرچنگ میں لگی تھی۔ ماہین اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نگاہ اس کی طرف اٹھی تو ہٹ نہیں سکی۔
"تیز آتشی رنگ میرا فیورٹ ہے۔ مگر اس کے

گورے رنگ پر کتنا سجتا ہے۔ کیسے لشکارے مار رہی ہے اس کی اسکن صاف ستھری چمکدار یہ تو میرب سے بھی زیادہ فریش لگتی ہے اور کہنے کو یہ غریب ہیں۔ حسن کی دولت سے مالا مال غریب!"

"کیا دیکھ رہی ہو اتنے غور سے؟" یکدم رفعت نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو آج کل۔ بڑی نکھری نکھری اور گوری لگ رہی ہو۔ کوئی نئی کریم تو خفیہ استعمال نہیں کر رہی ہو۔ مجھ سے چھپا کر.....!" اس نے شکی لہجے میں پوچھا تو رفعت بے ساختہ زور سے ہنسی۔

"قسم لے لو۔ میں نے کون سی کریم لگانی تھی 'یار! ہماری ایسی حیثیت کہاں کہ مہنگی مہنگی کریمیں خریدیں۔ بس وہی مالٹے کے چھلکے پیس کر ہلدی میں ملا کر لگا رہی ہوں۔"

"ہائے میں نے بھی یہ ابٹن استعمال کیا تھا مگر مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"تم اتنی بے صبری کیوں ہو۔ تھوڑا وقت تو لگتا ہے نا۔ اب پیدائشی کالا....." وہ کہتے کہتے یکدم رکی' بے ساختہ اپنی زبان دانتوں تلے دبائی۔

"ہاں ہاں بولو نا..... بولو نا..... تم بھی کہہ دو۔ پیدائشی کالا رنگ سفید نہیں ہوتا۔"

"ماہی' سوری یار! میرا مطلب یہ نہیں تھا' میں تو کہہ رہی تھی کہ ضروری نہیں کہ پیدائشی کالا رنگ ہمیشہ کالا ہی رہے۔ گورا ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہو جاتا ہے۔ تمہیں وہ کالج فیلو پنکی یاد ہے۔ جو اسکول میں تو اچھی خاصی کالی ہوا کرتی تھی۔ مگر بعد میں جب ہم نے اسے کالج میں دیکھا تھا تو کیسی گوری چٹی نکلی تھی۔"

رفعت نے لمحوں میں بات کو بدلا تھا اور بہت اعتماد سے کہ ماہین کے چہرے پر پھیلنے والی ناراضی کی لالی کافی کم ہوئی تھی۔

"ہاں اسی لیے تو میں بھی کہتی ہوں کہ میرا رنگ ہمیشہ ایسا نہیں رہے گا۔"

"بالکل نہیں رہے گا۔ آئی نو..... ڈونٹ وری یار' یہ دیکھو آمنہ شیخ کو۔ سانولی ہے مگر کتنی خوب صورت لگتی ہے اور اداکاری تو غضب کی کرتی ہے۔" [illegible]

"ہوں..... ارے فون آرہا ہے۔ ایک منٹ۔" وہ فون اسٹینڈ کی طرف گئی تو رفعت نے جلدی سے ریموٹ اٹھالیا۔ اپنے 14 انچ کے پرانے ڈبے میں پھیکے پھیکے رنگوں والے ڈرامے دیکھنے کا لطف ہی نہیں آتا تھا۔ جو مزہ یہاں 36 انچ کی اسکرین پر دیکھنے میں آتا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے تیسری بیل پر فون اٹھالیا۔

"ہیلو میرب.....!" دوسری جانب کوئی اجنبی آواز تھی۔

"ہیلو..... کون بول رہے ہیں؟" اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھریں۔

"میں ایان بول رہا ہوں۔ میرب سے بات کروا دیں۔"

"کون ایان.....؟" اس نے یہ نام آج ہی سنا تھا۔

"ایان واسطی میرا نام ہے میڈم اور میں میرب نواز اکرم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" دوسری جانب ایان بھی اس تفتیش سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اسی لیے کھردرے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ اس لیے بات نہیں کروا سکتی۔"

"اتنی سی بات کے لیے اتنی تفتیش۔" وہ کہے بغیر رہ نہیں سکا۔ دوسری جانب ماہین کو اس کی بات سے فوراً غصہ چڑھا تھا۔

"اتنی سی بات نہیں مسٹر۔ ابھی آپ کی نئی نئی دوستی ہوئی ہے نا۔ اسی لیے' خیر پتا چل جائے گا۔ او کے۔" فون رکھ کر اس نے کندھے جھٹکے اور رفعت کی طرف آگئی۔

"کس کا فون تھا.....؟" اس کے آف موڈ اور الجھے الجھے انداز سے رفعت نے کہا۔

"کسی لڑکے کا تھا۔ ایان واسطی کا؟"

"ایان واسطی۔ یہ کون ہے بھئی؟" رفعت بری طرح چونکی۔

"مجھے کیا خبر' میرب کو پتا ہوگا۔ اسی کا کوئی نیا عاشق تھا۔" [illegible] کر چلے بھنے انداز میں ماہین نے جواب دیا تھا۔ رفعت نے گہرا سانس لیا۔

"اوہ..... میں سمجھی۔ کوئی تمہارا....." اس نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

"میرا..... دماغ خراب ہے تمہارا۔ میرے لیے کوئی فون کیوں آئے گا۔" ماہین کے لہجے میں حسرت اور خواہش تھی۔

"ایسے تو نہ کہو یار! تم اتنی بھی بری نہیں ہو۔ جتنا خود کو سمجھتی ہو۔"

"میں خود کو جو سمجھتی ہوں۔ بالکل ٹھیک سمجھتی ہوں۔ خیر آؤ میرے کمرے میں' تمہیں اپنا نیا جوتا دکھاؤں۔ وہ پنک سوٹ کے ساتھ خریدا تھا۔ ماہین کے لیے اپنی ذات کو موضوع گفتگو بنانا ہمیشہ ہی ناقابل قبول اور ناقابل برداشت رہا تھا۔ اس کے باوجود اسی کی ذات [illegible] سب سے زیادہ موضوع گفتگو بنتی بھی تھی اور وہ بھی منفی انداز میں' رفعت کے ساتھ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے [illegible] خود کو اس اذیت ناک سوچ سے آزاد کروالیا۔

☆ ☆ ☆

"ایان واسطی کیسے ہیں آپ؟" میرب نے مسکرا کر پوچھا اور خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے ایک بار پھر شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اس دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔

"بالکل ٹھیک۔" وہ مسکرایا۔

"آپ دن میں کہیں گئی ہوئی تھیں؟"

"کیوں؟" بالوں کو سنوارتے ہوئے اس کا ہاتھ رکا۔

"میں نے آپ کے سیل پر رنگ کیا تو بند تھا۔ گھر والے نمبر پر کوئی خاتون تھیں۔ بڑے عجیب انداز میں انہوں نے انویسٹی گیشن شروع کردی۔"

"اوہ....." اس نے گہرا سانس لیا۔ "وہ میری بہن ہے۔"

"دات۔ مگر وہ تو...." ایان نے بمشکل خود کو پاگل کہنے سے روکا۔

"فینا ٹیکو ہے وہ۔" اگلے ہی پل میرب نے اس کے خیالات کی تصدیق کردی تھی۔

"آئی سی۔ ویری سیڈ۔"

"او کے' آپ بتائیں۔ کیوں فون کیا ہے؟" اس سے قبل کہ وہ ہمدردی کی آڑ میں اس سے مزید خاندانی معلومات لیتا۔ میرب نے بات بدل دی تھی۔

"آپ سے بات کرنے کے لیے۔" اس کا لہجہ سادہ مگر بہت پر اعتماد تھا۔

"اور اگر میں بات نہ کروں۔"

"ناممکن۔" بڑا پر اعتماد لہجہ تھا اس کا' میرب بے اختیار چونکی۔

"بڑے خوش فہم ہیں آپ۔"

"کیا نہیں ہونا چاہیے۔ خوب صورت لوگوں کو اپنی خوب صورتی کا احساس ہونا ہی چاہیے۔"

"واہ! ہمارے خیالات تو بہت ملتے جلتے ہیں۔" اس نے بے اختیار داد دی۔

"تو پھر دوستی پکی۔"

"سوچوں گی۔" اس نے نخرے سے کہا۔

"میرے بارے میں سوچیں گی؟" بڑا مغرور اور خود پسند لہجہ تھا اس کا۔

"میں دوستی کے معاملے میں بڑی چوزی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ پھر تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دو خوب صورت لوگ۔"

"آپ کو اپنی خوب صورتی کا کچھ زیادہ ہی احساس ہے نا۔"

"حق ہے ہمارا۔" ایان کا تفاخر بھرا لہجہ میرب کو بے حد اچھا لگا تھا۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔

"ہم کب مل رہے ہیں؟" وہ بہت سے مرحلے ایک ساتھ طے کرتا بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔ اسی پل میرب نے فیصلہ کیا اب اسے یہ چانس مس نہیں کرنا چاہیے۔

"جب آپ کہیں۔" اس کے لہجے میں رضامندی تھی۔

"پھر بہت جلد آپ سے ملاقات ہوگی۔" ایان نے

بے اختیار ہنس کر کہا تھا۔
"او کے بائے۔"
"بائے۔" فون بند کر کے مسکراتے ہوئے جگمگا کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔
"پرفیکٹ میچ۔ خوب صورت میری طرح' ہینڈسم اسمارٹ اور دولت مند...!"
"باجی ... باجی!" خالد دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ خیالوں سے چونکی۔
"کیا مسئلہ ہے؟" اس بے وقت کی مداخلت پر وہ خفگی سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔
"بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"
"آتی ہوں۔" اس نے ایک نظر مڑ کر بیڈ پر بکھرے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔
"خالد! میرے سارے کپڑے الماری میں لٹکا کر بیڈ کو ٹھیک کر دو اور میری کسی دوسری چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔"
"جی ..." اسے کام سے لگا کر وہ باہر آئی۔ لاؤنج میں ماما گم صم' سنجیدہ بیٹھی تھیں۔ اسے حیرت ہوئی۔ ماما اور اتنی سنجیدہ۔
"ماما! کیا ہوا ...!" اس نے قریب جا کر انہیں پکارا تو وہ بے اختیار چونکی تھیں۔
"ہوں کیا؟"
"کس کا فون تھا!" اس کی نظر ان کے ہاتھ پر گئی جو ابھی تک کریڈل پر دھرا تھا۔
"مسز رشید کا فون تھا۔"
"پھر ...!"
"وہ کل شام کو ایک فیملی کے ساتھ آ رہی ہیں۔ ماہین کا پرپوزل ہے۔"
"چلو ... پھر وہی تماشا۔ کب ہو گی یہ پرابلم حل؟" اس نے بے زاری اور کوفت سے ماں کو دیکھ کر کہا تو سارا علوی نے جواباً اسے گھورا۔
"دعا کرو۔ رشتہ تو اچھا ہے۔" سارا علوی کی بات پر وہ طنز سے ہنسی۔
"رشتے تو سارے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ مگر وہ اچھے ہمیں اچھا نہیں سمجھتے۔"
"تم اس بار اسے پارلر سے تیار کروانا کہ کچھ تو بہتری آئے۔"
"وہ اتنی ضدی اور کوڑھ مغز ہے کہ میری بات کبھی بھی نہیں مانے گی۔"
"کیوں نہیں مانے گی۔ میں کہوں گی اس سے اور اس بار تم بھی سامنے نہ آنا۔ اللہ کرے' یہ کام ہو جائے تو پھر میں تمہارے بارے میں بھی سوچوں گی۔"
"واٹ' میرے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے ماما!"
"کیوں تم نے شادی نہیں کرنی؟" سارا علوی نے حیرانی سے پوچھا۔
"کروں گی مگر ابھی نہیں۔" اس نے نخرے سے اپنے شہد رنگ بالوں کو سنوارا۔
"رشتوں کی بارش ایک خاص عمر تک ہوتی ہے۔ وہ عمر گزر جائے تو پھر خوب صورتی' دولت اور خاندان سب بے کار ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کی عمر بہت بڑا فیکٹر ہوتی ہے۔" سارا علوی نے سمجھایا۔
"پھر تو آپ کو ماہین کی شادی بہت جلد کر دینی چاہیے تھی۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔ تو سارا علوی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔
"ہر بات کو مذاق میں نہ اڑایا کرو۔" انہوں نے خفگی سے اسے گھورا۔
"ماما! مجھے لائف انجوائے کرنے دیں۔"
"ویسے مجھے ایان واسطی تمہاری ساری کولیکشن میں سب سے اچھا پیس لگا ہے۔" سارا علوی کی بات پر وہ بڑے فخر سے مسکرائی تھی۔
"یس ... آئی تھنک۔ آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔"
"تو پھر ...!"
"مجھے اس کے نام اور خاندان کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہے ماما! اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے دیں' تاکہ میں اسے سمجھ لوں۔ پھر دیکھوں گی۔"

"ویسے بھی زیادہ وقت سمجھنے سمجھانے میں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے اچھے لڑکوں پر سب ہی کی نظر ہوتی ہے۔"
"تو ہو۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ لڑکے کی نظر کس پر ہے۔" میرب معنی خیزی سے کہہ کر مسکرا دی۔
"اس کی ماں عالیہ واسطی مشہور سوشل ورکر ہے۔ اپنی این جی او چلاتی ہے کافی مشہور ہے۔" سارا علوی نے گویا اسے وارننگ دی تھی کہ اب کے پارٹی خاصی مضبوط ہے۔
"ماما! آپ ہی تو کہتی ہیں۔ آج کل کے بچے اپنے والدین کی بھی نہیں سنتے۔ اپنی منواتے ہیں۔ تو فکر نہ کریں۔ ایان واسطی اب کہیں اور نہیں جا سکے گا۔" اس کے بے پناہ اعتماد پر سارا علوی نے بغور اسے دیکھا تو۔
"ویسے' جو بات اسے سمجھ آ گئی تب اپنی شکل کچھ بہتر بنا لے۔ میک اپ ڈھنگ کا کروانا ہو گا کہ ... کل تک ماما۔" سارا علوی کی بات وہ زور سے ہنسی اور پھر سارا کے گھورنے پر ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔
"اف ..." اس کے جانے کے بعد سارا نے اپنا سر تھام لیا۔ "کب مسئلہ حل ہو گا اس لڑکی کا۔ کیا اپنی پھپھی کی طرح یہ بھی کنواری رہے گی اور ... توبہ۔" سارا علوی نے اپنی سوچ پر خود ہی کپکپا کر جھرجھری لی اور پھر فون سیٹ دوبارہ اپنی جانب کھسکایا۔

☼ ☼ ☼

نواز اکرم اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب رضا کا فون آ گیا۔
"یار! میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔"
رضا نے سلام دعا کے بعد وہی گلہ کیا تھا۔ جس کا نواز اکرم کو ڈر تھا۔
"ہاں وہ بس ... آج کل بہت مصروفیت ہے۔ ڈلیوری ارجنٹ ہے۔ دن رات کام ہو رہا ہے۔ کل بھی رات ایک بجے تک آفس میں ہی بیٹھا رہا ہوں۔"
"مانتا ہوں یار! تو بہت بڑا بزنس مین ہے۔ کام بھی زیادہ ہے مگر دراصل تمہاری بھابھی نے مجھے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ سمیر کا ویزا لگ گیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کے امریکہ جانے سے قبل منگنی یا نکاح کر دیا جائے۔" نواز اکرم گم صم سے سن رہے تھے۔ یہ لوگ تو بہت آگے کی سوچ بیٹھے تھے۔
"ہیلو نواز!" ان کی خاموشی سے گھبرا کر رضا نے دوبارہ انہیں پکارا تھا۔
"ہاں' ہاں سن رہا ہوں۔"
"تو پھر جواب بھی دو نا یار!" رضا نے ناراضی سے کہا تھا۔
"جواب ..." نواز کے گلے میں کچھ پھنسا تھا۔ بیس سالہ دوستی میں کوئی ایک لمحہ' کوئی ایک پل بھی اتنا بھاری انہیں نہیں لگا تھا کہ رضا جیسے دوست کو کچھ کہنا مشکل ہو مگر اب خوف تھا کہ وہ نہ جانے کیا کہیں گے۔ ان کے انکار کو کس رنگ میں لیں گے اور یہ انکار کہیں ان کے تعلقات میں کوئی دراڑ نہ پیدا کر دے۔
"رضا یار! بات دراصل یہ ہے کہ آج کل بچے اپنی من مانی کرتے ہیں' تم جانتے ہو نا۔ ان کی اپنی پسند' اپنی ترجیحات اور اپنی آئیڈیالوجی ہے تو...!"
وہ ذرا دیر رک کے مناسب اور نرم الفاظ استعمال کر کے وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرنا چاہتے تھے۔
"تو!" رضا نے جملہ اچک لیا "تم کھل کر کہو نا۔ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔ انکار کرنا چاہتے ہو۔"
رضا کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔
"میں نہیں کرنا چاہتا۔ مگر میرب نے خود ... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"
"بھابھی کیا کہتی ہیں؟"
"سارا ... وہ میرب کی مرضی کے بغیر کیا کہہ سکتی ہے۔"
"اچھا' چلو خیر' یہ تو قسمت کے ملاپ ہیں۔ اگر ان کی قسمت میں ملنا نہیں تو ہم تم کیا زبردستی کریں گے۔ مگر مجھے دلی خوشی ہوتی اگر یہ رشتہ طے ہو جاتا۔ ہماری

دوستی مزید پکی ہو جاتی۔"

"ہماری دوستی کو پکا ہونے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے یار! ہم تو دوست ہیں اور رہیں گے۔ یہ رشتے ناتے، گھرداریاں تو بعض ہم اپنی سہولت کے لیے بنا لیتے ہیں۔ مگر دوستی کا کوئی نعم البدل نہیں۔ کوئی جوڑ نہیں۔" نواز اکرم نے جذباتی لہجے میں کہا تو رضا خاموش ہو گئے تھے۔

"اور اب ــــ!" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "کیا رضا کے ساتھ میرے تعلقات پہلے جیسے ہی رہیں گے۔" انہیں رہ رہ کر یہی خیال آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں آئی تو ثروت کرسی پر سر جھکائے گم صم بیٹھی تھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"آگئی ہو ڈانٹ کھا کر۔"

"بالکل۔" اس نے مزے سے بیڈ پر جمپ لگائی۔ "آپ وہاں کیوں بیٹھی ہیں۔ یہاں آئیں نا!" وہ اس کے قریب بستر پر آ بیٹھی تو ماہین نے مزے سے اس کی گود میں سر رکھ لیا۔

"سارا بھابھی بہت ناراض تھیں نا!" ثروت نہ چاہتے ہوئے بھی سوال پوچھ گئی۔

"معمول کی بات ہے ــــــــ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کا چڑیا گھر تو ٹھیک تھا نا؟"

"ہاں۔ تمہارے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنے والے ہیں نا!" ثروت کی سوئی وہاں ہی اٹکی تھی۔

"معمول کی بات ہے۔" اس نے مکھی اڑائی۔

"کم از کم یہ تو معمول کی بات نہیں ہے۔" ثروت نے اس کی لاپروائی کا نوٹس لیا۔

"تم اتنی لاپروا تو نہیں تھیں۔ رشتے ــــ"

"آتے جاتے رہتے ہیں ....." اس نے بات کاٹی۔ "اچھی سی ٹی بریک کر کے چلے جائیں گے۔ یہی ان کا مقصد ہوتا ہے۔" وہ بے رحمی سے ہنسی۔

"مگر ہر بار ایسا ہی ہو ضروری نہیں ہے۔ کیا پتا۔"

"پتا ہے مجھے ــــ بس آپ یہ ٹاپک رہنے دیں۔" اس نے ثروت کی گود سے نکل کر تکیے پر سر رکھا۔

"تمہارا اچھا نہیں رہا تمہیں یہ سب۔ اس وقت میں بالکل تنہا ہوتی ہوں اور آج ارے ہاں ــــ آپ کو ایک بات بتاؤں۔" اس نے راز داری سے اسے دیکھا۔

"میرب نے آج کل ایک نئے لڑکے سے دوستی کی ہے۔" اس کی توجہ پر ماہین نے گویا انکشاف کیا تھا۔ ثروت نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"قسم سے ...... اس کا نام ایان واسطی ہے اور وہ عثمان سے بھی زیادہ خوب صورت اور امیر ہے۔ بلکہ اب تک میرب کے جتنے بھی دوست تھے نا۔ میرا مطلب عاشق ان سب سے زیادہ ایان واسطی اچھا ہے۔"

"ماہین! توبہ توبہ یہ ہو گیا ہے تمہیں بیٹا کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ لڑکوں کی دوستی پر فخر اور وہ بھی عامیانہ اور جذباتی دوستیاں۔ بلکہ عشق، عاشقی کے چکر۔"

"یہ سب آپ کی نظر میں عامیانہ اور سستی ہوگی۔ آج کل تو جس لڑکی کے زیادہ دوست ہوتے ہیں وہ ہی پاپولر بھی جانی ہے۔"

"پاپولر یا بے حیائی کی شہرت۔ ہم نے تو کبھی ایسی پاپولرٹی کو پسند نہیں کیا۔ کو ایجوکیشن میں پڑھا۔ سب کچھ کیا۔ مگر ــــ"

"ارے ..... آپ اور میں ــــ ہم جیسے تو اس دوڑ میں شامل ہی نہیں ہوتے۔"

ماہین نے زخمی لہجے میں گویا اپنی بدصورتی کا مذاق اڑایا تھا۔ ثروت نے دکھ سے اسے دیکھا۔ اس کا کامپلیکس کبھی بھی ختم نہیں ہوگا اور ہوتا بھی کیسے۔ اسے ہر وقت تو اس بات کا احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ کم تر ہے۔ میرب سے مقابلہ بازی نے اس کے اندر کی ساری صلاحیتوں کو کند کر دیا تھا۔ ورنہ وہ میرب سے زیادہ ذہین تھی۔ رحم دل اور حساس تھی۔ مگر لوگوں کے بے رحم رویوں نے اسے اندر سے توڑ پھوڑ ڈالا تھا اور اب وہ بھی اکثر بہت سفاکی سے دوسروں کے بارے میں بات کر جاتی تھی۔ جو ثروت کے خیال میں بالکل بھی اچھی چیز نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں! وہ بہت خوب صورت ہے۔ بالکل پرفیکٹ میرا جوڑ۔ میرے جیسی ہی خوب صورت اور اسمارٹ۔" ایان واسطی بہت زیادہ پرجوش ہو رہا تھا۔ عالیہ واسطی نے مسکرا کر اپنے اسمارٹ اور بے حد خوب صورت وجیہہ کے مالک بیٹے کو دیکھا۔

"تو پھر کب ملوا رہے ہو اس سے؟" انہوں نے جوس کا سپ لے کر پوچھا۔

"بہت جلد۔ آپ نواز اکرم، نواز ٹیکسٹائل انڈسٹری والے انہیں جانتی ہیں۔"

"ہوں نام تو سنا ہے۔ تمہارے پاپا زیادہ اچھا جانتے ہوں گے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ نواز اکرم کی بیٹی ہے۔" ایان نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا ــــ سارا اعوان سے تو میں ملی ہوں۔ بہت حسین خاتون ہے۔"

"اس کی بیٹی ماما ــــ آپ بھی دیکھیں گی۔ ہماری جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔ دنیا دیکھے گی۔"

ایان واسطی کی خود پسندی اور غرور اس وقت انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ وہ اپنی خوب صورتی پر اترانے والا انتہائی خود پسند سطحی انسان تھا، جس کی بات میں سے شروع ہو کر میرے تک ہی رہتی تھی۔ لوگوں کی باتوں، لڑکیوں کی سراہتی نظریں۔ دوستی کی خواہش مند عاشقین کی ایک لمبی قطار اور ان سب کے بیچ راجہ اندر بنا ایان واسطی۔ وہ اگر ایسا تھا تو اس میں قصور اس کا نہیں تھا۔ اسے ایسا بنا دیا گیا تھا۔ ہر وقت اپنے حسن کی تعریفیں سنتا تھا۔ لڑکیاں مڑ مڑ کر اسے دیکھتی تھیں۔ بے شمار لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی اور بے شمار کو وہ چھوڑ چکا تھا۔ مگر اپنے فعل پر نہ کوئی شرمندگی تھی نہ ہی ندامت۔ وہ چاہے جانے کو اپنا حق سمجھتا تھا اور اس حق کا بے دریغ استعمال کرنا بھی اسے خوب آتا تھا۔ عالیہ واسطی اس کی دوستیوں اور آئے دن کے اسکینڈلز سے بے زار بھی تھیں اور پریشان بھی۔

"اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں میں سے کسی ایک کو سلیکٹ کر کے شادی کر لو۔" وہ اکثر اس سے کہتی تھیں۔ مگر وہ سنجیدہ نہیں ہوتا تھا اور اب وہ میرب نواز کے لیے سنجیدہ ہو گیا تھا۔ تو یقیناً" میرب نواز میں کچھ خاص تھا۔ انہیں یکدم ہی میرب کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا تھا۔

"ماما! کیا سوچ رہی ہیں؟" ایان نے ماں کو اتنی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر پوچھا تو وہ بے اختیار چونکیں۔

"میرب کے بارے میں سوچ رہی تھی، میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جو میرے بیٹے کی پسند ہے۔"

"میں میرب سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔" ایان نے بڑا سا گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں انتظار کروں گی ایان!" انہوں نے جاتے جاتے اسے دوبارہ یقین دہانی کروائی۔

"اوکے مام!" آخری سیڑھی پر رک کر اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں یقین دلایا تھا مگر انہیں اس کی بات پر بہت زیادہ یقین نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم..... تم کیوں آئے ہو؟ ڈرائیور کہاں ہے؟" وہ تیار ہو کر باہر آئی تو ڈرائیور کی جگہ کاشف کو دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

"ڈرائیور کسی مہمان کو چھوڑنے گیا تھا۔ اسی لیے میں۔ صاحب نے مجھے بھیج دیا۔" وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔

"اچھا تمہیں رفعت کے گھر کا پتا ہے۔" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جی۔ اگر آپ راستہ بتائیں گی تو آپ کو لے جاؤں گا۔"

"اچھا..... تو چلو پھر مین روڈ تک چلو۔ وہاں سے آگے بتا دوں گی۔"

اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا اور تیزی سے گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔ رفعت کا گھر اس کے گھر سے خاصا دور تھا۔ وہ ایک متوسط محلے میں رہتی تھی۔ اور ماہین شہر کے پوش ترین علاقے میں اور اسے اتنی دور محض اسی لیے آنا پڑتا تھا کہ اس کے ساتھ شاپنگ پر سوائے رفعت کے اور کوئی نہیں جاتا تھا۔ میرب یا ماما دونوں کی چوائس اور اسٹائل بالکل مختلف تھا اور ویسے بھی وہ ماہی کے ساتھ جانا اپنی توہین سمجھتی تھیں۔ دو حسین ترین چہروں کے درمیان وہ بد صورت چہرہ اسے میرب کے ساتھ بیٹھ کر اپنا آپ ہمیشہ ہی بہت برا اور کم تر لگتا تھا۔ بقول میرب.....

"آرام سے گھر بیٹھو، تمہیں ساتھ لے جا کر شرمندہ نہیں ہونا مجھے۔ خوامخواہ کی وضاحتیں دیتے رہو۔ لوگ یقین ہی نہیں کرتے کہ تم میری بہن ہو۔" وہ بڑے بے رحم انداز میں کہتی تھی ماہین آگے بڑھنے سے نجانے کتنی دفعہ پیچھے ہٹی جاتی تھی۔

رفعت کے گھر سے اسے پک کر کے وہ دونوں بازار کی طرف روانہ ہوئی تھیں۔ راستے بھر رفعت نے اس کا برین واش کیا تھا۔

"تم میرب کے مشورے پر کیوں چلتی ہو۔ اس نے کبھی تم سے تمہارا مشورہ مانگا ہے۔ سنا ہے۔ جو جی چاہتا ہے کرتی ہے۔ تو پھر تمہیں کیوں مشورے دیتی ہے کہ یہ پہنو وہ پہنو، یہ رنگ نہ لینا۔ وہ سرا سر تمہاری کیوں ہو اس کی بات؟"

آتے ہوئے میرب نے اس سے کہا تھا "کہ ہلکے اور کول رنگ لینا تاکہ تم پر سجیں" اور یہی بات اس نے رفعت کو بھی بتا دی تھی اور بس.....

"اچھا بابا اچھا۔ اب بس بھی کرو۔ سن لی ہیں تمہاری نصیحتیں۔ اس کا تو لحاظ کرو۔" اس نے اس کی توجہ ڈرائیو کرتے کاشف کی جانب دلائی، جو بظاہر بڑے انہماک اور توجہ سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مگر یقیناً بہرا نہیں تھا۔

"وہ گاڑی چلا رہا ہے۔" رفعت نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

"تو کانوں سے نہیں ہاتھوں سے چلا رہا ہے بی بی کیئر فل۔" اس نے اسے ٹوکا تھا۔ مگر اس پر کسی نصیحت کا اثر کہاں۔ لمحوں کے بعد ہی وہ دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ بار بار ٹوکا دینے کے باوجود وہ خاموش نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس کی باتوں سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر اس کا موضوع گفتگو خود ماہین کی ذات تھی۔ جو اس کے لیے تکلیف کا سبب تھی اور پھر کاشف بھی وہ سب سن رہا تھا۔ جو وہ کسی اور کو سنانا نہیں چاہتی تھی۔

"پتا نہیں یہ سب سوٹ مجھ پر اچھے بھی لگیں گے یا نہیں۔" رفعت کے جانے کے بعد اس نے تینوں سوٹ شاپر سے نکال کر دیکھے۔

"بہت اچھے لگیں گے آپ پر۔" وہ بری طرح چونکی۔ کاشف بیک ویو مرر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یکدم ناگواری کی لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"کیا مطلب؟" تھا تو وہ پاپا کا ملازم ہی نا اور اسے اس طرح رائے دینے کا کوئی حق بھی نہیں تھا۔ اس کی ناگواری اور غصہ کاشف نے بھی فوراً بھانپ لیا تھا۔

"میرا مطلب ہے۔ آپ تو بچپن سے ہی یہ رنگ پہن رہی ہیں۔ اس لیے سوٹ بھی کریں گے۔"

"بچپن سے.....؟" وہ چونکی۔ "تمہیں میرا بچپن یاد ہے؟"

"بالکل میں کیسے وہ دن بھول سکتا ہوں، چودہ سال کا تھا جب آپ کے گھر آیا تھا۔ رو رہا تھا۔ آپ نے مجھے کھانا دیا تھا اور مجھے سمجھایا تھا کہ ہمت سے کام لو اور محنت کرو۔ تم پڑھو گے تو تمہیں نوکری کر لینا اور یوں تمہاری زندگی کی ساری محرومیاں اور ناکامیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل کیا۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میرا سوتیلا باپ اور ماں دونوں مجھ پر ظلم کرتے تھے۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔" وہ سانس لینے کو رکا اور وہ سانس روکے سن رہی تھی۔

"اس پوری دنیا میں میرا ایک ہی مہربان ہے۔ جس کے احسانوں کا بدلہ میں اتار نہیں سکتا اور وہ ہیں آپ کے والد۔ جنہوں نے مجھے پڑھایا۔ میرا خرچ اٹھایا اور پھر مجھے اپنے دفتر میں ملازمت دی اور ان کی اس مہربانی کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ مہربان پری!"

"مہربان پری.....!" جیسے جھماکا سا ہوا تھا۔ کئی سال پہلے کی وہ آگ برساتی دوپہر تھی۔ اس کا اور میرب کا حسب معمول جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں ہمیشہ کی طرح ماما نے میرب کی بات کو سچ جانا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے آگ برستی دوپہر جیسی گرمی میں کمرے سے نکال دیا تھا۔ وہ اس زیادتی پر بے بسی سے روتی ہوئی باہر والے برآمدے میں آ گئی تھی۔ اس برآمدے سے بیرونی گیٹ صاف نظر آتا تھا۔ یکدم روتے روتے اس کی نظر سامنے اٹھی تھی۔ چودہ پندرہ سالہ دبلا پتلا لڑکا گیٹ کی جالیوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ زمین سے اٹھ کر رونا بھول کر اسے حیرت سے دیکھا۔ اب وہ اسے اشارہ کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی جگہ بیٹھی رہی پھر اٹھ کر گیٹ کی جانب چل دی۔

بلونڈ بالوں کا ہم عمر لگ رہا تھا۔ وہ قریب آ گئی۔

"پانی..... پانی پلا دو مجھے بہت پیاس لگی ہے۔" وہ سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بے حد پیاسا لگ رہا تھا۔ آواز بھی بہت مدھم اور ملتجی لہجہ سوکھا بدن۔ کمزور سا سامنے اس کا خوف زائل ہو گیا تھا۔

"تم ٹھہرو میں ٹھنڈا پانی لاتی ہوں۔" وہ فوراً اندر کی جانب بھاگی۔ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لی، گلاس اٹھایا اور بہت تیزی سے واپس پہنچی۔

"ہیں۔ کہاں گیا!" وہ اسے جہاں چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ وہاں نہیں تھا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"اوئے چور کے بچے! میں تو مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔ الو کے پٹھے! گیٹ پر چڑھ رہا تھا۔" کچھ دور خان بابا اسے کان سے پکڑے گولی سے اڑانے کو تیار کھڑا تھا اور وہ کمزور سا کانپتا، شدید خوف زدہ ہاتھ باندھے معافیاں مانگ رہا تھا۔

"میں چور نہیں ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے جانے دو۔" اس کا دل کانپا۔

"خان بابا۔! چھوڑ دو اسے۔" وہ بے ساختہ ہی دھاڑی تھی۔ پانی کی بوتل سمیت اگلے چند قدموں میں اس کے مقابل تھی۔

"خان بابا! کیوں مار رہے ہو اسے۔"

"یہ گیٹ پھلانگ کر چوری کی نیت سے اندر آنا چاہتا تھا بی بی! میں نے دیکھ لیا۔ بھاگ رہا تھا۔"

"خان بابا! یہ چور نہیں ہے۔ یہ تو۔۔۔ لو پانی پی لو۔" اسے یکدم ہاتھ میں تھامی ٹھنڈی ٹھنڈی بوتل کا خیال آیا تھا۔ فوراً" اس کی جانب بڑھا دی۔ جسے اس نے جھپٹ کر پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ پوری بوتل پی گیا تھا۔

"بی بی! تمہیں نہیں پتا، تم ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی کرتی ہو۔ ہمدردی کرتی ہو۔ مگر یہ آوارہ، چور اچکے۔"

"میں آوارہ، چور اچکا نہیں۔" اس نے فوراً" خان بابا کی درستی کی تھی۔ ٹھنڈا پانی پی کر حواس بحال ہوئے تھے۔

"بی بی! تم بچی ہو۔ تمہیں لوگوں کی پہچان نہیں ہے۔ یہ سارے سوکھے سڑے کمزور لوگ اس جیسے جنہیں آپ محتاج سمجھتی ہو۔ یہ دوسروں کو نقصان دیتے ہیں۔ کتنی نرم دل ہو تم۔ ہر کسی پر مہربان۔ مگر یہ چور ڈاکو!"

"اوئے خان۔۔۔! مجھے دوبارہ چور ڈاکو نہ کہنا۔" اس لڑکے نے بے حد ناراضی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"بہت شکریہ آپ کا۔ آپ مہربان پری ہو۔"

"مہربان پری۔" اس نے حیرت اور اجنبیت سے دہرایا، وہ مہربان تو تھی۔ مگر پری نہیں تھی۔ اپنے لیے کسی کے منہ سے پری کا لفظ سنتا۔ وہ بھی پہلی بار حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی۔

"صاحب آگئے۔" گیٹ پر پاپا کی گاڑی کا ہارن بج رہا تھا۔ خان بابا ادھر دوڑا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے اطمینان سے کھڑے لڑکے کو دیکھا۔

"کاشف۔۔۔ سب کاشی کہتے ہیں مجھے۔"

"کاشی۔۔۔" اس نے دلچسپی سے دہرایا۔ پاپا قریب گئے تھے۔ انہوں نے بغور اس لڑکے کو دیکھا۔ شاید خان بابا نے انہیں کاشی کے بارے میں بتا دیا تھا۔

"پاپا! یہ چور نہیں ہے۔ پیاسا تھا بے چارہ گیٹ سے باہر کھڑا تھا۔ میں نے ہی اسے روکا تھا۔" پاپا کے بولنے سے قبل ہی وہ بولنے لگی تھی۔ نواز اکرم ہنس پڑے تھے۔ "اوکے اوکے میں مان گیا۔ بھئی میری بیٹی جس کی گواہی دے، وہ برا کیسے ہو سکتا ہے۔"

نواز اکرم نے بڑے یقین اور محبت سے کہا تھا اور کاشی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ لیے اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

"وہ دن، وہ وقت، وہ لمحہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ اگر اس دن آپ چوکیدار مجھے چور بنا دیتا تو شاید آج میں اس وقت یہاں نہ ہوتا۔ بلکہ پولیس کے خوف سے بھاگ بھاگ کر شاید جیل میں ہی رہ رہا ہوتا۔ میری زندگی آپ کی اور آپ کے والد کی تاعمر احسان مند رہے گی۔" ماہین نے چونک کر اسے دیکھا۔

"حیرت ہے میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میری چھوٹی سی نیکی کسی پر اتنا بڑا احسان بھی ہو سکتی ہے۔" ماہین کے سامنے آج اس نے پہلی بار یہ انکشاف کیا تھا۔ اگرچہ وہ کبھی کبھار گھر آجاتا تھا۔ پاپا آفس نہیں گئے تو کسی فائل پر ان کے سائن کروانے آگیا۔ اور جو اس سے سامنا ہوا تو بے حد ادب اور احترام سے سلام کیا اور بس۔۔۔ مگر آج۔۔۔

"مجھے بہت دکھ ہوتا تھا، جب میرب بی بی اور بیگم صاحبہ دونوں آپ کو ڈانٹتی تھیں۔" وہ بتا رہا تھا۔ ماہین کو بڑے زور سے پن سی چبھی تھی۔ اس نے یکدم گہرا سانس لیا۔

"تو یہ بھی جانتا ہے۔"

اس نے آئینے میں دیکھا۔ کاشی اسے ہی دیکھ رہا تھا، اس کی بے حد سیاہ اور خوب صورت آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا، ماہین نے فوراً" نظریں جھکا لیں۔

"کتنی بولتی، کہتی، ہنستی آنکھیں ہیں کاشف کی۔" اس نے فوراً" دل میں اعتراف کیا۔

"آپ نے میری بات کا برا تو نہیں مانا؟" وہ اس کی سنجیدگی اور خاموشی سے نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"نہیں۔ سچ بات پر برا کیا ماننا۔" اس نے بے ساختہ ایک آہ بھری۔

"میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ بس یونہی وہ سب گزرا وقت یاد آگیا۔ آپ کی اور آپ کی دوست کی گفتگو سن کر احساس ہوا کہ وقت ابھی بھی آپ کے لیے نہیں بدلا۔ جو دکھ، غم اور محرومی بچپن سے آپ کو ملی تھی۔ وہی اب بھی مل رہی ہے۔ ازالہ تو ہوا ہی نہیں۔ کسی نے کیا ہی نہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور بہت کوشش کے باوجود بھی اس کے آنسو گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ یہ باتیں تو اس کے دل کی آواز تھیں۔ اس کے اندر کی محرومی تھیں اور ایسے زخم تھے جن پر کبھی بھی مرہم نہیں رکھا گیا تھا۔

"آپ رو رہی کیوں ہیں۔ آپ تو دوسروں کے آنسو پونچھتی ہیں۔ پھر آپ کے لیے رونا کیوں؟ وہ کہتا اللہ تعالیٰ آپ کو بہت خوشیاں دے گا۔ یہ میری دعا ہے میری پری کے لیے۔"

"مجھے بار بار پری مت کہو۔" وہ کراہی تھی۔

"کیوں نہ کہوں۔ آپ میرے لیے پری ہی تو ہیں۔ خوب صورت چہروں نے بڑے بدصورت دھوکے دیے ہیں۔ آپ کا دل جتنا خوب صورت ہے کس کا ہو گا۔"

"دل۔۔۔ یہاں دل کسے نظر آتا ہے۔ ظاہر کی پوجا کرنے والے ظاہری حسن کے دیوانے ہیں۔" اس کے دھیمے لہجے میں کانچ کی چبھن تھی۔ کاشف نے بغور اسے دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی، چہرے پر حزن و ملال کی سیاہی پھیلی تھی اور یہ کیفیت اس کے گہرے سیاہ چہرے کو مزید پرہیبت اور عجیب بدصورتی دے رہی تھی۔

کاشف نے فوراً" سامنے دیکھا تھا۔ گھر قریب آرہا تھا اور اسے آئندہ کے لیے ملاقات کی سبیل بھی کرنی تھی۔

"آپ دکھی نہ ہوا کریں۔ ہنستی رہا کریں۔ آپ ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔"

"میں ہنستی ہوں۔" اس نے اتنی حیرانی سے پوچھا۔ کہ پل بھر کو کاشف بھی ٹھٹک گیا تھا۔

"آپ ابھی اپنی سہیلی کے ساتھ جب ڈرائیورز کے بارے میں بات کر رہی تھیں تو ان کی بات پر ہنسی تھیں نا اور ایسی ہنسی میں نے برسوں بعد آپ کے چہرے پر دیکھی تھی، جس نے آپ کے چہرے کو جگمگا دیا تھا۔"

"شاید، شاید اب تو اپنی خوشی، اپنی مسکراہٹ بھی اجنبی لگتی ہے۔ بے یقین سی۔" وہ حد درجے احساس کمتری اور خود اذیتی کا شکار تھی۔ اس نے بریک لگائی۔ وہ اپنے شاپنگ بیگز سمیٹ رہی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں

عالیہ بخاری
دیوارِ شب

سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی اداست سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ زوبیہ جن معاملوں سے بے زار ہے وہ ان کی خوشی سے متعلق ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل ہونے والے تعلق پر بہت کچھ کہتے ہیں۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو سونے والے بچے پر ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی بیوی بھی شدید ذہنی اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان سمیت مولانے جویا اور زوبیہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

وفادار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جبکہ نگینہ آئے دن جیتی رہتی ہے۔ شماما ہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی جوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کراچی تک۔ تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود پرستی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکریٹری بدلنے کی عادت ہے۔ عائشہ سکریٹری میں سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جیسے ڈرائیور را کو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو بھانپ کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی جوڑیں اسے یاد کی زد سے... ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی بیٹی باتوں پر وہ بہر صورت اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر بھی اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی ڈگری کینسل اور کورٹ لوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے دوستوں سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔ سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاذ و نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آناً فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ اور جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے تو وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو اکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

نبیل، سالار پر قاتلانہ حملہ کرواتا ہے جس پر زرتاج بیگم جیسی عورت بھی دہل کر رہ جاتی ہیں۔ سالار کے قابل اعتماد ساتھی موقع پر جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ زرتاج بیگم معاملے کو دبانے کی سرتوڑ کوشش کرتی ہیں لیکن اس موقع پر یوسف کمال، بہن کے بجائے سالار کا ساتھ دے کر انہیں مزید پریشان کر دیتے ہیں۔ آنے والا وقت نبیل اور زرتاج بیگم کو کسی اچھی خبر کی نوید نہیں سنا رہا۔ یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کا دل اپنے شوہر سلمان سے ہٹ کر اب سالار کی طرف لگ چکا ہے۔

یوسف کمال اسے بتا دیتے ہیں کہ سالار رنگینی اور کو پسند کرتا ہے۔ صندل کو کامیابی تیزی سے عروج کی جانب لے جاتی ہے۔ بابا صاحب کی کوٹھی میں گیتی نینا بائی کے خاندان و زندگی کے نئے رخ سے آشنا کرواتی ہے۔ نانی ستارہ شماما کے ساتھ اپنے گھر میں رہنے کا فیصلہ کرتی ہیں تو نگینہ کے ساتھ ساتھ گیتی کو بھی دھچکا لگتا ہے۔ تاہم وہ گیتی سمیت سب کو مطمئن کر کے بھیج دیتی ہیں۔ سالار کی مستقل غیر موجودگی گیتی کے لیے پریشان کن ہے۔

صندل، انٹرویو میں خالہ فیروزہ کو بے اولاد بتاتی ہے تو خیام ایک لمحے کو ساکت رہ جاتا ہے۔ دربدری نے خیام کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخر کار ساجد ترس کھا کر اسے اپنے یہاں لے آتا ہے۔

جویا کا رشتہ ٹوٹنا اور اظہار صاحب کی گرفتاری پورے خاندان کا شیرازہ بکھیر ڈالتی ہے۔ تمام سہولیات اور گھر سے انہیں ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس موقع پر آپا گل اور سلمان کی توتا چشمی شاکرہ بیگم کو گم صم کر دیتی ہے۔ یہ خبریں معاذ اور اسلام صاحب کے خاندان تک بھی پہنچ رہی ہیں جس پر شائستہ بیگم (معاذ کی والدہ) کے سوا سب کو دکھ ہے۔ معاذ نواب کی موت کے بعد سعدہ کی بے گانگی پر زری کو گھر لے آتا ہے تو سب کا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ دادی اس پر کڑی نظر رکھتی ہیں، زری دل میں معاذ کے لیے خاص جذبات رکھتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳۹

انتالیسویں قسط

"یہ بڑی کوٹھی، نکاح کے ساتھ تیرے نام لکھیں گے، اوپر سے دو لاکھ مہینہ خرچے کا تو کر چاکر، راج کرے گی ساری زندگی!" نگینہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

گیتی نے اپنی رکتی ہوئی سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔

"وہی راج جو خالہ فیروزہ نے کیا، چار پانچ سال اور پھر اس کے عوض خوف تھوکتے ہوئے مر گئیں!"

"بدفال مت نکال منہ سے، فیروزہ کا کیا ذکر اس وقت۔" اس نے بڑی تیزی سے گیتی کے کانوں میں وہ بے حد خوب صورت ٹاپس ڈالے اور اس کے بال کھول کر برش کرنا شروع کیا۔ "فیروزہ نے تو اپنی من مانی کی تھی، اماں کی ایک فیصد مرضی نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی ___"

اس کے لہجے میں فیروزہ کے لیے دبا دبا سا غصہ اتنے سال بعد بھی ابھر آتا تھا۔

"ہمارے طبقے کی عورت کو نافرمانی راس نہیں آتی، لکھ کر رکھ لے یہ بات، جس نے بھی اپنی راہ بدلنے کی کوشش کی، منہ کے بل ہی گری ہے۔ بڑے دعووں سے لے کر جانے والے، ہاتھ بڑھا کر مٹی میں سے نہیں اٹھاتے، ٹھوکر مار کر مٹی میں مل جانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، ہمارے ہاں مضبوط وہی عورت ہے جس کے پیچھے ہم خود کھڑے ہوتے ہیں۔ سمجھی!"

وہ خالی خالی نگاہوں سے اس اجنبی لب و لہجے والی عورت کو دیکھے گئی۔

شاما کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا، چند منٹوں میں وہ اس کا آئی میک اپ مکمل کر چکی تھی۔

"ماشاءاللہ!"

"دیکھا کیسا روپ آیا ہے، میں نہ کہتی تھی باجی کہ اپنی گیتی لاکھوں میں ایک ہے، یہ تو یوں ہی اپنی قدر کھو رہی ہے، ورنہ صندل سے کم نہیں۔"

شاما نے بڑے فخریہ انداز میں نگینہ کی طرف دیکھا مگر اس کا چہرہ بے تاثر ہی تھا۔

"مقدر کی دعا کر شاما! ہمارے خاندان میں حسن کی نہیں نصیب کی کمی رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ ملک صاحب

کے دل میں ایسی اترے کہ ساری زندگی وہ اس کی طرف سے نگاہ نہ پھیر سکیں!"

"ایسا ہی ہوگا اللہ نے چاہا تو۔" شاما کی وفاداری میں کیا شک تھا۔

"اب کپڑے خود بدلوگی یا وہ بھی میں...." نادر ے کو وقت کے نگینہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کیتی کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا' سر پر کھڑی ہوئی وہ دونوں خواتین اس وقت جس موڈ میں تھیں ان سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔

وہ کپڑے بدل کر نکلی تو وہ دونوں بالکل مستعد کھڑی تھیں۔

"چلو!"

"امی پلیز! خدا کے لیے' نہیں کریں اس طرح' مجھے نہیں کرنی ہے شادی وادی' منع کردیں آپ انہیں!" سادہ لوحی کی حد تھی کہ وہ اب بھی نگینہ کی طرف پرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تو پھر اس منحوس خیام کا سوگ منائے گی ساری عمر بے وقوف! تیری سمجھ میں کیوں نہیں آرہا' دکھا اسے' سارے زمانے کو کہ تیری بھی کوئی پوزیشن' کوئی اہمیت ہے' چل اب دیر نہ کر۔"

کیتی کے بازو پر اس کے ہاتھ کا دباؤ اور بھی سخت ہوا اور وہ تقریباً" اسے کھینچتی ہوئی برآمدے میں آئی۔

کیتی نے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے نگینہ کو دیکھا' اس کے چہرے پر غضب کی تپش' اور انداز میں ویسی ہی سرد مہری۔

غضب کا تضاد جو دیکھنے والے کے دل پر سہم سا طاری کرتا تھا۔

کیتی نے دوسرے ہی لمحے نگاہ چرائی تھی۔

آج پہلی بار اسے اپنی ماں سے خوف آیا تھا اور آج پہلی بار اس نے اپنی ماں کی حقیقت کو بھی جانا تھا۔

کہاں سے مختلف تھی وہ!

نانی دلدار' خالہ گل ناز' نانی ستارہ' نگینہ امی۔ ایک خون' ایک برادری' ایک فطرت۔

وہ سترہ سال کی عمر میں الماس کی طرح نچائی جاتی یا پھر بائیس سال کی عمر میں کسی عیاش رئیس کے حوالے کی جاتی' بات ایک ہی تھی۔

صرف حالات اور مصلحت کا الٹ پھیر تھا اور کچھ بھی نہیں۔

ایک آخری کوشش کے طور پر اس بڑے سارے آرائشی ہال سے چند قدم پیچھے پر اس نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر نگینہ کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔

"آپ مجھ پر زبردستی نہیں کرسکتیں' اور نہ ہی...."

"بکواس نہیں کیتی.... اوقات میں رہ' چپ کر کے اندر چل' ابھی رخصت نہیں کررہے ہیں تجھے' صرف ایک نظر دیکھنا ہے ملک صاحب کو' آخر اتنا پیسہ خرچ کررہے ہیں تو اپنا اطمینان تو کریں گے نا!"

نگینہ کی زہر بھری سرگوشی کان کے بالکل قریب سنائی دی' کیتی کے قدم اور بھی بوجھل ہوئے' کیسی تسلی تھی۔

حقارت سے دیکھتی' ہنسی اڑاتی ہوئی۔

نانی ستارہ نے بہت فخر سے اندر آتی کیتی کی طرف دیکھا۔

"ماشاءاللہ!" ایک بھاری اجنبی آواز سے چھلکتا ہوا اشتیاق اس کی قسمت کا فی الفور فیصلہ سنا رہا تھا' شل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ مکمل طور پر نگینہ اور شاما کے سپرد تھی۔

"آداب کرو کیتی آرا!" نانی ستارہ نے کہا تھا یا نگینہ امی نے۔

"بہت شرمیلی ہے' لوگوں کے سامنے آنا بھی پسند نہیں کرتی' یہ تو آپ ہیں پہلے شخص..."

"میری خوش قسمتی ہے جو میں...."

"بی اے فرسٹ کلاس پاس...."

"تعلیم یافتہ عورت کی تو بات ہی کیا ہے' مجھے تو جب بالی صاحب نے بتایا کہ کیتی آرا ایم اے اردو ادب کررہی ہے تو...."

بہت کچھ بڑی تیزی سے خلط ملط ہوا تھا۔ وہ نانی ستارہ کے قریب بیٹھی ان جانی انجانی آوازوں کی گونج میں گھری تھی

"ایک ایک بات کتنی بار دہرائی جارہی تھی آخر! ماؤف ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس کے آخری بات شاید یہی ذہن میں آئی تھی۔

"کیتی' کیتی آرا!"

سب سے پہلے شاما اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھ کر اس کی طرف لپکی تھی۔

"ارے یہ تو گر رہی ہیں' کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ!" بند ہوتی آنکھوں سے کیتی نے ایک کرخت چہرے کو خود پر جھکتے ہوئے دیکھا۔

ایک اجنبی ہاتھ اس کے چہرے کو تھپک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر پر جیسے کسی دل فریب سے سحر کا سایہ ہوا تھا۔

ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ اور ہر کام وقت سے بھی کہیں پہلے سرانجام پا جاتا' صبح سویرے کی وہ روایتی سی دھماچوکڑی' ہڑبونگ اور بے وقوفیاں جو طاری رہتی تھی سرے سے غائب ہوچکی تھی۔

صبح کی چائے الگ الگ وقتوں پر کیا جانے والا ناشتہ۔ استری شدہ کپڑے' سب ہی کچھ ترتیب سے طے پاتا چلا جاتا۔

وہ ہر ایک کی سہولت اور پسند کا خیال رکھتی۔

کب سے وہ سب کی اتنی مزاج آشنا ہوئی؟

اگر اس کی یہاں آمد کے ہفتے گنے جاتے تو بھی انگلیوں کی پوروں پر با آسانی گنے جاسکتے تھے۔

دادی نے اس کے مہارت سے چلتے ہاتھوں کو تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"جیتی رہو زری! بہت آرام آگیا ہے' اب بس کرو بے!"

اتنی دیر میں شاید انہوں نے اسے چوتھی بار "بس" کرنے کو کہا تھا' مگر وہ "بس تھوڑی دیر اور" کہہ کر ان کے پیروں اور پنڈلیوں کی مالش کیے گئی اس کی انگلیوں میں بڑی پروفیشنل سی مہارت تھی۔ ان دنوں میں یہ تجربہ دادی کو بار بار ہو رہا تھا' دکھتے ہوئے پیروں کو راحت کا ایسا احساس ملتا کہ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتیں۔

زری کی خدمت کا دورانیہ یہیں ختم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کے سر میں ہلکا ہلکا تیل لگاتی اور پھر دھیرے دھیرے کتنی ہی دیر دباتی رہتی۔

وہ جو نیند کی گولی کھا کر بھی بے خوابی کا شکار رہتی تھیں۔ آج کل بڑے سکون سے سوتیں۔

"جادو ہے زونی کے ہاتھوں میں' میرے تو دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے۔" اپنی تمام تر سخت مزاجی کے باوجود وہ کسی کسی وقت بے ساختہ کہہ جاتیں تو زری کی آنکھوں میں آنسو آنے لگتے۔

اس کے لیے دعا کرنے والے لب کب کے خاموش ہوئے تھے۔ سعیدہ کے ساتھ گزری زندگی میں ساری خدمت اور محبت کے جواب میں سوائے پھٹکار اور طعنوں کے کچھ نہیں تھا۔

"تم بھی زری سے مالش کروالیا کرو' یہ سر کے درد سے بھی ان شاءاللہ نجات مل جائے گی اور نیند بھی اچھی

آنے لگے گی۔"

اس روز دادی نے امی کو بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

زری نیچے کارپٹ پر چادر بچھائے کل صبح کے لیے سب کے کپڑے استری کر رہی تھی' اپنی تعریف پر شرما کر مسکرا دی۔ امی نے جبراً" زری کو قبول کیا تھا اور مصلحتاً" اس کی خدمت گزاری کو لیکن اس کو سراہنا تو دور کی بات انہیں یہ قبول کرنے میں بھی تامل تھا کہ وہ گھر کے اور گھر والوں کے لیے کسی قسم کے سکون و آرام کا باعث بھی بن چکی ہے۔

ایک خاص قسم کی چڑ' جو پہلے دن سے تھی' سو تھی۔ اس وقت زری کا مسکرانا یوں ہی کوفت بڑھا جانے کا سبب بنا تھا۔

"میرا درد یوں ہی مالشوں سے ختم ہونے والا نہیں ہے اماں! ساری زندگی کی مشقت جھیلی یہ دماغ نے' آنکھوں نے' یہ تو اب ساتھ ہی جائے گا' یہ مالش تو خواہ مخواہ کا بہلاوا ہیں' کچھ نہیں ہوتا ان سے۔"

سچی بات تو یہ کہ انہوں نے خود کو خاصا کنٹرول بھی کیا تھا' مگر زری پر دادی کی مہربانیوں کا اعتماد چھایا تھا۔

"آپ کروا کر تو دیکھیں! آنٹی آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا' ساری محنت مشقت بھول جائیں گی' ہمارے پڑوس والی خالہ بتول تو دس گھروں کا کام کر کے آتی تھیں پھر اس کے بعد...."

کپڑے استری کرتے ہوئے وہ اپنی دھن میں بولے چلی گئی' یہ بھی نہیں دیکھا کہ شائستہ امی کے ماتھے پر بڑا ہی گہرا بل پڑ رہا ہے۔

"زیادہ مت بولا کر' جب ایک بات کو منع کر دیا تو کیوں بکواس کیے چلی جا رہی ہے' ہمیں نہیں چاہئیں تیری مہربانیاں' پتا نہیں کب تک کا بوجھ ہے ہمارے سر پر۔"

زری اپنی جگہ ہی تھمی رہ گئی۔

اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ پلٹ کر ان کی طرف ہی دیکھ سکے' زری سے تو خیر وہ اس سے کبھی بھی بات نہیں کرتی تھیں لیکن نظر انداز کیے رکھنے کی جو پالیسی انہوں نے اختیار کی تھی' وہ بھی خاصی نیت بھری تھی' اس وقت کوئی بری گھڑی ہی آئی تھی۔

"میں تو معاذ سے تنگ ہوں' چھوٹا تھا تو گلی کے بلی کتے سمیٹ کر گھر لاتا تھا' اب خیر سے ترقی کر لی ہے تو یتیموں مسکینوں کا درد جاگ اٹھا ہے' نہ جانے معلومات' اللہ معاف کرے...."

آخر میں جو کچھ کہا' وہ اتنا قابل اعتراض تھا کہ وہ خود ہی صرف بڑبڑا کر رہ گئیں۔

دادی نے بہت حیرت بھری ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ دوسری طرف متوجہ تھیں۔

سر کو کھڑکی کی طرف موڑے' باہر اگلے احاطے پر نگاہ جمائے ہوئے۔

"زری! میرے لیے ایک کپ چائے تو بنا کر لاؤ۔" بڑی معقولیت سے دادی نے پہلے اسے منظر میں سے غائب کرنا چاہا۔

وہ بڑی پھرتی سے اٹھی اور ایک لفظ بھی کہے بغیر باہر نکل گئی۔

"اس طرح ذلیل کرتے ہیں کسی کو؟" ان کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

امی نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"اگر یہ ذلیل کرنا ہے تب بھی مجھے اپنے کہے پر کوئی شرمندگی نہیں' بہت ہاتھ پیر نکال رہی ہے یہ لڑکی' مجھے اس کی دخل اندازی سے اب نفرت ہونے لگی ہے۔"

"کیا دخل دے رہی ہے وہ غریب' تمہارے سارے گھر کا کام اس نے اپنے سر لے لیا ہے' کھانے اور ایک

چھت کے عوض' اپنی ہمت سے بڑھ کر آرام دے رہی ہے غریب' پھر بھی تم خوش نہیں ہو۔"

"کس لیے کر رہی ہے وہ یہ سب کچھ؟"

وہ پوری طرح سے دادی کی طرف گھوم کر بیٹھیں۔

"کس نے کہا ہے کہ وہ یہاں سب کی خدمتیں کرے' کیا ہمیشہ سے ہمارے ہاں گھر کا کام نہیں ہوتا آ رہا تھا' آپ خود بتا دیں کہ دن رات سلائیاں کرنے کے باوجود بھی کبھی میں نے کسی کو شکایت کا موقع دیا اور اب تو کئی سال سے ربیعہ بھی یہی سب کچھ کر رہی ہے' ہمیں کسی کی خدمت کی کوئی ضرورت نہیں تھی' یہ لڑکی پوری پلاننگ کے ساتھ یہاں آئی ہے اماں...! مجھے معاذ کی طرف سے فکر ہے' جوان لڑکی کے ساتھ اتنی ہمدردی کیا معنی رکھتی ہے۔"

دادی کو ان کے بڑھے پورے پیراگراف سے کوئی اختلاف نہیں تھا' سوائے اس آخری بات کے۔

"میرا معاذ ایسا نہیں ہے!"

"کسی کو اپنے بچے غلط نہیں لگتے' مگر ایک وقت آنے پر سارے اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں' میں اس وقت کے پچھتاوے سے بچنا چاہتی ہوں اماں! یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے' بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔"

وہ اپنی بات پر اٹل تھیں' دادی نے بےزاری سے سر کو ملکے سے جھٹکا۔

بہت سال سے انہیں خود شبہ بلکہ یقین ہونے لگا تھا کہ شائستہ بذات خود کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہو چکی ہیں' ہر ایک کو شبے کی نگاہ سے دیکھنے کی عادی اور کسی پر بھی رتی بھر بھی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں جویا اور معاذ کا رشتہ ختم ہونے میں وہ تھوڑا بہت قصوروار انہیں بھی مانتی تھیں۔

"چالاک بھی ہے تو بےبس ہے بے چاری' بہرحال اتنا ضرور کہوں گی اگر کوئی بےبس' مجبور تمہارے دروازے پر آہی پڑا ہے تو اللہ کے واسطے اپنا دل بڑا رکھو' اللہ نے تمہیں نوازا ہے تو نرمی اور شکر گزاری اختیار کرو' غرور اور سختی کو تو رب نے بھی ناپسند فرمایا ہے۔" دادی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

امی قائل تو نہیں ہوئیں' لیکن چپ ضرور ہو گئیں۔

"اگر تمہیں اس سے کام کروانا اتنا ہی برا لگ رہا ہے تو میں اسے سختی سے منع کروں گی کہ وہ اپنے یا میرے لیے کچھ بنائے تو بنائے' ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے کسی بھی کام میں گھسنے کی۔"

ربیعہ نے اندر آتے ہوئے' دادی کا تازہ فیصلہ سنا اور تفصیل سنتے ہی بےدم سی ہو کر دادی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ بھی نا بس امی! کتنا آرام دیا ہوا ہے بے چاری نے' مجھے بھی پڑھنے کے لیے ٹائم ملا ہوا ہے' ورنہ کہاں ہوتی ہے یہ ڈبل ڈیوٹی اور یہ زری بے چاری تو بہت ہی مسکین سی لڑکی ہے' اس کو تو نکالنے کا سوچیے گا بھی نہیں' جب تک ہے غنیمت ہے۔"

یہاں سب کے سب ہی ہم نوا تھے۔

امی جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بےفکر رہو' وہ یہاں ساری عمر قیام کے ارادے سے آئی ہے۔ پہلے کھلا پلا کر تمہاری عقلیں تو خبط کر لے' اس کے بعد پوچھوں گی۔"

بنا کسی کا بھی جواب سنے وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

ربیعہ نے تاسف سے دادی کی طرف دیکھا۔

"بہت بری طرح برسی ہے شائستہ۔ بے چاری لڑکی تو اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔"

"میں معذرت کرلوں گی دادی! اب اور کیا کیا جاسکتا ہے۔" ربیعہ نے آہستہ سے کہا۔
تب ہی وہ انہیں دوبارہ آتی دکھائی دی ٹرے میں چائے کے کپ رکھے وہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ منہ پر زیادہ ڈالے پانی کے اثرات نمایاں تھے۔
"معلوم نہیں کتنے آنسو اور کتنا پانی...!"
ربیعہ نے دکھی ہو کر سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

چند جوڑے کپڑے' اکا دکا کوئی ضرورت کی چیز اور وہ دونوں سونے کی چوڑیاں۔
خیام کو ہمیشہ بیگ پر اسپیشل لاک لگانے پر مجبور رکھتی تھیں۔
ساجد کے ابا کو وہی لاک سب سے زیادہ بے قرار کیے ہوئے تھا "کیا ہے آخر اس بیگ میں جو کبھی تالا کھلتا ہی نہیں۔" کتنی ہی بار وہ یہ جملہ دہراتا' مگر نہ ساجد توجہ دیتا اور نہ بتول۔
"کون سی خاص بات ہے اس میں۔ بیگ' سوٹ کیس ہوتے ہی بند رکھنے کے لیے ہیں' خیام بھائی کے لیے کپڑے وغیرہ ہوں گے اور کیا ہے۔ ابا کو تو چڑ ہو گئی ہے خیام بھائی سے' ان کی ہر بات پر اعتراض کرنا فرض ہے ان پر۔"
ساجد جھنجلایا ہوا تھا۔
رات اس کے ابا نے' جب وہ دونوں گھر پر نہیں تھے' خیام کے بیگ کا تالا توڑنے کی کوشش کی تھی' یہ بات اسے بتول نے بتائی تھی۔
"کیا سوچیں گے خیام بھائی ہمارے بارے میں اماں! ابا کو کہیں بھجوا نہیں سکتیں کچھ عرصے کے لیے۔"
پریشانی میں بھی بتول اس کی فرمائش پر ہنس پڑی تھی۔
"تم کہہ کر دیکھو' وہ ہم دونوں ہی کو گھر سے باہر کھڑا کر دے گا۔"
"ایسے ہی کر دے گا' سال سے اوپر ہو گیا ہے' ایک پائی نہیں کما رہا ہے ابا اور اس سے پہلے بھی تم ہی کام کرتی تھی نا اماں! یہ کون سی پروا کرتے تھے کہ ہم نے آج دن میں روٹی بھی کھائی ہے یا نہیں' تم ہی سارا دن محنت کرتیں اور شام میں ان سے پٹا کرتیں' بھولا نہیں ہوں میں کچھ بھی' نفرت ہے مجھے اس آدمی کی شکل سے بھی۔" چھت پر سے نیچے آتے خیام نے اسے کہتے سنا تھا۔
کتنی عجیب بات ہے کہ ساجد اس باپ سے نفرت کرتا ہے' جس نے اسے شناخت دی' گھر دیا' ساری عمر اس کی ماں کے ساتھ گزاری' بے شک پیسہ تھوڑا کم کمایا' لیکن اپنے نام کا فخر تو بہرحال دیا نا!
اسے ساجد سخت ناشکرا لگا تھا۔
لیکن بہرحال یہ ان کا قطعی ذاتی معاملہ تھا۔ وہ نیچے صحن میں آ کھڑا ہوا۔
"خالہ میں باہر جا رہا ہوں' یہ آپ رکھ لیں۔" اس نے وہی بیگ بتول کی جانب بڑھایا' جس کی حفاظت سے وہ اب خائف رہنے لگی تھی۔
"بیٹا! یہ بیگ... دیکھو' سارا وقت گھر کھلا پڑا رہتا ہے' جس کا دل چاہتا ہے' کبھی اندر کبھی باہر' تمہاری کوئی قیمتی چیز کھو گئی تو میں تو بھر بھی نہیں سکتی۔"
بتول بڑی عاجزی سے کہہ رہی تھی۔
"ارے نہیں اماں! خیام بھائی کوئی خزانہ لے کر تھوڑی گھوم رہے ہیں اس میں' جو چوری ہو جائے گا' تم تو یوں

ہی پریشان ہو جاتی ہو، رکھ دو کہیں بھی، کیوں خیام بھائی!"
ساجد نے پراعتماد سی مسکراہٹ کے ساتھ خیام کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدلی تھی۔
"میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا خالہ! اس بیگ میں واقعی بڑی قیمتی چیز ہے، خدا نہ کرے اگر کھو گئی تو میں اور آپ تو کیا کوئی بھی اس نقصان کو پورا نہیں کر سکے گا، ایسے ہی تو میں اس کو ساتھ لیے لیے نہیں پھر رہا ہوں۔"
وہ دھیمے مگر صاف الفاظ میں، حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ساجد اور بتول دونوں ہی نے چونک کر خیام کی طرف دیکھا تھا۔
"ایسا کیا ہے بیٹا!" بتول کی زبان لڑکھڑائی۔
"کوئی بہت قیمتی چیز ہے خیام بھائی، ہیرے، جواہرات۔" ساجد نے اپنے طور پر سب سے بیش قیمت چیزوں کا اندازہ لگایا۔
"شاید اس سے بھی زیادہ مالیت کی چیز ہے، میں نے کہا نا اس کا نقصان کوئی پورا نہیں کر سکتا!" وہ کہیں دور کھویا تھا۔
ساجد نے غور سے خیام کے چہرے کو دیکھا۔
"شاید خیام بھائی، کچھ زیادہ ہی وہمی ہو گئے ہیں، اتنے عرصے سے بالکل اکیلے رہتے ہیں، آخر ذہن پر اثر تو پڑتا ہی ہے۔" اس نے بڑی گہری ہمدردی خیام سے محسوس کی تھی۔
"چلیں اچھا جو بھی ہے، اماں کے پاس رکھوا دیں، پھر ہم اس کے لیے کوئی اور جگہ محفوظ سی دیکھیں گے۔" دو عمر سے ساجد کے لہجے میں بزرگوں جیسی شفقت چھلکی، بالکل ایسے جیسے اس نے کسی بچے کو بہلایا تھا۔
مگر بتول خوف زدہ تھی۔
"میں نہیں رکھ سکتی بیٹا! اتنی بڑی ذمہ داری کیسے لے سکتی ہوں، تم یہ اپنے ساتھ ہی لے جایا کرو، اتنا بڑا بھی نہیں ہے، اس سے بڑے بیگ تو بچے اسکول لے کر جاتے ہیں آج کل!"
وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ ہاتھ لگانے کو بھی تیار نہیں تھی۔
"ہم جگہ جگہ کیسے اٹھائے پھریں گے اماں! تم بھی کمال کرتی ہو، چند گھنٹوں کی تو بات ہے ہم ابھی آ رہے ہیں کام سے واپس، پھر تمہاری ڈیوٹی ختم!"
ساجد کو ماں کے رویّے پر جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ مگر بتول اب ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھی۔
"میری توبہ، اگر مجھے پتا ہوتا کہ ایسا کچھ ہے تو میں تو ایک دن کے لیے بھی نہیں رکھتی، نہ بیٹا نہ پرائی امانت سے بڑا کوئی اور بوجھ نہیں اور وہ بھی جب مالک خود دیتا رہا ہے کہ... مجھے معاف کر، میری ہمت سے باہر ہے یہ سب۔"
وہ قطعی الغرض ہوئی۔
اس وقت تو اس کو ساجد کا ابا بھی تھوڑا تھوڑا حق بجانب لگنے لگا تھا، جو خیام کے یہاں رکنے پر سخت معترض تھا۔
شکل لاکھ اچھی سہی، مگر حلیہ سے آوارہ گرد دکھنے والے اس لڑکے کے پاس اتنا مال آیا تو کہاں سے، میں بھی ساجد کی محبت میں آنکھیں بند کیے اعتبار کر کے بیٹھ گئی، کچھ بھی سہی ہے تو بچہ ہی"
وہ سخت سٹ پٹائی تھی، اور خیام چند منٹوں میں اتنا مشکوک نظر آنے لگا تھا کہ فی الوقت تو اس کا ساجد کے ساتھ باہر جانا بھی کھل رہا تھا۔
"آج کام کو چھوڑو، پہلے اس کا کوئی بندوبست کرو۔" بین السطور، اس کا مطلب، صرف بیگ ہی نہیں خیام بھی تھا، "تیرے ابا کو بھنک بھی پڑ گئی تو پتہ نہیں کیا کرے گا۔"
اس نے اس بار کوئی پردہ داری بھی ضروری نہیں سمجھی۔
"ابا کا ڈر اور امت دوامی! سب پتہ ہے وہ کیا کریں گے۔" ساجد نے بے زاری سے ہاتھ ہلایا۔
ذرا سی بات کا بتنگڑ۔
"اور اصل میں تو یہ خیام بھائی ہی بے وقوف آدمی ہیں، مگر کیا کروں، سنبھالنا تو مجھے ہی ہے۔"
صحن میں کھڑے تینوں افراد میں اس نے خود کو ہی سب سے بڑا اور معتبر تصور کیا۔
"یہ بیگ ابھی یہاں رکھا ہے، کہیں نہیں جا رہا۔" اس نے برآمدے کی الماری پر وہ چھوٹا سا بیگ بے فکری سے ڈالا اور خیام کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔
بتول آوازیں دیتی ہوئی پیچھے تک آئی۔
"آج آ کر کریں گے اس کا بھی مسئلہ حل۔ اماں! ابھی جانے دو، کام کو دیر ہو رہی ہے۔"
بنا مڑ کر دیکھے اس نے زور سے کہا اور خیام کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔
بتول کو ناچار اندر آنا پڑا۔
آج پہلی بار اس نے اندر آتے ہی سب سے پہلے کنڈی لگائی اور برآمدے میں چلی آئی۔
چھوٹا سا بیگ الماری کے اوپر رکھا تھا اور صحن، برآمدے میں کھڑے ہونے والے کسی بھی شخص کو پہلی نظر میں ہی دکھائی دیتا تھا۔
سو سب سے پہلی فکر اسے چھپانے کی ہی لاحق ہوئی۔

☼ ☼ ☼

اس کے رخسار پر کسی جلتے انگارے کی موجودگی کا تکلیف دہ احساس تھا۔
ادھ کھلی آنکھوں کے ساتھ گیتی آرا کا ہاتھ اپنے چہرے کو بار بار چھو رہا تھا۔
"کچھ نہیں ہے بیٹا! وہم ہے تمہارا! میں نے کتنی بار عرق گلاب لگایا ہے، جلن کم نہیں ہو رہی کیا۔"
نانی ستارہ مستقل اس کے سرہانے بیٹھی تھیں، ایک بار پھر اس کے رخسار پر عرق گلاب میں بھیگی ٹھنڈی مہکتی ہوئی روئی کا پھایا پھیرنے لگیں۔
ٹھنڈک کا یہ معطر احساس بھی اس کے لیے سکون کا باعث نہ بن سکا۔
"نہیں لگائیں اور جلن ہو رہی ہے۔" اس نے نانی کا ہاتھ پرے کیا اور آنکھیں دوبارہ بند کیں تو ایک بار پھر کتنے ہی رکے آنسو چہرے پر پھسلتے چلے گئے۔
نانی ستارہ نے تشویش سے گیتی آرا کو دیکھا۔
آج تیسرا دن تھا اسے بستر پکڑے ہوئے، ڈاکٹر ابھی دیکھ کر گیا تھا، کچھ دوائیں تبدیل کی تھیں۔
"شدید ذہنی صدمہ!" اس نے بلا تامل تشخیص کیا تھا۔
وہ یہاں کا پرانا معالج تھا اور اس طرح کے ذہنی جھٹکے اور ان کی وجوہات کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔
مگر یہ مریضہ کچھ زیادہ حساس تھی۔
"کوشش کریں کہ ماحول بدل دیں، اچھا ہو گا کہ کچھ عرصے کے لیے کہیں چلی جائیں، کسی بھی اچھے پرفضا مقام پر۔"
نگینہ کو یہ مشورہ زیادہ پسند آیا۔

"ملک صاحب سے نکاح پڑھوا کر رخصت کریں اماں! وہ خود ہی سنبھال لیں گے' ماریشس' ملائیشیا اور کیا کہتے ہیں وہ سوئیزرلینڈ' ان کے لیے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ دیکھیے گا کتنی جلدی بہل جائے گی' پیسے میں بڑی طاقت ہے' یہ سارا رونا دھونا پہلے کا ہی ہوتا ہے۔"

"اور اگر وہ نہ بہلی پھر نگینہ؟"

نانی کو بہت سے برے امکانات نے گھیر اتھا۔

"اپنی بدنصیبی پر روئے گی ساری عمر' ملک صاحب جیسا رشتہ پوری برادری میں کسی لڑکی کو نہیں ملا ہے' بالی صاحب جیسا پروڈیوسر آگے پیچھے پھر رہا ہے ملک کے۔ اس کو ناراض کرنے کا مطلب تو آپ بھی سمجھتی ہیں نا' صندل کا کیریر بھی ختم ہو جائے گا ابھی سے۔"

نگینہ کی زندگی ان تجربات کا نچوڑ تھی' جو خالصتاً" اس کے اپنے تھے' بدترین حالات میں کیے جانے والے سمجھوتے' مصلحتیں۔

کسی کسی وقت تو نانی کو خود سے زیادہ نگینہ کی دانش پر بھروسا ہونے لگتا تھا۔

وہ دنیا کو ان سب سے زیادہ دیکھے اور برتے ہوئے تھی۔

"یہ جو اللہ اللہ کر کے کچھ اچھا وقت آیا ہے' بیس' پچیس سال بعد اس کو ایک گیتی کی بے وقوفی کی نذر نہیں کیا جا سکتا اماں!"

وہ دونوں مسہری سے اٹھ کر قدرے فاصلے پر آکر صوفے پر بیٹھی تھیں۔

گیتی دواؤں کے زیر اثر تھی' بار بار غنودگی میں مبتلا ہو رہی تھی۔

"وہ تو ہے' بس گیتی کا خیال آرہا ہے' اس کے لیے آسان نہیں ہے ملک کو قبول کرنا' وہ اور طرح اور مزاج کی لڑکی ہے' پھر ہم نے اس کی تربیت پر بھی دھیان نہیں دیا' چھوڑ رکھا اسے اس کے حال پر' پھر بھی تو بڑی نہیں ہوئی' نہیں تو وہ شاید کچھ مختلف ہی ہو جاتی' نہ پاؤں میں تھرکن رہی نہ مرتال کی خبر ہوئی اسے' پاس پڑوس میں کوئی سہیلی تک تو بنی نہیں اس کی۔"

تھکے تھکے سے انداز میں نانی ستارہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"خیر محلے' پڑوس میں تو کوئی ایک اس قابل بھی نہیں تھی اماں! باہر سے دیکھنے والوں کو شاید یہاں سارا کا سارا ہی ماحول خراب دکھائی دیتا ہو گا' مگر یہاں بھی درجہ درجہ جو فرق ہے' وہ تو رہنے والے ہی جانتے ہیں۔"

فرصت اور معاشی بے فکری' نگینہ کو بھی صاحب الرائے بنا رہی تھی۔

نانی کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پل بھر کے لیے ابھری اور غائب بھی ہوئی۔

"اصل میں تو ہم اس خیام کے آسرے پر گیتی کی طرف سے بے فکر تھے اماں! سوچا گھر کا لڑکا ہے اور کچھ نہیں کرے گا تو چلو ایک لڑکی ہی ٹھکانے لگے گی' کچھ تو کما کر کھلا ہی دے گا' باہر سے کون سی بارات سج کر آنے والی تھی یہاں! مگر اس نے تو ایسی آنکھیں بدلیں کہ بات چھوڑ دو۔" آج بھی جب خیام کو کچھ کہا جاتا تو نانی ستارہ کو ایسا ہی لگتا جیسے ان پر ہی فرد جرم عائد کی جا رہی ہو' جو کچھ بھی ہوا' ان ہی کا قصور تھا۔

گیتی اور خیام ...... خیام اور گیتی۔

ایک بہت پروفیشنل زمانہ ساز فنکارہ ہو کر بھی انہوں نے کسی گھریلو عورت کی طرح جو ایک تمنا پالی تو وہ ان ہی دو کے ہمیشہ ساتھ کی تھی۔ خیام کے بگڑے ہوئے تیور خائف بھی کرتے تب بھی۔

اس کا اس سارے ماحول اور ان سارے رشتوں سے کھلا نفرت کا اظہار۔ دل دکھاتا تب بھی۔

وہ خود غرض ہو گئی تھیں' تب ہی اس کے پاؤں میں گیتی آرا نام کی زنجیر ڈالنے چلی تھیں۔

بھول آنگن نہ ہو' کسی کے دکھ رکی ہے' اور نہ بہتا دریا پانی ہی ساکن ہو پایا ہے۔

"بس کھو سکیں' پھر اسی نمک حرام کی یاد میں۔"

نگینہ کی آواز میں خیام کے ذکر کے ساتھ ہی تلخی اتری تھی' اس وقت انہیں گم صم دیکھ کر اور بھی بڑھی۔

نانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی نہیں کھوئی ووئی۔ گئے ہوئے کو کب تک یاد کروں گی اور وہ بھی جس کے آنے کی امید بھی نہیں" کارپٹ پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی شاما نے بہت دکھ سے نانی ستارہ کو دیکھا۔

"بس میں ہوتا تو کان سے پکڑ کر لاتی خیام بھائی کو اور نانی کے قدموں میں ڈالتی۔ بڑا ظلم کیا تم نے۔"

نانی ستارہ خود کو سنبھال کر نگینہ کی طرف متوجہ تھیں۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے گیتی کے بارے میں۔"

"فیصلہ تو آپ کا ہے اماں!"

"تم ماں ہو' حق تو تمہارا ہی ہے' جو حالات ہیں اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی ملک میں' صرف گیتی کا ردعمل خوف زدہ کر رہا ہے۔ اگر برداشت نہ کر سکی تو انجام ڈراتا ہے۔"

"بے کار کے چونچلے ہمارے خاندان کو راس نہیں آتے اماں! نیچے کی دکان پر ہارمونیم ٹھیک کرتے ہوئے فیض علی کو بلا کر نکاح پڑھوا دیا تھا آپ نے' ایک بار جو کوئی سوال بھی پوچھا ہو' چپ کر کے سائن کیے تھے نکاح نامے پر' کیا تحفظ تھا اماں اس رشتے میں۔ ان دو لڑکیوں کی ذمہ داری اور چکی کی مشقت چھوڑ کر مر گیا تھا چند سالوں میں ہی۔ مقدر کا لکھا سمجھ کر بھی قبول کیا تھا' تو پھر یہ کیوں نہیں؟"

نگینہ کی بڑی بڑی نیلے آئی شیڈ سے پینٹ ہوئی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں' اپنے آنسوؤں کو وہ پوری کوشش کر کے روکنے کی کوشش ہمیشہ کرتی تھی۔ جب کامیاب ہو بھی جاتی اور کبھی نہیں بھی۔

"تجھ جیسا صبر اور ہمت میرے فرشتے میں اور کس کا ہے' نگینہ! مجھے تجھ پر فخر ہے بیٹا!" نانی کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"ارے کیسی ہمت اور صبر اماں! سر پر پڑتی ہے تو سب ہی کر لیتے ہیں' میں نے کون سا کارنامہ کر دیا۔" کیسی درد بھری ہنسی تھی۔

"اور گیتی کے لیے تو اس سے اچھا رشتہ ملنا مشکل ہے' اسے عزت کی زندگی مل جائے گی' ہمیں بڑھاپے کا تحفظ اور صندل کو اگلی فلموں کا فنانسر' بالی کا بہت اصرار ہے اس رشتے پر' رات بھی اس کا فون آیا تھا' خاص طور پر یہی بات کرنے کے لیے۔"

نانی ستارہ نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کب آرہے ہیں' وہ اور صندل شوٹنگ سے۔"

"دو روز بعد۔"

"ٹھیک ہے' پھر اگلا جمعہ رکھ لیتے ہیں نکاح کا' بس دعا کرو' گیتی کو بھی صبر آجائے۔"

فیصلہ سناتے ہوئے بھی ہلکی سی بے اطمینانی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

نگینہ کے اصول قاعدوں میں اب کسی کمزوری کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

"شکر گزار رہے گی ساری عمر' صندل سے زیادہ شان سے زندگی گزارے گی اماں! ملک صاحب جدی پشتی رئیس ہیں' ایسے لوگوں کی سخاوت اور طور طریقے آج کل کے نو دولتیوں جیسے نہیں ہوتے' ان کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے' ہماری خوش قسمتی ہے کہ ...."

تگینہ کے چہرے پر خوشی کی ویسی ہی روشنی پھیل رہی تھی جیسی صندل کو پالی صاحب ــــ کی فلم کا چانس ملنے پر پھیلی تھی۔
"شاما! لاکر منہ تو میٹھا کرا اماں کا۔"
"وہ بھی لائی باجی!"
شامانے بڑی محبت سے تگینہ کو دیکھا اور مستعدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
باہر برآمدے میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔
"ذرا پہلے دیکھ لے کون ہے' کام کا آدمی ہو تو بات کرا' ورنہ ٹال دے۔" وہ کمرے سے نکل رہی تھی' تو اسے اپنے پیچھے تگینہ کی آواز سنائی دی۔
شاما کو ایسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی' اسے اچھی طرح پتا تھا کہ کیا کرنا ہے' کیا نہیں۔
نانی کے کمرے کا فون آج کل ڈیڈ ہو رہا تھا' سو یہاں پچھلے برآمدے میں رکھے سیٹ سے ہی کام چل رہا تھا۔ زیادہ تر ہر ایک اپنا اپنا سیل فون استعمال کرتا تھا' خود شاما اپنے کانٹیکٹس کے لیے موبائل ہی استعمال کرتی تھی۔
برآمدے کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے فون کئی بار بج چکا تھا۔
"ہیلو۔"
اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے اتنا ہی کہا' دوسری طرف کسی کو اس کی آواز پہچاننے میں دقت کا سامنا تھا۔
"ہیلو' کون' کون بول رہا ہے؟" لہجے کی بے تابی' بڑی ہی معنی خیز تھی۔
"کون تھا یہ؟" شامانے ذہن پر زور ڈالا۔
فطرت اور تربیت اسے دونوں ہی ذہنی طور پر بے حد چوکس رکھتے تھے' ہر گھڑی' ہر لمحہ۔
"ہیلو' ہیلو' دیکھیں۔ مجھے نانی ستارہ سے بات کرنی ہے۔" شامانے ایک گہرا سانس لیا۔
کیسے بے وقت یہ کال آئی تھی۔
وہ سارا الجھاوا جو سلجھنے کو تھا' پھر سے الجھ جاتا تھا' اس کی فطری وفاداری نے سانس تک روکنے پر مجبور کیا۔
"دیکھیں' نانی سے جا کر کہیں' میں سالار بول رہا ہوں' پلیز میری ان سے بات کرا دیجیے بہت ضروری ہے۔"
شبہ تو اسے پہلے بھی نہیں تھا' اب یقین اور بھی گہرا ہوا' شامانے دھیرے سے فون کے پیچھے لگا تار کھینچ کر نکالا۔
"کس کا فون تھا شاما!" تگینہ کمرے کے دروازے میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔
"کوئی نہیں باجی! رانگ نمبر تھا۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔
"جو کچھ اس نے کیا' وہ ہی ٹھیک تھا۔"
اسے پورا یقین تھا۔

☼ ☼ ☼

سالار نے حیرت سے ہاتھ میں تھمے ریسیور کو دیکھا۔ کون تھا' جس نے اس کی بات سننی بھی گوارا نہیں کی' گیتی تو ہرگز بھی نہیں۔
اور اس کی ایک ہیلو کیا وہ صرف موجودگی بھی کیسے نہیں پہچان پاتا۔
"کوئی نئی لڑکی ہوگی شاید..." اس نے اندازہ لگانا چاہا۔
صندل کی کامیابی کا باب اس کے سامنے ہی کھلا تھا' بلکہ کسی حد تک وہ خود اس جرم میں شریک تھا۔ گیتی تو

باقاعدہ خفا تھی۔ وہ یاد کر کے ہلکا سا مسکرا دیا۔ لیکن دل پر آیا بوجھ ویسا کا ویسا ہی تھا' وہ کرسی کی پشت پر زور دے کر وہیں قریب بیٹھا' ایک بار' دوبار' تین بار۔
کتنی ہی بار اس نے فون ملایا' مگر اب دوسری طرف ویسی ہی خاموشی تھی' جو کتنی ہی بار پہلے موصول ہوئی تھی' یہاں اب کون ہو سکتا ہے۔
"کیا خبر وہ سب لوگ صندل کے گھر ہی شفٹ ہو گئے ہوں۔" اسے بڑی حد تک اب ایسا ہی لگنے لگا تھا۔ مہینوں سے نہ کوئی اطلاع' نہ خبر۔
گیتی اپنے پاس موبائل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی تھی اور گھر کا فون۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔
پتا نہیں وہ بھی اسے کبھی یاد کرتی ہوگی کہ بھول بھال چکی ہوگی' کتنے مہینے گزر گئے آخر...
کاش! وہ خونی صبح زندگی میں آتی ہی نہیں' جس نے حمیدی صاحب جیسے پیارے انسان کو موت سے ہمکنار کیا اور خود وہ مہینوں حرکت کرنے کے بھی قابل نہ رہا' اسی شام کی فلائٹ سے اس کی واپسی کنفرم ہوئی تھی۔
خیام کی تلاش اور اس کا جواب لینے کی جستجو اسے یہاں لے کر آئی تھی' ورنہ وہ کب آنے والا تھا یہاں۔
"صرف دو یا تین ہفتے بس!" اس نے خود اپنے آپ کو تسلی دی تھی آتے ہوئے' مگر یہاں جیسے وہ سب منتظر تھا' جس کی نہ توقع' نہ خواہش۔
زندگی سے زیادہ حیران کن کچھ اور نہیں۔
اور انسان سے بڑھ کر بے بس اور مجبور۔
سالار نے انگلیوں سے پیشانی کو مسلتے ہوئے خود کو کمپوزڈ رکھنا چاہا۔
کئی دن سے وسوسے پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے' یا شاید اتنے دن بستر پر گزار کر وہ اندر سے کمزور پڑ رہا تھا۔
اگر وہ نہیں کر سکا تو وہاں سے بھی کسی نے اس کی خبر لینے کی ضرورت کب سمجھی تھی' اس پر ہونے قاتلانہ حملے کی خبر' وہ دن تک تو ٹی وی پر بھی دکھائی دی گئی' پھر بھی کسی نے خیریت کا فون تک نہ کیا یا شاید کیا ہو؟
گیتی کے لیے بل ٹین بڑی رعایت تھی سوائے مورد الزام ٹھہرانا بھی ناممکن ہوتا تھا' نمبھانا اس کا فرض بنتا تھا' گیتی کا نہیں۔
"افسر بھائی!" اس نے سیل فون پر افسر کا نمبر ملا رکھا تھا۔
"کیا ہوا' آپ نے صندل کے گھر پتا کیا؟"
"ہاں سالار! وہاں کوئی نہیں ہے' شوٹنگ پر باہر گئے ہوئے ہیں۔ صرف ملازم ہیں' گھر پر اور وہ بھی سارے نئے۔"
"وہاں گھر کا فون بھی شاید ڈیڈ ہو گیا ہے' نانی ستارہ سے کوئی رابطہ..."
"نہیں' جب سے کراچی آیا ہوں' کوئی رابطہ نہیں' دیکھو کوشش کر کے کہیں سے نمبر حاصل کرتا ہوں' اصل میں وہ آج کل کچھ ریکارڈ وغیرہ بھی نہیں کروا رہیں' تو کسی سے بھی کانٹیکٹ ہی نہیں ہے' صندل اتنا اونچا اڑ رہی ہے کہ اسے اب ہم جیسوں سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ہوگی' سب وقت کا کھیل ہے بھیا! کیا خبر گھر کا فون جان بوجھ کر ہی بند کر دیا ہوا۔"
اپنی بات کہہ کر اس نے حسب عادت زور کا قہقہہ لگایا۔
سالار سے جواباً ہنسا بھی نہیں گیا۔ افسر بھائی کی بات مذاق نہیں تھی۔
اس نے خود کسی کو دوسری طرف سے ہیلو کہتے سنا اور پھر فون کو ڈسکنکٹ کرتے ہوئے بھی وہ بھی اس وقت جب وہ اپنا نام اور تعارف دے چکا تھا۔ افسر بھائی کا فون بند کر کے بھی' وہ وہیں بیٹھا رہا' اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا

تھا۔

بات تلخ تھی۔
یقین کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔
مگر سچ یہ ہی تھا۔
سالار نے اضطراب سے پہلو بدلا۔
کوئی تھا جو اسے دور رکھنا چاہتا تھا۔
نانی ستارہ کے گھر سے بلکہ گیتی سے۔
اس کا پہلا خیال خیام کی طرف ہی گیا۔ کیا خبر وہ واپس چلا گیا ہو۔
گو وہ خود سخت ترین الفاظ میں اس کا انکار سن چکا تھا، پھر بھی اور بہت سارے ناممکنات کے ممکن ہو جانے کی طرح، یہ بھی کوئی ایسی ناممکن بات نہیں تھی۔
زندگی میں بہت کچھ اپنے اصل کی طرف پلٹتا ہے۔ اس نے گیتی کی خوشی میں خوش ہونا چاہا۔
مگر.....
"دھت!" اپنے فراخ دل ہونے کے بارے میں اس کی ساری خوش فہمی نے اس ایک مقام پر اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اس کے پُر آسائش یخ بستہ بیڈ روم میں گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تھا۔
بڑی ہمت کر کے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاؤنج میں آیا۔ یہاں سناٹا پڑا تھا۔ زرتاج اور نبیل آج کل اسے کم کم ہی نظر آتے تھے۔ زرتاج اسے اپنے ساتھ صبح آفس لے جا رہی تھیں۔ ایک طرح سے اس طرح وہ اس کا اور سالار کا سامنا ہونے کا امکان ختم کرتی تھیں۔
تب ہی اس نے یوسف کمال کی گاڑی اندر آتے ہوئے دیکھی، بڑے سے گیٹ اندر لا کر وہ گاڑی کو لاؤنج کی کھڑکی کے نیچے کھڑی کر رہے تھے۔ سالار نے تھکے تھکے سے انداز میں ان کو دیکھا تھا، اس وقت کسی کو بھی اٹینڈ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔
یہاں آج اپنے سود و زیاں کا گوشوارہ توجہ طلب تھا۔
"سالار!" وہ بڑے پُر جوش انداز میں اندر آئے تھے۔ ان مروتاً ہی سہی ان کی بات پر دھیان دینا پڑا۔
"میں نے آج پتا کر لیا ہے، روزی کی گمشدگی کی رپورٹ باقاعدہ طور پر درج ہی نہیں کرائی گئی، پولیس کے ریکارڈ میں کوئی اندراج نہیں ہے اس کا۔ نبیل نے خوامخواہ کا ڈرامہ رچایا تھا، محض یہاں سب کو مطمئن کرنے کے لیے۔ دیکھا تم نے، میرا شک ٹھیک ہی نکلا۔ اب ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا اس سلسلے میں۔"
ان کے پاس بہت ساری معلومات تھیں۔
سالار نے انہیں ایک بار بھی بیچ میں نہیں ٹوکا۔ روزی کی گمشدگی، عظمت بوا کی روانگی، راجو کی نیم دیوانگی۔ سب کے سرے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے تھے۔
"پھر اب آگے کیا کرنا ہے، میرا خیال ہے سب سے پہلے ایف آئی آر کٹوائی جائے باقاعدہ طور پر۔ تم تو ابھی پولیس اسٹیشن جانے کے قابل نہیں ہو، میرا خیال ہے کہ میں....."
"میں لاہور جانا چاہتا ہوں پہلے، آپ میری کل کی بکنگ کروا دیں پلیز۔"
اس نے شاید ان کی بات سنی بھی نہیں تھی۔
یوسف کمال کا منہ حیرت سے کھلا۔

"قطعی ناممکن، ابھی تم سفر کے قابل نہیں ہو سالار!"

"میں ہوں۔" بڑے سے لاؤنج میں اس کی آواز گونج کر چلی گئی۔

"میں ہوں، پلیز آپ مجھے جانے دیں، صرف کچھ دن کے لیے۔ میں واپس آکر دیکھتا ہوں، یہ سب مگر ابھی نہیں، پلیز انکل! مجھے جانا ہوگا ورنہ پتا نہیں۔۔۔"

آج سے پہلے انہوں نے اسے اتنا پریشان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کوئی بات۔

نبیل یا زرتاج کا کوئی گھٹیا پن۔

انہوں نے اندازہ لگانا چاہا۔ مگر وہ اتنا کمزور کب تھا۔

انہیں اپنے خیالات کی خود ہی نفی کرنی پڑی۔

"چلو ٹھیک ہے، لیکن ابھی کل نہیں، کچھ دن اور، دو دن بعد تمہیں ڈاکٹر چیک اپ کے لیے بلا رہے ہیں، وہ نمٹالو، دیکھو کیا کہتے ہیں، میرا خیال ہے ابھی ڈیڑھ دو ہفتے اور لگیں گے انہیں اجازت دینے میں، بے وقوفی مت کرو سالار! خدا نے نئی زندگی دی ہے تمہیں۔ قدر کرو اس کی، میں تمہیں فوراً نہیں جانے دے سکتا۔"

سالار نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

گو رشتے داروں کو گھر کا نیا پتا بتانے سے مکمل پرہیز کیا جا رہا تھا، پھر بھی معلوم نہیں کیسے سب میں خبر اڑ گئی تھی۔ کہ اظہار صاحب اینڈ فیملی، کسی بہت ہی چھوٹے سے خستہ حال گھر میں رہ رہے ہیں اور بڑی کسمپرسی کے عالم میں دن بسر کر رہے ہیں۔

کئی لوگوں نے جا کر آپا گل سے باقاعدہ اس بات کے لیے اظہار افسوس بھی کر دیا تھا، جس پر وہ ان سب کا مرتے دم تک منہ نہ دیکھنے کا باقاعدہ اعلان کر چکی تھیں۔

"غضب خدا کا۔" ان کے جملے عموماً اسی طرح شروع ہوتے تھے۔

"اتنے سالوں میں کبھی کوئی میری سسرال میں آکر نہیں پھٹکا اور اب جسے دیکھو، منہ اٹھائے چلا آرہا ہے، اور تو اور وہ آپ کی ماموں زاد بہن شکار پور سے آئیں تو وہ بھی خاص طور پر مجھ سے آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے میرے سر پر آپہنچیں، بضد تھیں کہ آپ کا ایڈریس لے کر ہی ٹلیں، لیکن میں نے بھی دے کر ہی نہیں دیا، کہہ دیا کہ آپ لوگ تو گرمیاں گزارنے مری گئے ہوئے ہیں، منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، بڑی مایوسی ہوئی تھی بے چاری کو۔"

"بہت اچھا کیا، تمہاری ساس تو کچھ نہیں بولیں؟" شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب دونوں ہی کو بڑی مورل سپورٹ ملی تھی۔

"ان کے سامنے تھوڑی کہا تھا میں نے، اتنی عقل تو ہے مجھ میں، لیکن پھر بھی کبھی تو یہ بہانے بھی ختم ہو ہی جائیں گے تب۔۔؟" آپا گل کی آواز دھیمی پڑی۔

"اس سے پہلے ہی ہم یہاں سے شفٹ کر جائیں گے۔ میں نے سلمان سے کہا ہے کہ وہ کم از کم اتنا ضرور کردے، اس کے سسر کے کتنے ہی اپارٹمنٹ خالی پڑے ہیں، کرایہ دے دیں گے ہم۔"

اظہار چچا کے لہجے میں اب بھی وہی ٹھوک بجا کر کیا جانے والا دعوا تھا۔ جوان کے اچھے دنوں کی دین تھا۔

مگر اب جواباً "تائید کرنے والوں کا حوصلہ جواب دیتا جا رہا تھا۔ شاکرہ بیگم اور آپا گل دونوں ہی نے ایک دوسرے سے بے ساختہ نگاہ چرائی۔

"زویا کے کالج کا خرچا بڑھ رہا ہے، کتابیں نہ سہی، لیکن نوٹس تو فوٹو کاپی کرانے ہی پڑتے ہیں، آنا جانا، اوپر کا خرچا، اگلے ماہ امتحانی فیس بھی جانی ہے۔" شاکرہ دھیمی آواز میں آپا گل کو بتا رہی تھیں۔

اظہار چچا تھوڑے فاصلے پر بیٹھے تھے مگر دھیان یہیں لگا تھا۔

"آپ لوگوں نے بھی زویا کو اتنی مہنگی پڑھائی میں ڈال دیا، ابھی تو پہلا پروفیشنل ہے، آگے کے تین امتحان اور آئیں گے۔ کہاں سے ہوگا یہ سب۔ آمدنی کی کوئی صورت نہیں، رکھا ہوا پیسہ بھرنے کے کام آئے گا، یا پھر فیسیں بھرتے رہیں گے آپ۔"

آپا گل کو اپنی حقیقت پسندی پر بڑا ناز تھا، مگر کبھی کبھی یہ دوسروں کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگتی تھی۔

"زویا کا شوق تھا، بہت لگن سے پڑھ رہی ہے بچی، ویسے بھی تو لاکھوں ہزاروں خرچ ہوئے ہیں، یوں ہی فالتو بھی، جویا نے تو آگے پڑھنے کی ضد بھی نہیں کی گھر کے حالات دیکھ کر، اب زویا کو بھی۔۔۔" مارے رنج کے انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"توبہ ہے امی!" آپا گل نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔

"آپ بھی کہیں کی بات کو کہیں ملاتی ہیں، وقت وقت کی بھی تو بات ہوتی ہے اور سچ تو یہ کہ اپنا اپنا نصیب، جن کی قسمت میں ہزاروں لاکھوں خرچ ہونے تھے، ہو گئے، اب اگر کسی کا مقدر ہی سخت ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

ان کے لہجے میں بے اعتنائی تھی۔

شاکرہ بیگم کے دل پر چوٹ سی بھی پڑی۔

"خدا نہ کرے، جو زویا اور جویا کی قسمت خراب ہو، ہماری اپنی ناعاقبت اندیشی ہے، چار پیسے اگر ان کے لیے بھی بچا کر رکھے ہوتے تو ان کی اس طرح حق تلفی تو نہیں ہوتی۔"

"زویا اور جویا کم تھیں جو آپ بھی طعنے دینے لگیں، یہ ہی مطلب ہے نا کہ سارا پیسہ مجھ پر اور سلمان پر خرچ ہو گیا، ہم دونوں نے چھوٹی بہنوں کا بھی حق کھا لیا، بس رہنے دیں امی، ابو آپ بھی۔" جو بات ابھی تک دبی ہوئی آواز میں ہو رہی تھی، انہوں نے فی الفور بڑھائی۔

"اس عورت کا تو دماغ چل گیا ہے، تم کہاں اس کی باتیں سننے بیٹھ گئیں، یہ تو میں اور تم تھے بیٹا، جو گھر کو کہاں سے کہاں لے گئے، یہ تو صرف مٹھی بھر کر خرچ کرنا ہی سیکھی ہے زندگی میں، نہ سلیقہ، نہ رکھ رکھاؤ۔"

وہ بری طرح بگڑے۔

"ایسا کیا غلط کہا، جتنا پیسہ تھا گل اور سلمان پر ہی لگا دیا، باقی دو کا بھی تو حق تھا آخر، اب اگر ایک بچی پڑھ رہی ہے تو بھی اس پر اعتراض۔ کیا پڑھائی چھڑوا کر بٹھا دوں اس کی۔"

شاکرہ بیگم کو اس وقت زیادہ غصہ آپا گل پر آیا تھا، ایک ذرا سی بات پر اتنا فساد۔

"کیا کرے گی ڈاکٹر بن کر بھی، ایم بی بی ایس کی تنخواہ پتا ہے آپ کو، ہمارے گھر کا تو ایک دن کا بھی خرچ نہیں چل سکتا تھا اتنے پیسوں میں اس والے گھر میں، بے کار میں خرچ سر پر لے لیا ہے ابو! اتنا ہی کہا تھا میں نے، امی خفا ہونے لگیں۔"

صاف ظاہر تھا کہ انہیں زویا کے میڈیکل جوائن کرنے پر تکلیف تھی یا شاید ہر اس بات پر تکلیف تھی جہاں خرچ کا سوال اٹھ رہا تھا۔

"خیر اب زویا کی پڑھائی تو نہیں چھڑائی جا سکتی، وہ ڈاکٹر بنے گی تو اس میں ہماری ہی عزت بڑھے گی۔"

آپا گل ہی نہیں شاکرہ بیگم نے بھی چونک کر اظہار صاحب کی طرف دیکھا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا اتنی بھی عقل نہیں ہے مجھ میں' پیسہ نہ کمایا ہو' لیکن تعلیم کے معاملے میں ہمارا گھر کہیں پیچھے رہ گیا' گل نے تو میٹرک بھی نہیں کیا' کتنے سال فیل ہوئی ہے' سلمان کو جس طرح ڈگری دلائی وہ میرا دل ہی جانتا ہے' اب ان دونوں چھوٹیوں کو پڑھنے کا شوق تھا' جویا نے بھی مجھ سے ایم ایس سی کی اجازت مانگی تھی ایک بار...' بولتے بولتے اظہار صاحب کی آواز دھیمی پڑی۔

"خیر جویا کو تو رہنے ہی دیجیے ابو! یہ ساری نحوست اسی کی ڈالی ہوئی ہے' اعجاز کے رشتے پر جس طرح اس نے ہنگامہ کیا' سارے میں ذلیل ہو کر رہ گئے ہم۔" آپا گل کا چہرہ بے تاثر تھا' مگر الفاظ۔

ایک کمزور سا پل جو درمیان میں بننے لگا تھا' نفرت بے یقینی کے ہاتھوں بننے سے پہلے ہی بہہ گیا۔ اظہار صاحب نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

"ہاں کیں' تعویذ گنڈے کروائے ہوئے ہیں جویا پر معاذ کے گھر والوں نے' یوں ہی ہمیشہ ضد پر اڑی رہے گی' اگر ہم نے کچھ توڑ نہیں کروایا۔"

"فی الحال تو خاموشی ہی بہتر ہے' ابھی تو جویا کی شادی کا کوئی ذکر نہیں' حالات ذرا سنبھل جائیں تو پھر دیکھیں گے۔"

شاکرہ بیگم قدرے معقولیت سے بات کا رخ موڑ رہی تھیں۔ آپا گل کی طرف سے دل میں جو بال آ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی چیزوں کو کسی دوسرے زاویہ سے دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"یہ دونوں اب تک نہیں آئی ہیں' کہاں غائب ہیں اتنی دیر سے' ذرا دیکھا بھی کریں۔"

اظہار چچا اٹھ کر جانے لگے تھے۔ آپا گل کی طرف سے آئے اعتراض سے ٹھٹکنے پر مجبور ہوئے۔

"زویا کی کسی دوست کے ہاں گئی ہیں' دونوں' چار گلی آگے' کوئی نوٹس وغیرہ لینے ہیں۔"

"اتنی دیر تو نہیں لگتی نوٹس لینے میں' گھنٹے تو ہو گئے' زویا سے آتے ہوئے اس سے بھی پوچھتے۔" ان کا موڈ خراب ہو چکا تھا' اتنی دیر میں چائے کا ایک کپ بھی نصیب نہیں ہوا تھا' پہلے والی خاطر تواضع تو ماضی کی حصہ بنی تھی۔

"لگتا ہے چائے بھی خود ہی بنا کر پینی پڑے گی۔" کسی نے بھی ان کے احتجاج پر دھیان نہیں دیا۔

"میرے لیے بھی بنا لینا۔"

"اور میرے لیے بھی۔" شاکرہ بیگم نیم دراز ہو گئیں' ہمت دن بہ دن جواب دے رہی تھی۔

آپا گل کو اٹھنا ہی پڑا۔

تب ہی کسی نے سیڑھیوں کی طرف کا دروازہ بہت زور سے بجایا۔

"کون؟" آپا گل نے بے ساختہ ہی گھبرا کر پوچھا۔

جواباً "اور بھی زور سے دستک ہوئی تھی۔ شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب دونوں صحن میں آ کھڑے ہوئے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

فیضیہ عامر

"باجی! بابر بھائی کا انتقال ہو گیا۔ رافعہ نے فون پر دھماکہ کیا۔ میں ایک لفظ بھی نہ کہہ پائی۔

"باجی! سن رہی ہو؟ صبح فجر کے بعد دل کا دورہ پڑا تھا' ہسپتال لے جاتے ہوئے راستے ہی میں ختم ہو گئے۔"

گرم گرم آنسو بہہ نکلے' فون میرے ہاتھ میں کپکپا رہا تھا اور میں اب بھی خاموش تھی۔ رافعہ سمجھ گئی۔

"حوصلہ کرو باجی! امی بھی بہت رو رہی ہیں۔ تم بچوں کو لے کر یہاں امی کے گھر پہنچو میں یہیں ہوں'

پھروانیہ کے پاس بچوں کو چھوڑ کر چلیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں۔" مجھے اپنی آواز کسی کھائی میں سے آتی محسوس ہوئی۔
"تم ٹھیک ہو؟" رافعہ میری آواز سن کر گھبرائی۔
"ہاں۔"
فون بند کرکے میں کچھ دیر خاموش خالی الذہن بیٹھی رہی۔ دونوں بچے دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہے تھے۔ مجھے فیصل کا خیال آیا۔ انہیں فون ملا کر یہ خبر دی۔ وہ بھی اس اچانک خبر سے کافی افسردہ ہوئے۔
"تم جاؤ' میں آفس سے ڈائریکٹ پہنچتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔
میں نے بچوں کے کپڑے نکالے' انہیں جگا کر' منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے کو کہا' پھر وضو کرکے خود بھی کپڑے بدلے' بیگ لیا اور بچوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔
کبھی کبھی مجھے اپنا ڈرائیونگ نہ سیکھنا بڑا کھلتا ہے۔ گاڑی کھڑی ہے اور ہم رکشہ' ٹیکسی کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ میرے شوہر فیصل کو آفس کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ ملا ہوا ہے۔ چنانچہ گاڑی کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ میرے گھر سے ٹیکسی اسٹینڈ دور نہیں تو قریب بھی نہیں ہے۔
ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک بار پھر بابر بھائی کا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ ان کی باتیں' ان کی ہنسی' دھیمے لہجے میں گفتگو کرنا۔ وہ میرے سگے ماموں زاد تھے۔ دو ہی بھائی تھے' بابر اور ایاز۔

☼ ☼ ☼

ماموں کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ممانی کو رشتے دار اور پڑوس کی خواتین گھیرے بیٹھی تھیں۔ ان کا سرخ و سفید چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ وہ کبھی چپ ہو جاتیں تو کبھی چیخیں مارنے لگتیں۔ ان کا فرماں بردار' متقی پرہیزگار کنوارا بیٹا اپنے آخری سفر پر جانے کو تیار تھا۔
سپارہ پڑھتے ہوئے میں ممانی کو دیکھتی تو بابر بھائی کا صدمہ اور بھی شدید ہو جاتا۔

بابر بھائی مجھ سے عمر میں دس گیارہ برس بڑے تھے۔ ان دنوں یونیورسٹی میں فارمیسی کے آخری سال میں تھے۔ شام کو روزانہ ہم دونوں بہنوں کو پڑھانے آتے' دانیہ تو اس وقت گود میں تھی۔
میں اور رافعہ ان سے حساب اور سائنس پڑھا کرتے۔ امی سے ان کا پھپھی کا نہیں بلکہ دوستی کا رشتہ تھا۔ وہ آتے تو جیسے گھر میں رونق آجاتی۔ ہمارے لیے ٹافیاں' چیونگم اور چاکلیٹس لاتے' پڑھائی کے بعد کھیل شروع ہو جاتے' کرکٹ' بیڈ منٹن' کھو کھو' چھپن چھپائی ان کے ہوتے ہمیں کبھی بھائی کی کمی محسوس نہ ہوئی۔
میری ان سے خاص وابستگی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں گھر کی بڑی اولاد تھی اور گھر میں آتے ہی سلام کے بعد وہ سب سے پہلے مجھے ہی آوازیں لگاتے۔ مجھے سائیکل چلانا اور چائے بنانا بھی انہوں نے ہی سکھائی۔
[illegible] روشن خیال انسان تھے' ان کی طرف سے کبھی لڑکیوں پر ایسی پابندیاں نہیں لگائی گئیں کہ وہ لڑکوں والے کھیل نہیں کھیل سکتیں۔ ہماری فرمائش پر انہوں نے گیند بلے سے لے کر فٹ بال اور سائیکل سب ہی کچھ ہمارے لیے لا کر دیا۔
میں دس گیارہ سال کی ہوئی تو بابر بھائی مجھے کسی اور ہی ڈھنگ سے اچھے لگنے لگے۔ ان کا چہرہ' ان کی آنکھیں' ان کے مخصوص کولون کی مہک' مجھے ان میں ایک خاص کشش محسوس ہونے لگی۔
بابر بھائی کا ذکر ہو' اور زاہدہ باجی کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے؟ زاہدہ باجی پڑوس میں رہتی تھیں۔ ہمارے گھر اکثر آنا جانا رہتا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ جب بابر بھائی گھر پر ہوتے تو ان کا آنا لازمی ہوتا۔ ان کے سارے کام شام کو ہی آن پڑتے۔
"باجی! ذرا لال دھاگہ تو دیں۔ منی کی قمیص کی ترپائی کرنی ہے۔"
وہ امی کی طرف دیکھ رہی ہوتیں۔ مگر میں سمجھ جاتی کہ توجہ تمام تر بابر بھائی کی جانب ہے۔
"باجی! ٹی وی میں دیکھ کر یہ ڈبل روٹی اور قیمے کے

کباب بنائے ہیں' چکھ کر بتائیں' کیسے ہیں۔ یہ لو' صوفی! تم بھی لو۔" وہ مسکرا کر میری جانب بڑھتیں۔ وہ مجھے زہر لگنے لگیں۔
"کیا مصیبت ہے امی! روز کیوں آجاتی ہیں یہ؟"
"کیا ہو گیا صوفی؟ بری بات ہے۔ اتنا پیار کرتی ہے وہ تم تینوں سے۔" امی نے مجھے جھڑکا۔
"جب بابر بھائی ہوتے ہیں' تب ہی کیوں آتی ہیں؟" امی کے کوفتے گول کرتے ہاتھ تھم گئے۔ اور انہوں نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ میں بھی کہہ کر شرمندہ سی ہو گئی۔
"تمہاری عمر نہیں ہے ایسی باتیں کرنے کی۔ بڑوں کا ادب کرنا سیکھو۔" امی ٹھیک ہی کہتی تھیں میں خاموشی سے کمرے میں چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر بابر بھائی کو ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں بہت اچھی نوکری مل گئی۔ اب وہ صرف ہفتہ اتوار کو ہمارے گھر آیا کرتے اور پورے ہفتے ان کا انتظار ہمارے لیے مشکل ترین ہوتا۔
میں میٹرک میں آگئی تھی جب سنا کہ بابر بھائی کے لیے ممانی لڑکیاں تلاش کر رہی ہیں۔ بابر بھائی کے لیے میرے احساسات تبدیل ہو چکے تھے۔ اب وہ "کرش" والی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ آتے تو میں ادب سے دوپٹہ اوڑھ کر ان کو چائے دیتی۔
ہم بھی خوب مستی کرتے۔ مگر میں اچھل کود والے کھیلوں کی عمر سے نکل چکی تھی۔ چنانچہ رافعہ اور دانیہ خوب مزے کرتیں۔ پھر میری خاطر بابر بھائی نے سب کو لوڈو' کیرم اور اسی طرح کے دوسرے کھیلوں کی طرف راغب کر لیا۔ البتہ سردیوں میں ہم اپنے صحن میں ان کے ساتھ خوب بیڈ منٹن کھیلتے۔
ہاں تو ممانی نے بابر بھائی کے لیے لڑکیوں کی تلاش شروع کر دی۔ امی جانتی تھیں کہ زاہدہ باجی' بابر بھائی کی پسند ہیں۔ انہوں نے کئی بار دونوں کو نظروں کے

تبادلے کرتے دیکھا۔ بہت خاموش سی' پیاری سی' سردیوں کی دھوپ جیسی محبت تھی دونوں کی۔
نہ کبھی وہ دونوں تنہائی میں ملے' نہ کبھی خطوط کا تبادلہ ہوا۔ بس ہمارا گھر ہی تھا جہاں دونوں ہم سب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر لیتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے اور بس۔
"بھابھی! برابر والے رفیق صاحب کی بیٹی زاہدہ بھی تو ہے۔ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ اسی سال بی اے کیا ہے۔" امی نے ممانی سے ذکر کیا۔
"وہ حلوائیوں کی لڑکی؟" ممانی نے ناک بھوں چڑھائیں۔
"بھابھی! حلوائی کوئی ذات تھوڑی ہوتی ہے۔ ویسے بھی رفیق بھائی تو گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔ کبھی کسی زمانے میں ان کے ابا نے مٹھائی کی دکان کھولی تھی۔ اب کہاں وہ کاروبار؟" امی نے وضاحت کی۔
"جو بھی ہے۔ ہے تو حلوائی۔"
"میں نے بتایا نا! یہ کوئی ذات نہیں اور نہ ہی کوئی معیوب کام ہے۔ آج کل لوگ کیا نہیں کرتے۔ حلال رزق ہونا چاہیے۔ کام کچھ بھی ہو۔"
"ناجی! میں نے بابر کے لیے دو تین لڑکیاں دیکھی ہیں۔ تمہیں بھی دکھانی ہیں پھر فیصلہ کریں گے۔" ممانی نے گویا فیصلہ سنا دیا۔
اس نشست کے بعد بھی کئی بار امی نے ممانی کو زاہدہ باجی کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کوئی نہ کوئی نقص نکال کر امی کو خاموش کرا دیتیں۔ جو لڑکیاں انہوں نے پسند کی تھیں ان میں بھی عیب نکل آئے اور وہ بھی مسترد کر دی گئیں۔
بابر بھائی بجھے بجھے رہتے۔ ماں کے آگے انہوں نے کبھی آواز اونچی نہیں کی تھی اور گھر کا ماحول شروع سے ایسا تھا کہ اپنے منہ سے شادی کی بات کرنا تقریباً ناممکن سا تھا۔
وقت کچھ اور آگے کھسکا۔ زاہدہ باجی کی بات پکی ہو گئی۔ میں ان دنوں تلملائی رہتی۔ جب سے میں نے

بابر بھائی کو لپٹ "کرش" کے زمرے سے نکال کر عزت واحترام کی مسند پر براجمان کیا تھا زادہ باجی پھر سے اچھی لگنے لگی تھیں اور میرا دل چاہتا بابر بھائی کے دل کی مراد پوری ہو۔

دونوں کی جوڑی بڑی خوب صورت تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار عید پر بابر بھائی سفید کرتے شلوار میں ملبوس ہمارے گھر آئے تھے تب ہی زاہدہ باجی ہلکے آسمانی سوٹ میں جس پر سلور کام کیا ہوا تھا چلی آئیں۔ میرے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ دو چار تصویریں گروپ میں کھینچنے کے بعد میں نے بابر بھائی اور زاہدہ باجی کو اصرار کرکے برابر برابر بچھی کرسیوں پر بٹھا دیا۔

زاہدہ باجی بہت جھینپ رہی تھیں' بابر بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مجھے وہ دونوں اس قدر اچھے لگ رہے تھے کہ دل چاہ رہا تھا' انہیں اکٹھے کہیں چھپا دوں۔

وہ دونوں دل بھر کر ایک دوسرے کو دیکھیں' باتیں کریں' وہ ساری باتیں جو آج تک کبھی انہوں نے نہیں کیں۔ ان کی ترستی آنکھوں نے کبھی ایک دوسرے کو جی بھر کر نہیں دیکھا۔ کاش! ایسا ہو سکے۔ میں صرف سوچ کر رہ گئی۔

بعد میں جب تصویریں دھل کر آئیں تو وہ تصویر سب سے خوب صورت تھی۔ بابر بھائی نے مجھ سے اس کا نیگیٹو مانگا اور میں نے تصویر ہی انہیں دے دی۔ اچھا ہوا دے دی تھی اور بعد میں دوسری کاپی بنوائی بھی نہیں ورنہ آج اس تصویر کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا۔

اور اب! اب تو زاہدہ باجی کی بات نعمان بھائی سے پکی ہو چکی تھی۔ بابر بھائی اور ہمارے گھر میں دو بلاک کا فرق تھا۔ جس دن زاہدہ باجی کا گھر برقی قمقموں سے سجا اس شام وہ ہمارے گھر آئے تھے۔

سرخ اور سبز بتیوں کا عکس صحن میں بیٹھے ہم لوگوں پر پڑ رہا تھا' میں زبردستی بابر بھائی کو ٹی وی پر ڈراما دکھانے کے بہانے اندر لے گئی۔ مگر ان کے چہرے پر حزن صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

پھر وہ بہت دن ہمارے گھر نہیں آئے۔ اچھا ہوا کہ شادی کے دو ماہ بعد ہی زاہدہ باجی نعمان بھائی کے ساتھ دبئی چلی گئیں ورنہ مجھے ڈر تھا کہ آتے جاتے دونوں کا آمنا سامنا ہوتا تو یہ ایک اور تکلیف دہ بات ہوتی۔

ممانی کی "لڑکی ڈھونڈ" مہم جاری تھی۔ میں نے کراچی یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں ماسٹرز کر لیا۔ پھر میری بھی شادی طے ہو گئی۔ فیصل ابا کے دوست کے بیٹے تھے۔

میری شادی کے تقریباً تمام کام بابر بھائی کے ذمے تھے۔ انہوں نے بڑے بھائی کی طرح ساری ذمہ داریاں نبھائیں۔

رخصتی کے وقت تک انہوں نے بڑے بھائی کی طرح تمام رسومات نبھائیں۔ ان کا خلوص اور شفقت بے مثال تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھابھی! بابر کے لیے کوئی لڑکی دیکھی؟ چالیس کا ہو گیا ہے۔" امی نے پوچھا۔

"آج کل لڑکیوں کا تو نخرہ ہی بڑا ہے پڑھی لکھی ہیں پر سلیقہ نام کو نہیں۔ میں نے تمہاری کراچی کو دیکھا۔"

امی میری سوچ پڑھ جاتی تھیں۔

"لیکن ایسا بھی کیا؟ کسی شادی دفتر میں نام لکھوا دیں۔ ان کے پاس بڑے اچھے اچھے رشتے ہوتے ہیں۔" امی نے مشورہ دیا۔

"تو شادی دفتر میں تو ان لڑکیوں کے نام لکھوائے جاتے ہیں جو گھروں میں اچھے رشتوں کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہوں؟"

"آج کل تو جوان کمسن لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے بھی اگر آس پاس مناسب رشتہ نہ ملے تو شادی دفتروں کا رخ ہی کیا جاتا ہے۔ میں بھی سوچ رہی ہوں رافعہ کا نام لکھوا دوں۔"

"خیر یہ تو تمہاری مرضی ہے' رافعہ کا نام لکھوانا چاہتی ہو' لکھوا دو مگر بابر کے لیے بہت رشتے ہیں۔" انہوں نے جیسے بات ختم کر دی۔

میں نے ممانی کی نفسیات کا مشاہدہ کیا تھا اور میری سمجھ میں یہی آیا تھا کہ وہ لڑکوں کی شادیاں کرنی ہی نہیں چاہتی تھیں' ایسا کرنے سے وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھیں' وہ خود غرضی کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں۔

بیٹوں کو صرف جھوٹا دلاسا دیتی رہتی تھیں۔ آج فلاں کی لڑکی دیکھنے جانا ہے' پرسوں فلاں کے ہاں دعوت ہے' ان کی دو بیٹیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بابر بھائی واقعی بے وقوف بن رہے تھے یا شاید سب سمجھ جانتے تھے' میں سمجھ نہیں سکی۔

☆ ☆ ☆

میری شادی کو نو برس بیت گئے' دو بچوں کی ماں بن گئی' رافعہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی یہاں تک کہ سب سے چھوٹی دانیہ کی بھی منگنی ہو گئی۔

زندگی بدل گئی' ترجیحات بدل گئیں۔ گھر اور بچوں کی مصروفیات کی وجہ سے مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی ایسے میں بابر بھائی کے بارے میں سوچنا بھی بہت کم ہو گیا تھا یا شاید ہم سب انہیں اسی طرح دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ان کی زندگی ایک ہی ڈھب پر رواں دواں تھی۔ ہمارے گھر آنا بھی کم ہو گیا تھا۔ وہ پچاس کی دہائی پار کر چکے تھے۔ اب ان کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا۔ گھر آتے کھانا کھا کر عشاء پڑھنے چلے جاتے۔ وہیں اپنے ذہنی رجحان رکھنے والے دوستوں کے ساتھ وقت گزاری کرتے' اکثر سہ روزہ میں گئے ہوتے۔

ممانی سے اب کھانا پکانا اور دوسرے گھر کے کام نہیں ہوتے تھے' سو انہوں نے ایک عورت رکھ لی جو صبح سے شام تک ان کے گھر رہتی اور سارے کام کر جاتی۔ بابر بھائی کے لیے لڑکی کی تلاش اب بھی جاری تھی۔۔۔ ممانی ہر آنے جانے والے سے بڑی فکر مندی سے تذکرہ کرتیں۔

"بابر کے لیے بتانا کوئی اچھی لڑکی؟" وہ چپکے سے کہتیں۔

ان کے ملنے والے ان کی باتوں کے عادی تھے۔ اب تو سب ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال دیتے۔

گھر میں ویرانی اور بد رونقی انتہا پر تھی' بے ترتیبی ہر جگہ نمایاں نظر آتی۔ جو عورت انہوں نے رکھی تھی وہ کوئی کام ذمہ داری اور ایمان داری سے نہ کرتی۔ میلے پردے' بدرنگ صوفے' دیواروں پر لگے مکڑی کے جالے' جگہ جگہ میلے کپڑے اس گھر کی کسمپرسی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

☆ ☆ ☆

"صوفی! بابر کی امی کو ابھی تک کوئی لڑکی نہیں ملی؟" زاہدہ باجی نے پوچھا جو عید کی چھٹیوں میں پاکستان آئی ہوئی تھیں اور اس وقت میرے بلانے پر خاص طور پر میرے گھر آئی ہوئی تھیں۔

"ارے کہاں' بے چارے یونہی پھر رہے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں ممانی جان کو۔"

"ان کا مسئلہ کیا ہے؟" وہ حیران تھیں۔

"مسئلہ کیا۔ بس نہیں کرتیں شادیاں لڑکوں کی۔ پتا نہیں کون سا خوف ہے انہیں؟ جیسے بہو آتے ہی ان کے بیٹوں کو لے کر بھاگ جائے گی۔"

"پھر اس مسئلہ کا کوئی حل تو ہونا چاہیے۔" وہ افسردہ ہو گئیں۔

"بہت کوشش کی ہے۔ انہیں ہر طرح سمجھایا ہے۔ مگر۔۔۔ کیا کہیں۔۔۔"

"ویسے کب تک اکیلے رہتے رہیں گے وہ؟" وہ بابر بھائی کی تنہائی محسوس کر سکتی تھیں۔

"جب تک اللہ چاہے گا۔ ویسے بھی بے چارے بوڑھے تو ہو رہے ہیں۔ لیکن ہماری ممانی کو دکھائی نہیں دیتا۔" میں غصے سے بولی۔

"بڑا افسوس ہوتا ہے ان کے بارے میں سوچ کر۔ اس دن انہیں تمہاری امی کے گھر آتے دیکھا۔ میں بھی وہیں جا رہی تھی مگر انہیں دیکھ کر پلٹ آئی' بیمار لگ رہے تھے۔ کمزور بھی بہت ہو گئے ہیں۔"

"کوئی خیال رکھنے والا تو ہے نہیں۔ صحت کیا خاک

قائم رہے گی۔ خیر چھوڑیں۔ آپ چائے لیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" میں نے موضوع بدلا۔

☆ ☆ ☆

"جن کو چہرہ دیکھنا ہے' دیکھ لیں۔" فیصل نے باآواز بلند کہا۔

"آؤ صوبی!" امی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں خاموش بیٹھی تھی۔ بابر بھائی کا چہرہ؟ بے جان چہرہ! اف کیسے لگ رہے ہوں گے وہ؟

"آؤ باجی! دیر ہو رہی ہے۔" رافعہ نے مجھے ٹھوکا دیا۔

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ گہوارے میں ان کا جسدِ خاکی سفید کفن میں لپٹا رکھا تھا۔

"بابر بھائی' بابر بھائی! ایک بار تو آنکھیں کھولیں' دیکھیں میں ہوں' اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟"

میں دل ہی دل میں ان سے باتیں کر رہی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب سن رہے ہوں۔

میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ فضا میں کلمۂ شہادت گونجا اور پھر وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

ممانی غش کھا کر گر رہی تھیں' امی نے انہیں سنبھالا۔

میرا دل چاہا آگے بڑھوں اور ان سے کہوں۔

"آپ کے بیٹے کی بارات چلی گئی' رو کیوں رہی ہیں؟" مگر میں ایسا کہاں کر سکتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ کلمہ پڑھنے بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

دروازے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ایاز بھائی ایک خوش شکل تیس بتیس سال کی لڑکی کے ساتھ کھڑے تھے۔

"ارے السلام علیکم ایاز بھائی! آپ؟ آئیں نا۔" میں نے راستہ دیا۔

"وعلیکم السلام! اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟"

"حیران؟ نہیں تو...!" میں نے صاف جھوٹ بولا۔

"لگ تو یہی رہا ہے۔" وہ خوش دلی سے بولے۔

"آپ آیئے تو' ادھر اندر آ جائیں۔" میں نے انہیں ڈرائنگ روم کی طرف بلایا۔

وہ دونوں الگ الگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"ثمرو! یہ صوبی ہے' تمہیں بتایا تھا نا!"

ثمرو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ جواباً میں بھی مسکرائی۔

"اور صوبی! یہ ثمرو ہے۔ میرے ساتھ آفس میں ہوتی ہے۔"

"اچھا' اچھا تو آپ لوگ کولیگز ہیں۔"

"ہاں! سات سال سے ہم ساتھ کام کر رہے ہیں۔"

"میں چائے لاتی ہوں۔" میں نے اٹھنا چاہا۔

"نہیں رہنے دیں' آپ بیٹھیے پلیز۔" ثمرو بولی اس کی آواز بہت خوب صورت تھی۔

"بس پانی رکھ کر ابھی آئی۔" میں نے کہا۔ میں کچن میں گئی تو ایاز بھائی میرے پیچھے پیچھے کچن میں چلے آئے۔

"صوبی! ثمرو تمہیں کیسی لگی؟"

"اچھی ہے۔" میں نے صاف دل سے اقرار کیا۔

"دراصل ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ارے!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں' میرا مطلب ہے اچھی بات ہے۔ شکر ہے' آپ کو خیال تو آیا ممانی سے بات کی؟"

"ہاں کی تھی۔"

"پھر کیا بولیں وہ؟"

"منع کر دیا۔"

"کیوں؟"

"تم جانتی تو ہو' پہلے تو زمانے بھر کی لڑکیوں کے نام گنوائے جو انہوں نے دیکھ رکھی ہیں۔ پھر مجھے جی بھر کر برا بھلا کہا کہ میں شادی کے لیے بے قرار ہوں' بڑا بھائی بیٹھا ہے اور مجھے اپنی پڑی ہے اور بھی بہت سی ایسی شرمناک باتیں جو میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔" وہ بے حد اداس ہو گئے۔

"پھر ایاز بھائی؟ کس طرح ہو گا سب کچھ؟ کیا آپ کا ارادہ کورٹ میرج کرنے کا ہے؟"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ میں ثمرو کی امی سے بات کر چکا ہوں۔ وہ گھر کے بڑوں کے بغیر کسی صورت شادی پر رضامند نہیں ہیں۔"

"یہ تو بہت مشکل بات ہو گئی۔" میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"دیکھو صوبی! ثمرو کے والدین ہیں۔ بہن بھائی اور دیگر رشتے دار ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے لوگوں کو کیا بتائیں گے؟ ہاں البتہ اگر امی راضی نہیں ہیں تو خاندان کے دوسرے بڑے آ کر رشتے کی بات کریں اور باقاعدہ بارات وغیرہ لے کر آئیں' تب ہی یہ ممکن ہے۔"

"مگر ایاز بھائی! ہم کیسے اتنی بڑی بات ممانی سے چھپا سکتے ہیں اور کس کو لے کر جائیں گے؟"

"پھپھو کو۔" انہوں نے دھیرے سے کہا۔

کچھ دیر کے لیے میں خاموش ہو گئی۔ پھر چائے کی ٹرے میں بسکٹ اور کیک کی پلیٹیں رکھ کر ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئی۔ ایاز بھائی بھی میرے پیچھے وہاں چلے آئے۔

ثمرو سے باتیں کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ انتہائی سلجھی ہوئی طبیعت کی' مجھے ایاز بھائی کی پسند پر خوشی بھی ہوئی مگر دل کھٹک رہا تھا' جو وہ سوچ کر میرے گھر آئے تھے' وہ تقریباً" ناممکن سا لگ رہا تھا' پھر بھی میں نے امی سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔

ہم تینوں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر مجھے بابر بھائی اور زاہدہ باجی یاد آتے رہے۔

"جو پہلے ہو نہیں پایا تھا' کیا اب ہو جائے گا؟" میں نے خود سے سوال کیا مگر جواب؟ جواب نہیں تھا میرے پاس۔

ان کے جانے کے بعد میں بہت سوچتی رہی۔ فیصل آئے تو کھانے کے بعد میں نے ان سے ذکر کیا اور ان کو ساری تفصیلات بتائیں۔

جیسی کہ مجھے امید تھی' وہ بے حد خوش ہوئے اور مجھے بھی برابر یہی کہتے رہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ دو عاقل و بالغ انسان شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ایک مقدس بندھن میں بندھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔

ہم دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے مگر جب اتوار کو میں امی کے گھر پہنچی اور ان سے ذکر کیا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ امی نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے صوبی؟ کیسی بے تکی بات کر رہی ہو؟"

"اس میں کیا بے تکا پن ہے امی؟"

"یعنی میں بھابھی سے چھپ کر ایاز کا رشتہ لے کر جاؤں اور شادی بھی کروا دوں؟ بہت اچھے صوبی! تم تو کمال کی باتیں کرتی ہو۔" امی نے طنز کیا۔

"امی! میرا بھی یہی خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ بابر بھائی کا حشر دیکھ رہی ہیں۔ اب ایاز بھائی کے ساتھ تو یہ نہیں ہونا چاہیے۔" فیصل نے مداخلت کی۔

"ہاتھ اٹھا اٹھا کر بددعائیں دیں گی اور جھولی بھر بھر کوسنے۔ نا بھئی اس بات کو بھول جاؤ۔" امی اٹل تھیں۔

"بچے جو کہہ رہے ہیں' ایسا غلط بھی نہیں ہے بلکہ بالکل بھی غلط نہیں ہے۔ اس طرح کسی کی زندگی برباد ہونے سے بچائی جا سکتی ہے۔" ابا نے پہلی بار اس معاملے میں زبان کھولی۔

مجھے مزید ایک حامی پا کر بہت خوشی ہوئی۔

"دیکھیں! آپ اور فیصل داماد ہیں' خاموش ہی رہیں اس معاملے میں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا

جب بھابھی آپ دونوں کی بے عزتی کریں گی۔" امی نے ابا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے بے عزتی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ اگر میری تھوڑی سی بے عزتی کے بدلے ایاز کی زندگی سنور جائے تو منظور ہے مجھے۔ اور ثواب بھی ملے گا۔"

اس دن مجھے ابا پر بہت پیار آیا۔ وہ کم بولتے تھے اور امی کی انتہائی ذمہ دارانہ کارکردگی کی بدولت وہ گھر کے معاملات میں مداخلت بہت ہی کم کرتے تھے۔ مگر آج تو وہ ڈٹے ہوئے تھے۔

"ذرا سوچو' بابر بوڑھا ہونے کو آیا مگر آج بھی تنہا ہے۔ دنیاداری سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ لوگ اسے اللہ والا کہنے لگے ہیں۔ مگر کیا خدا نے دین کی رسی تھام کر دنیا کو تج دینے کو کہا ہے؟ پھر بھی جو ایسا کرتا ہے وہ صرف اس لیے کہ دنیا اس کے لیے اپنی اہمیت کھو چکی ہوتی ہے۔ وہ کس کے لیے جیے؟ کس کے لیے محنت کرے' کما کر لائے' گھربار بنائے؟ جاؤ پھر وہ سوچتا ہے لوٹ کر جس کے پاس جانا ہے تو کم سے کم اگلی زندگی کو ہی سنوار لوں' اللہ نے تو زندگی کو بہت خوب صورت بنایا ہے پھر کیوں ہم زندگی سے اس کا حسن چھین لیں؟"

ابا آج خوب بول رہے تھے۔

"آپ کچھ بھی کہیں' میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتی۔ ہاں میں بھابھی سے بات ضرور کروں گی کہ ایاز کو ایک لڑکی پسند ہے اور وہ چل کر اسے دیکھیں۔ رشتہ دیں۔"

"امی! خدا کے لیے ممانی سے ذکر نہ کیجیے گا۔ ایاز بھائی نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ جانتی تو ہیں۔ وہ جا کر خوب بے عزت کریں گی ان لوگوں کو۔ پسند کی شادی کی تو وہ ویسے بھی سخت مخالف ہیں۔"

"کیا کریں۔ بھائی جان حیات ہوتے تو ان کو تو میں قائل کرلیتی۔"

"رہنے دیں۔ ان کو آپ کون سا قائل کرسکیں امی؟ چند سال پہلے ہی تو ماموں کا انتقال ہوا ہے۔" میں جھنجلا رہی تھی۔

"بہرحال جو بھی ہو۔ بھابھی کے علم میں لائے بغیر میں اتنا بڑا قدم ہرگز نہیں اٹھاؤں گی۔ اور تم! ان کا اشارہ میری طرف تھا۔

"تم زیادہ اماں نہ بنو۔ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی ہو تم۔"

☼ ☼ ☼

ایاز بھائی کو میں نے فون پر ساری بات بتادی' وہ سخت مایوس تھے۔

"فکر نہ کریں ایاز بھائی! کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ خود نظر آجاتی ہے۔" میں نے تسلی دی۔

"نہیں صومی! ایک پھپھو ہی تھیں جن سے توقع تھی۔ اب انہوں نے بھی منع کردیا ہے تو پھر کیا ہوسکتا ہے؟"

میں ان کا چہرہ نہیں دیکھ رہی تھی مگر سمجھ سکتی تھی کہ ان کے کیا تاثرات ہوں گے۔

"تمہیں معلوم نہیں ہے صومی! میں امی سے ذکر کرکے کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے دے رہی ہیں۔ مجھے ایموشنلی بلیک میل کررہی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے میں نے کوئی جرم کرنے کی ٹھانی تھی۔ مجھ سے زیادہ بابر بھائی پریشان ہیں۔ وہ میری صورت دکھا دکھا کر انہیں عبرت دلا رہی ہیں۔ وہ تو ویسے بھی شادی وغیرہ جیسے معاملات سے دستبردار ہوچکے ہیں۔ ان کی خاموش ویران زندگی میں سکون بھی نہیں رہا۔ سب میری وجہ سے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"معاف کیجیے گا ایاز بھائی! آپ نے کوئی ایسا کام کرنے کا نہیں سوچا تھا جس کی وجہ سے آپ کو احساس ندامت ہو' ممانی کی بے کار کی باتیں مجھے نہ جانے سخت کوفت ہوتی ہے۔ میرا بس چلے تو میں کل آپ کا نکاح ثمرہ سے پڑھوا دوں اور مجھے قطعی کوئی شرمندگی نہ ہوگی۔"

وہ چھیڑتے تھے۔

"آپ بہنا بہت شکریہ تمہارا۔"

"اب تکلفات پر نہ اتریے۔ گھر آئیے گا۔"

"ہاں ضرور۔ ان شاء اللہ۔"

☼ ☼ ☼

چند ماہ پہلے جب میری بابر بھائی سے آخری ملاقات ہوئی تھی تو وہ خلاف توقع خاصے ہشاش بشاش تھے۔ بلیک پینٹ اور سرمئی شرٹ میں نظر کی عینک لگائے اور قلموں کے بال سفید ہونے کی وجہ سے وہ خاصے باوقار لگ رہے تھے۔

میری وہ ملاقات امی کے ہاں ہوئی تھی۔ وہ میرے لیے میری پسند کی خوشبو لے کر آئے تھے۔ انہیں میری سالگرہ یاد تھی۔ پھر خود ہی جا کر کیک لے کر آئے اور میری پہلی سالگرہ کا ذکر کرتے رہے جس میں میں نے رو رو کر گھر سر پر اٹھایا ہوا تھا۔

بہت دیر تک وہ مجھے "رونی صورت" کہتے رہے تھے۔

مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے یہ سب کل کی باتیں ہوں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کو دنیا سے رخصت ہوئے سوا مہینہ ہونے کو آیا ہے۔

سامنے بابر بھائی کا کمرہ دکھائی دے رہا ہے۔ ان کا سنگل بیڈ' اسٹڈی ٹیبل بالکل صاف نظر آرہے ہیں' الماری دیوار کے ساتھ لگی ہونے کی وجہ سے نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ان کی اسٹڈی ٹیبل پر لگے شیلف میں ان کی پسندیدہ کتابیں قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ میری طرف سے ان کو تحفتاً دی گئی سلیم احمد کی "اکائی" بھی رکھی ہوئی تھی۔

"اکائی' ایک زندگی!" صرف ایک بار ملنے والی زندگی۔ بے وقعت کیوں ہوئی؟ مشیت ایزدی' تقدیر کا فیصلہ یا پھر؟

میرے رب نے تو ہمیشہ زندگی کی قدر کرنے کو کہا ہے۔ اس نے یہ دنیا سجائی' اس کو معنی دیے' رشتوں کے ہار میں پرویا' غم' خوشی سب سکھیے تھے ذائقے جیسے امید' آس' سہارے' وسیلے' سب عطا کیے۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے خطائیں ہوتی ہیں مگر زندگی کو بھینٹ چڑھا دینے کی خطا؟ معصوم مسکراتا بچہ' ماں کا دلدادہ اتنا کہ بس آنکھ سے اوجھل نہ ہو۔ ہر وقت اپنی جان سے لگائے ہوئے۔ ہاں بس اپنا بنا کر رکھے ہوئے' کسی اور کا نہیں۔

اس کا دل' دھیرے دھیرے آرزوؤں کا مدفن بنتا ہے۔ ہاں ماں کی محبت' احسان' بوجھ' فرض فرماں برداری۔

میری بے ربط سوچیں مجھے چین نہیں لینے دے رہی ہیں۔ سامنے ممانی بیٹھی ہیں ان کے چہرے کا حزن وملال۔ واقعی انہوں نے اپنا بیٹا کھویا ہے۔

لو وہ ایاز بھائی چلے آئے۔ لگتا ہے انہوں نے کئی ہفتوں سے داڑھی نہیں بنائی۔ بہت کمزور لگ رہے ہیں۔ ممانی کے بلوانے پر اندر آئے ہیں اور خاموشی سے کھڑے ہیں۔

"یتیم خانے بھجوادیا کھانا؟" ممانی نے پوچھا۔

"جی!" جواب مختصر تھا۔

"اور ایدھی میں؟"

"جی وہاں بھی۔"

"اچھا! اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میرے بابر کو کھونے والا

زردہ پسند تھا وہی بنوایا ہے ایاز نے کہہ کر' میوے بھی خوب ڈلوائے ہیں۔ بابر بغیر بادام پستوں کے تو کھاتا ہی نہیں تھا۔" وہ دوسری خواتین کو دیکھ کر بول رہی تھیں۔

ایاز بھائی خاموشی سے بابر بھائی کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے دیکھا وہ ان کے بیڈ پر بیٹھے ہیں۔ ان کی آنکھیں نم ہیں۔ کیا یہ گھر بھی کسی قبرستان سے کم ہے؟

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر امی کو دیکھا' وہ بہت غور سے ایاز بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔ تین ماہ پہلے وہ ثمرہ کو لے کر میرے گھر آئے تھے تو کتنے بشاش لگ رہے تھے اور آج برسوں کے بیمار اور عمر رسیدہ بھی۔

ہم جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ معمولات زندگی کہاں رکتے ہیں۔

رافعہ اور وانیہ کاموں میں مصروف تھیں۔ کچن کا کام ختم کروا کر ان دونوں نے تمام سپارے ترتیب سے رکھنے شروع کر دیے۔

آج ہم سب یہاں بابر بھائی کے گھر ان کے چہلم میں جمع ہیں۔ ان کی اس دنیا سے رخصتی کی آخری رسومات بھی تکمیل پا گئیں۔ کل کی صبح ہم سب پھر اپنے اپنے معمولات زندگی میں گم ہوں گے۔

البتہ ان کی یاد ابھی تازہ ہے' کئی دنوں تک دل کو سلگاتی رہے گی پھر وقت مہربان دوست کی مانند ان یادوں کو دھندلا دے گا۔ زندگی آگے بڑھے گی' نئی دلچسپیاں' نئی امنگیں اور نئی راستے' مگر اس گھر میں کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ سب ایسا ہی رہے گا جیسے ہر چیز یہاں ٹھہری ہوئی ہو۔

رافعہ اور وانیہ آ گئیں۔

میں نے دیکھا' امی' بابر بھائی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اب کے چہرے پر کچھ عجیب سی بات ہے میں بھی ان کے پیچھے لپکی کہ ایاز بھائی کو خدا حافظ کہہ دوں۔

وہ سر جھکائے دونوں ہاتھ سر پر رکھے بیٹھے ہیں۔ ممانی کو کچھ خبر نہیں۔ وہ برابر مہمان خواتین کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہیں۔ میرا سات سالہ بیٹا باہر سے دوڑا ہوا آیا اور میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"امی! چلیں بابا بلا رہے ہیں۔"

میں نے اسے دیکھا' پھر اس کے ننھے سے ہاتھ کو دیکھا۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ رب جلیل نے ہم دونوں کو ماں باپ بنایا ہے۔ بڑا رتبہ دیا ہے۔ اور امتحان بھی۔

انہیں منزلوں کی جانب گامزن کرنا ہے۔ ان کی خوشی' ان کی پسند کے کھلونے۔ ہاں' ہر عمر میں یہ ہمارے بچے ہی رہیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات بدلتی رہیں گی۔

میں نے اپنے بیٹے کا ماتھا چوما۔

"تم چلو ہم آ رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا۔ امی' ایاز بھائی کے پاس کھڑی تھیں۔ میں وہاں پہنچی۔ امی نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور نم بھی۔

"ثمرہ کیسی ہے؟" میرا تپا ہوا تانا امی کو یاد تھا۔

ایاز بھائی کی آنکھوں میں یکبارگی حیرانی اتر آئی۔

"جی؟؟ جی ٹھیک ہے پھپھو!"

"تم کل گھر آنا' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

امی مجھے اور ایاز بھائی کو حیرت زدہ چھوڑ کر بڑے وقار کے ساتھ کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔ میں بھی جلدی سے ایاز بھائی کو خدا حافظ کہہ کر باہر کی جانب بڑھی۔

میرے کانوں میں ان کی شادی کے شادیانے بج رہے تھے اور میں اپنے وجود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

علامہ اقبال

دیکھو! وقت گزر جائے گا

دیکھو! وقت گزر جائے گا
تم نے جس سے
جو کچھ بھی کہنا ہے، کہہ لو
یوں نہ ہو کہ
اب کہ جو تم بچھڑو
تو کچھ ایسے بچھڑو
جیسے دو انجان مسافر
اک انجانے اسٹیشن پر
اک دوجے سے مل کر بچھڑیں اور کھو جائیں
تم کیا اک ٹیبل پر بیٹھے سوچ رہے ہو؟
دیکھو! وقت گزر جائے گا

علی ساحل

کوئی یاد ہی رختِ سفر ٹھہرے کوئی راہ گزر انجانی ہو
جب تک مری عمر جوان رہے اور یہ تصویر پرانی ہو

کوئی ناؤ کہیں منجدھار میں ڈوبے چاند سے اُلجھے اور ادھر
موجوں کی وہی حلقہ بندی دریا کی وہی طغیانی ہو

اسی رات اور دن کے میلے میں ترا ہاتھ چھُٹے مرے ہاتھوں سے
ترے ساتھ تری تنہائی ہو مرے ساتھ مری ویرانی ہو

یوں خانۂ دل میں اک خوشبو آباد ہے اور لو دیتی ہے
جوں بادِ شمال کے پہرے میں کوئی تنہا رات کی رانی ہو

کیا ڈھونڈتے ہیں کیا کھو بیٹھے کس عُجلت میں ہیں رگیں ہیں
سرِ راہ کچھ ایسے ملتے ہیں جیسے کوئی رسمِ نبھانی ہو

ہم کب تک ہاتھوں سے خود اپنے لیے دیوار چُنیں
کبھی تجھ سے حکم عدولی ہو، کبھی مجھ سے نافرمانی ہو

کچھ یادیں اور کتابیں ہوں، مرا عشق ہو اور یار نے ہوں
اسی آب و ہوا میں رہنا ہو اور ساری عمر بتانی ہو
سلیم کوثر

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دُنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

اک لحظہ بہے آنسو اک لحظہ ہنسی آئی
سیکھے ہیں نئے دل نے اندازِ شکیبائی

اس موسمِ گل ہی سے بہکے نہیں دیوانے
ساتھ ابرِ بہاراں کے وہ زلف بھی لہرائی

ہر دردِ محبت سے اُلجھا ہے غمِ ہستی
کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تری آئی

چرکے وہ دیے دل کی محرومیٔ قسمت نے
اب ہجر بھی تنہائی اور وصل بھی تنہائی

آنکھوں نے سمیٹے ہیں نظروں میں ترے جلوے
پھر بھی دلِ مضطر نے تسکین نہیں پائی

یہ بزمِ محبت ہے، اس بزمِ محبت میں
دیوانے بھی شیدائی، فرزانے بھی شیدائی
صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

معاف کرو نا،

ایک فقیر بچی سے: "اللہ کے نام پر دے بیٹا۔"
بچی بولی "میں بیٹا نہیں بیٹی ہوں۔"
فقیر: "اللہ کے نام پر دے بیٹی۔"
بچی: "میرا نام مریم ہے۔"
فقیر: "اللہ کے نام پر دے مریم۔"
بچی: "میرا پورا نام مریم رضا ہے۔"
فقیر: "اللہ کے نام پر دے مریم رضا۔"
بچی: "یہ ہوئی نا بات۔ اب معاف کرو بابا۔"
گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

زعفرانی چٹکلے،

سوتنوں نے وقت دن تاریخ کا اعلان کیا
گلی میں پہلے ہی لگے شوہر کو جو سید جانہ ہوا
وہ بچ کے بھاگ گیا میری بیوی کے یہاں
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا
سونیا ربانی۔ قاضیاں محلہ بالا

معاوضہ،

مصنف بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ایک نوجوان روباص نے ایک روز اپنے دوست ٹنکو شاہ کے پاس پہنچ کر خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔
"آخر کار مجھے اپنی ایک کہانی "فاختہ کی چونچ" کے عوض پانچ سو روپے مل ہی گئے۔ یار ٹنکو شاہ! قلم کے ذریعے یہ میری پہلی کمائی ہے۔" روباص نے بتایا۔
"کس رسالے نے دیا ہے یہ معاوضہ؟" ٹنکو شاہ نے پوچھا۔
"رسالے نے نہیں دیا یار۔ یہ پیسے کورئیر سروس والوں نے ہرجانے کے طور پر دیے ہیں۔" انہوں نے میری کہانی کا مسودہ گم کر دیا ہے۔" روباص نے بتایا۔
شبنم شمشاد۔ بیزمان

جانِ من،

دل میں بساؤں بیگم تجھ کو میں کس طرح
یہ بات ہی نہیں ہے میرے اختیار میں
تیری پہاڑ جیسی جسامت ہے جانِ من
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں
نمرہ، اقرا۔ کراچی

دُعا وطن کے نونہالوں کے لیے،

- اے اللہ! ان تمام اسٹوڈنٹس کو امتحان میں کامیاب فرما جنہیں پورا سال پڑھنے کی فرصت نہ ملی۔
- اُن معصوم ہاتھوں کو ہمت دے جنہوں نے اَن لمیٹڈ میسج پیکج کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیا۔
- خدایا! اُن آنکھوں کو روشنی عطا کرنا جو انٹرنیٹ اور ٹی وی پہ بیٹھ کر کمزور ہو گئے ہیں۔
- اُن غریب بچوں کی مدد فرما جن کے گرل/ بوائے فرینڈ نے اُن سے رات بھر ڈھائی روپے فی گھنٹہ میں بات کر کے اُنہیں پڑھنے نہیں دیا۔

زینب احسن زینی۔ منصورہ آباد

آپ تو جانتے ہیں،

والد نے لڑکے کی رپورٹ دیکھتے ہوئے کہا۔
"تمہاری رپورٹ بہت خراب ہے اور میں تم سے

بہت ناراض ہوں۔" لڑکے نے جواب دیا۔
"آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈیڈی میں نے اپنی ممی کو بہت سمجھایا کہ ایسی رپورٹ نہ بھیجیں ورنہ والد صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ مگر وہ نہ مانیں۔ آپ تو جانتے ہیں عورتیں کتنی ضدی ہوتی ہیں۔"

شہناز شازیہ سیال۔ خانیوال

کارستانی،

ایک فرانسیسی کو ڈاکٹر نے بتایا۔ "تمہارے جسم میں پانی زیادہ ہے۔"
وہ بہت حیران ہوا اور بولا۔ "پانی زیادہ ہے؟
مگر میں نے تو زندگی میں کبھی پانی پیا ہی نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔
"اوہو۔ یہ اس برف کی کارستانی معلوم ہوتی ہے جو میں کبھی کبھار شراب میں ملا کر پیا کرتا تھا۔"

شبنم شمشاد۔ یزمان

ایسا بھی ہوتا ہے،

ایک سپاہی اتنا ڈرپوک تھا کہ جنگ چھڑتے ہی محاذ سے بھاگا تو پیچھے ہی بھاگتا چلا گیا۔ ایک آفیسر نے اسے دیکھ لیا اور روک کر اسے ڈانٹا۔
"تمہیں معلوم نہیں آگے محاذ پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
سپاہی چپ رہا تو آفیسر نے پھر گرج کر کہا۔
"جواب تو دو۔ تمہیں پتا نہیں میں کون ہوں؟ میں تمہارا جنرل ہوں۔"
یہ سن کر سپاہی چیخ پڑا۔ "خدا کی پناہ میں اتنا پیچھے آ پہنچا۔"

نمرا، اقراء۔ کراچی

قسمت،

نجومی نے سائل کا ہاتھ دیکھنے کے بعد کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھیے صاحب! میں کوئی جھوٹی امید دلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا علم کہتا ہے کہ انتالیس سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو جائے گا۔ اڑتیس سال کی عمر میں آپ شادی کریں گے اور آپ کے سولہ بچے ہوں گے۔"
"کیسی فضول باتیں کرتے ہو۔" سائل بگڑ کر بولا۔
"اڑتیس سال کی عمر میں میری شادی ہو گی اور انتالیس سال کی عمر میں ہی مر جاؤں گا اور میرے سولہ بچے ہوں گے؟"
"آپ کی شادی جس بیوہ عورت سے ہو گی وہ پندرہ بچوں کی ماں ہو گی۔" نجومی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ثریا آصف۔ خانیوال

احتیاط

"اس آدمی سے جب تمہارا جھگڑا ہو رہا تھا تو اس نے تمہیں کیا کہا تھا؟"
"تمہارا خیر خواہ ہوں۔"
"ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟"
جواب ملا "مجھے بھی معلوم نہیں، لیکن میں نے احتیاطاً اسے ایک لات رسید کر دی تھی۔"

عظمیٰ غلام نبی۔ کراچی

قدر دان،

نوادرات کی دکان میں مالک نے ایک صاحب کو شیلف سے ایک گلدان اٹھاتے دیکھ کر خبردار کرنے کے سے انداز میں کہا۔
"ذرا احتیاط سے اٹھائیے گا جناب! یہ گلدان دو ہزار سال پرانا ہے۔"
"ارے صاحب فکر نہ کریں، میں تو اسے اتنی احتیاط سے اٹھا رہا ہوں جیسے یہ بالکل نیا ہے۔" ان صاحب نے گویا دکان دار کو تسلی دی۔

ندا، نفسہ۔ کراچی

افسوس،

خاتون! یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ آپ کے شوہر انتقال کر گئے۔ زندگی کے ساتھی سے محروم ہو جانا بلاشبہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے۔"
"جی ہاں۔ خاص طور پر اس لیے کہ آپ کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کس چیز سے محروم ہوئے ہیں لیکن یہ پتا نہیں ہوتا کہ آئندہ آپ کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔" خاتون نے افسردگی سے کہا۔

کرن، بینش۔ فیصل آباد

تشریحات

بدقسمتی:۔ بحری جہاز کی تباہی کے بعد وہ ایک ویران جزیرے پر جا پہنچا لیکن بدقسمتی سے اپنی ہی بیوی کے ساتھ۔

شرمندگی:۔ چابی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر جھانکنا جبکہ دوسری طرف پہلے ہی سے ایک آنکھ موجود ہو۔

ملے جلے جذبات:۔ آپ کی ساس کا آپ کی نئی کار مانگ کر لے جانا اور ریورس کرانگ پر ٹرین سے ٹکرا جانا۔

مریم، سعدیہ۔ کراچی

اعلا نسل،

گاہک:۔ "کیا یہ اعلا نسل کا کتا ہے؟"
بیوپاری:۔ "اعلا نسل؟ جناب! اگر یہ کتا بول سکتا تو ہم میں سے کسی سے بھی بات نہیں کرتا۔"

ذاتی فیس،

ایک انتہائی کنجوس شخص کو دوران پرواز طیارے میں اچانک ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ طیارے کے عملے میں فطری طور پر ــــــ کھلبلی مچ گئی۔ یہاں تک کہ پائلٹ نے نزدیک ہی موجود ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے متعلقہ ایئرپورٹ آفیسرز کو مطلع بھی کر دیا۔
کنجوس شخص کی برابر والی سیٹ پر اتفاق سے ایک ہارٹ اسپیشلسٹ بیٹھے ہوئے تھے جو کہ پچھلے ایک گھنٹے کے دوران اس کی بخیل طبیعت سے اچھے خاصے واقف ہو چکے تھے۔ اچانک ان کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا اور وہ درد سے بے حال کنجوس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ ساتھ ہی پانچ منٹوں میں کنجوس شخص بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ بعد میں پائلٹ کے پوچھنے پر ہارٹ سرجن نے بے نیازانہ انداز میں بتایا کہ "میں نے اس کے کان میں کہا تھا۔
جہاز کے لینڈ کرتے ہی پی آئی اے انتظامیہ تمہارے علاج کے لیے یقیناً مجھے ہی منتخب کرے گی۔ بے شک تمہارے علاج کا سارا خرچ پی آئی اے کے ذمے ہی ہو گا مگر اس کے باوجود میں ذاتی طور پر بھی تم سے اپنی فیس لوں گا۔ جو کہ فی ٹیسٹ دس ہزار ہے۔ بس اتنا سنتے ہی اس نے اپنی دل کی تکلیف پر قابو پا لیا۔"

شہناز شازیہ سیال۔ خانیوال

نہلے پہ دہلا،

سردار کی بیوی:۔ "رات کافی ہو گئی ہے لیکن سردار جی نہیں آئے، ضرور کسی لڑکی کا چکر ہو گا۔"
سردار کی ماں:۔ "ہمیشہ برا ہی سوچنا۔ کیا پتا کسی ٹرک کے نیچے آ گیا ہو۔"

کرن بشیر۔ کراچی

غائب دماغی،

سائنس کے پروفیسر صاحب لیبارٹری میں کسی تجربے میں منہمک تھے۔ ان کی بیوی اخبار لیے لیبارٹری میں داخل ہوئی اور بولی۔
"آپ نے یہ اخبار دیکھا؟ اس میں آپ کے انتقال کی خبر چھپی ہے۔"
"ٹھیک ہے، میری طرف سے پھولوں کی چادر بھجوا دینا۔" پروفیسر صاحب نے آلات سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

شگفتہ
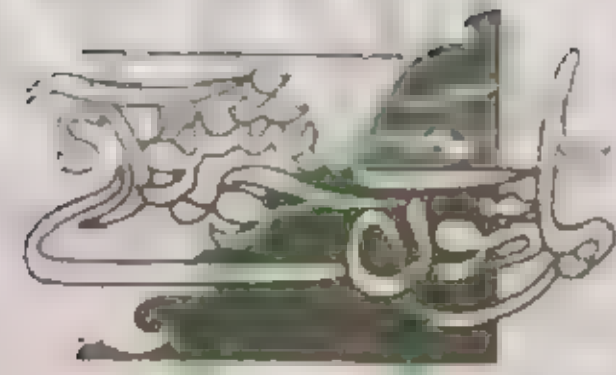
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس وقت بندے صبح کرتے ہیں دو فرشتے اترتے ہیں۔ ایک تو یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اور دے اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! بخیل کو تباہ کر"۔
(صحیح مسلم)

مومن کی فراست،

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہہ کو فن تعمیرات میں امتیاز حاصل تھا۔ شہروں کی منصوبہ بندی کا جو تصور حضرت عمرؓ نے دیا تھا۔ وہ آج تک اپنی مثال آپ ہے۔ حفظان صحت، ہوا، دھوپ ہر چیز کا خیال رکھنا منصوبہ بندوں کی ذمہ داری ہے۔
حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دوران عمال کو خط لکھا اور حکم دیا۔
"اپنی عمارتوں کو منزل در منزل بلند نہ کرنا۔ تمہارے بدترین ایام وہ ہوں گے جب تم بلند عمارتیں بنانے لگو گے جن سے لوگ دھوپ اور ہوا سے محروم ہو جائیں گے"۔
حضرت عمرؓ نے کسی میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ انجینئرنگ یونیورسٹی کی ڈگری یا ڈپلوما ان کے پاس تھا۔ آپ نے اپنی خداداد قابلیت اور نور ایمانی کی بدولت دیکھ لیا تھا کہ فلک شگاف عمارتوں اور گنجان آباد شہروں کی وجہ سے انسانیت کرب و اذیت میں مبتلا ہو جائے گی۔
آج کثیر المنزلہ عمارتوں کی وجہ سے شہروں کا جو حال ہو چکا ہے اس سے حضرت عمرؓ کی فراست ظاہر ہے۔

صوفی کی پہچان،

شیخ ابو مسلم ایک جماعت کے ساتھ حجاز جا رہے تھے۔ راستے میں کردوں نے ان کا راستہ روک لیا اور ان کے پھٹے پرانے کپڑے تک ان سے چھین لیے۔ صوفیوں کی اس جماعت نے ان سے کوئی جھگڑا نہ کیا لیکن ان میں سے ایک شخص نے بڑی بے قراری کا اظہار کیا۔ اس پر ایک کرد نے تلوار سونت لی اور اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔
سب صوفیوں نے کرد سے اس کی جان بچانے کے لیے سفارش کی۔ کرد نے کہا کہ میں اس جھوٹے شخص کو ضرور قتل کر دوں گا۔ صوفیوں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔
"یہ شخص صوفی کیسے ہو سکتا ہے جو چند چیتھڑوں کے لیے اتنا بے قرار ہے۔ ہم چند سال سے صوفیوں ہی کو لوٹ رہے ہیں۔ کہ مال و دولت کی وجہ سے ان کا تعلق کہیں دنیا سے مضبوط نہ ہو جائے"۔
حفصہ ملک۔ فیصل آباد

امام زین العابدینؒ نے فرمایا،

"مجھے اس تکبر، فخر کرنے والے پر تعجب ہے جو گزشتہ کل ایک نطفہ تھا اور آئندہ کل یکسر مردہ ہو گا۔ اور مجھے بے حد تعجب ہے اس پر جو ذات خدا پہ خدا کی مخلوق کو دیکھنے کے بعد بھی شک کرتا ہے اور بہت زیادہ تعجب اس پر ہے جو دار فنا کے لیے تو مصروف عمل ہے مگر دار بقا کے لیے عمل کرنا چھوڑ

چکا ہے"۔
سمیرا حیات۔ رینالہ خورد

قسمت،

خوش قسمتی اور بد قسمتی میں معمولی سا فرق ہے خوش قسمتی آپ کے دروازے پر ایک بار دستک دیتی ہے جبکہ بد قسمتی اس وقت تک دستک دیتی رہتی ہے جب تک دروازہ کھل نہ جائے۔
ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

مہکتی کلیاں،

- خدا کے حضور دعا مانگنا، پریشانیوں کا سب سے بڑا نفسیاتی حل ہے۔ (ارسطو)
- عقل، ادب کے ساتھ ایسی ہے جیسے ثمر دار درخت اور بغیر ادب ایسی ہے جیسے درخت بے برگ۔ (حکیم لقمان)

صبا افضل بٹ۔ سیالکوٹ [illegible]

یہ سچ ہے کہ،

اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بے کار ہے اور چراغ جلانے کا اصل وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے نہ کہ پچھلے پہر۔
(مولانا ابوالکلام آزاد)
شبنم شمشاد۔ بزمان

سوچ کا آئینہ،

- آپ کے گھر سے خالی ہاتھ لوٹنے والا سائل آپ کے سکون پر وار کرے گا۔ چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بھی چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔
- سب سے اچھا علم وہ ہے جو دل میں اتر کر عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔
- دنیا میں ہر چہرہ ایک ہی چہرہ ہے، بس روپ الگ الگ ہوتے ہیں۔
- کسی ایک مقصد کے حصول کا نام کامیابی نہیں۔ اس مقصد کے حصول کا نام ہے جس کے علاوہ یا جس کے بعد کوئی اور مقصد نہ ہو۔
(واصف علی واصف)
رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

خیال انگیزیاں،

- لکھنا طریق علاج کی ایک صورت ہے۔ بعض اوقات مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو لکھتے نہیں، شعر نہیں کہتے، مصوری نہیں کرتے، اس پاگل پن، جنون اور ہیبت ناک خوف سے جو انسانی صورت حال میں موجود ہے۔ فرار کی راہ کس طرح نکالتے ہیں۔ (گراہم گرین)
- میرا مقصد یہ ہے کہ لوگ جو دکھ کی کیفیت میں زندگی گزار رہے ہیں، انہیں سب سے چھٹکارا دلایا جائے اور خوشی کی کیفیت کی طرف رہنمائی کی جائے۔ (دانتے)
- تم صرف مصیبت اور ضرورت کے وقت دعائیں مانگتے ہو۔ کیا خوش حالی اور فراغت میں بھی تمہارے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ہیں؟ (خلیل جبران)
- جو شخص قدرت کی قسمیں کھائے اس پر اعتماد نہ کرو تو بہتر ہے۔ (کولٹ)

اعجاز بشیر۔ تونسہ شریف

کام،

اگر تم محبت کے ساتھ نہیں بلکہ ناپسندیدگی کے ساتھ کام کرتے ہو تو بہتر ہے کہ تم اپنا کام چھوڑ دو اور مندر کے دروازے پر بیٹھ کر ان لوگوں سے خیرات لو جو مسرت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔
(خلیل جبران)
کرن بنش۔ کراچی

دل اور زبان،

ایک دفعہ امام غزالیؒ کی مجلس میں لوگ انسانی

کارناموں پر بڑی پُرجوش بحث کر رہے تھے۔ کوئی فاتحین کے کارناموں کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو کوئی دانائی اور حکمت کو انسان کا سب سے بڑا کارنامہ بتا رہا تھا۔ امام غزالیؒ کافی دیر تک خاموشی سے اُن کی باتیں سنتے رہے۔ حاضرین میں سے ایک نے امام غزالیؒ سے کہا۔
"آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں۔"
امام غزالیؒ نے کہا۔
"تم لوگ زیرِ بحث مسئلہ کی تلاش میں بہت دُور نکل گئے ہو، حالانکہ انسان جو سب سے بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے، وہ تو ہمارے سامنے ہے۔"
سب نے حیران ہو کر پوچھا "کون سی چیز؟"
"انسان اپنے دل اور زبان کو قابو میں رکھے تو یہ انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہو سکتا ہے اور یہ کارنامہ بہت کم لوگ انجام دے سکتے ہیں۔"

بے دین،

بے دین آدمی ایسے ہے جیسے بے نکیل اونٹ۔ بے ناتھ کا بیل، بے لگام کا گھوڑا، بے ملاح کی ناؤ، بے باپ کا بچہ، بے ریگولیٹر کی گھڑی، بے نگینے کی انگوٹھی، بے لالی کی مہندی، بے خوشبو کا عطر، بے باس کا پھول، بے طبیب کا مریض، بے آئینہ کا سنگھار۔
(ڈپٹی نذیر احمد)

شمیم شمشاد احمد۔ شکارپور

بہترین نسخہ،

ایک عورت ایک عالم کے پاس گئی اور کہا کہ "مجھے کوئی ایسا تعویذ دیجیے کہ میرا شوہر مجھ سے جھگڑا نہ کرے اور میری بات مانے۔"
عالم نے کہا۔ "تھوڑا سا پانی لے آؤ، میں کچھ پڑھ کر اس پر دم کر دوں گا۔ جب تمہارا شوہر غصے میں ہو تو اس پانی میں سے ایک گھونٹ منہ میں لے کر بیٹھ جانا مگر خبردار پانی کو حلق سے نیچے نہ اتارنا۔"
چنانچہ اس عورت نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ جب بھی خاوند غصے میں ہوتا، وہ منہ میں گھونٹ لے کر بیٹھ جاتی۔ اب وہ بول تو سکتی نہیں تھی لہٰذا منہ کو تالا لگ گیا اور اس کا غصہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔
اگر جھگڑے میں ایک فریق تکرار نہ کرے اور پلٹ کر جواب نہ دے تو جھگڑا بڑھ نہیں سکتا اور اس کے بعد فریق کے لیے نرم پڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

اہلِ دانش کا فرمانا،

★ نیک عملوں کی توفیق بہت اچھی شناخت ہے یقین جانو جس شخص کو نیک عملوں کی توفیق دی گئی۔ اس کے لیے قرب کا دروازہ کھل گیا۔
(حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ)
★ کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔
(مارٹن لوتھر کنگ)
★ صحیح معنوں میں آزاد وہی ہے جو خواہشوں کا غلام نہیں۔
(آر۔ ایل۔ ہبرٹی)
★ تکلیف انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ سوچنے سے آدمی دانا بنتا ہے۔ اور دانائی آدمی کو جینے کے قابل بناتی ہے۔ (جان پیٹرک)
★ اگر آپ کو خوشی کی تلاش ہے تو وہ آپ کو اس طرح ملے گی۔ جس طرح بڑھیا نے کافی تلاش کے بعد اپنی کھوئی ہوئی عینک ڈھونڈ نکالی مگر وہ اس طرح کہ وہ اس کے سر پہ لگی ہوئی تھی۔
(بلنگر)
★ قبولِ دُعا کے لیے مایوسی، احساسِ بے چارگی اور اضطرابِ غم ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی بدکاروں کی دُعا بھی قبول ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو غم زدہ دل کی بے تاب دھڑکن مائل بہ کرم کرتی ہے۔

(ابن جوزی)

شاہدہ ظہیر رانا۔ رحمان گڑھ

☼

دیا بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: [illegible]

السلام علیکم
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں، اللہ تعالیٰ ہم کو، آپ کو، ہمارے سارے وطن کو سلامت رکھے اور ... جو ... کا ... ان کو بے نقاب کرکے کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ آمین۔
بشریٰ انور خان سیٹھیرہ، کاچو ... سے لکھتی ہیں
"پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہوئے۔ ... آمنہ زرین کا ... اور دلچسپ تھا۔ "ستارۂ شام" زبردست جا رہا ہے۔ لیکن "یوارِ شب" ... سست روی کا شکار ہے اور بوریت کا باعث بھی بن رہا ہے۔
... "ونڈو ... ناپ ... لسٹ رہا۔ عفت سحر کی "الفت سی ہو گئی تھی" نے ثابت کر دیا کہ کچی عمر کی محبت 'محبت' نہیں بلکہ پسندیدگی ہوتی ہے۔ "میری صبح کا ستارہ" یہ دنیا ... لوگوں کے لیے جہنم سے کم نہیں۔ درد اس وقت سوا ہو جاتا ہے جب آپ کی کم صورتی کا احساس دلانے والے آپ کے اپنے ہوں ویسے ابھی آپ نہ بھی فیل کریں گے لیکن دوسرے بار بار یہ کہہ کر احساس دلوا ہی دیتے ہیں کہ "تم کس پر چلی گئیں تمہاری دوسری بہنیں تو ایسی نہیں ہیں۔"
"بارِ ندامت" کے آخری الفاظ دل میں درد جگا گئے۔ "شرارت" میں ربیع کی شرارت اتنی بڑی تو نہ تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوتا۔

آخر میں ایک بات سچ سچ بتائیے گا کہ ثمرہ بخاری سے کیا کوئی جھگڑا چل رہا ہے؟ پچھلے سات آٹھ ماہ سے میری موسٹ فیورٹ رائٹر غیر حاضر ہیں۔ اگر میں کہانی ارسال کرنا چاہوں تو کیا اس کا طریقۂ کار بھی یہی ہو گا کہ ایک ایک لائن چھوڑ کر صفحے کی ایک جانب لکھوں۔
ج: پیاری بشریٰ شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ یقین کریں ... بھر میں ہمیں جو فون موصول ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر لڑکیاں ... یہی سوال کرتی ہیں کہ کہانی کیسے لکھیں اور کیسے بھجوائیں جبکہ ہر ماہ خطوط کے کالم میں ہم بڑی تفصیل سے یہ بات بتاتے ہیں۔ اب آپ نے بھی یہی بات پوچھی ہے تو ایک بار اور سہی۔
کہانی صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں اور اسے ایک لفافے میں ڈال کر ایڈریس لکھیں۔
ماہنامہ شعاع '37' اردو بازار کراچی۔
اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوا دیں۔
ثمرہ بخاری ہماری بہت اچھی رائٹر ہیں۔ ہمیں بے حد عزیز ہیں اور جھگڑے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا وہ اتنی اچھی اور پیاری طبیعت کی مالک ہیں کہ ان سے جھگڑا کیا ہی نہیں جا سکتا بلکہ ہم سے تو کیا شاید کسی اور سے بھی انہوں نے کبھی جھگڑا نہیں کیا ہو گا۔ ابھی دو دن پہلے ہماری ان سے بات ہوئی ہے تو ہم نے آپ سب قارئین کا شکوہ ان تک پہنچایا ہے۔ انہوں نے جلد لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

شازیہ جمال نیر نے واہولا سے شرکت کی ہے۔

بچپن ہی سے امی اور آپی نازیہ کو ڈائجسٹوں میں منہ گھسیڑے دیکھا۔

سب سے پہلا ناول جو رخسانہ آپی سے تعارف کی وجہ بنا اس کا نام یاد نہیں البتہ ہیرو کا نام شہریار اور ہیروئن کا نام "نگار" تھا۔ اس وقت میں 8th کی اسٹوڈنٹ تھی۔ رخسانہ نگار کی کہانیاں بلاشبہ معاشرتی زندگی کی بھرپور اور بہترین عکاس ہوتی ہیں۔ Queen of love فرحت آپی کی ہر تحریر دل کے تمام دروازے کھڑکیاں اور روشن دان کھول کر پڑھتی ہوں۔ "کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں" کے تمام ڈائیلاگ ازبر ہیں۔ بہاروں کا سندیسہ لانی راحت جبیں کا "زرد موسم" شعاع کی سب سے یادگار اور سبق آموز تحریر ہے اور رہے گی۔ نبیلہ ابر راجہ کی ہر تحریر پڑھنے کے بعد میری چھوٹی بہن سعدیہ کہتی ہے "نبیلہ جی کا ہیرو ادھار نہ مانگ لوں؟"

سعدیہ حمید چوہدری کے الفاظ میرے لیے سچے موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی اور انمول ہیں۔ ان کی تحریر "من و تو" اور "مائی ہیرو" میری پیاری باجی آسیہ کے موسٹ فیورٹ ہیں۔ انیسہ سلیم کا "ہمارا کیش ہے ترک رسوم" کا زید نیازی میرا آل ٹائم فیورٹ ہے نازیہ آپی' ماہا ملک اور نایاب جیلانی کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

میں نے سنا ہے کہ گمشدہ چیزوں کے لیے مسجد میں اعلان کرنا اسلام میں منع ہے جبکہ ہمارے گاؤں میں مسجد میں اس طرح کے اعلان ہوتے رہتے ہیں۔

ج: شازیہ! یہ بات تو کوئی عالم دین ہی بتا سکتے ہیں' ہماری نظر سے تو ایسی کوئی حدیث نہیں گزری۔ ممکن ہے نماز یا جمعۃ المبارک کے خطبہ کے دوران منع ہو۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ریاض' سعودی عرب سے یہ ای میل ہمیں مسرت حسن نے بھیجی ہے' لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے رخسانہ نگار کو مبارک باد "کوئی دیپک ہو" بہت زبردست رہا۔ مگر زونیرہ اور ثانیہ کا سامنا ہونا چاہیے تھا۔ آمنہ ریاض کا "ستارۂ شام" بھی ٹھیک جا رہا ہے اور پلیز جنت کو ذرا جلدی بڑا کر کے اس کے بارے میں بتائیں کہ وہ شیزو فرینیا کی مریض کیسے بنی؟ "اک حرف آگہی" پڑھ کر یقیناً بہت ساری لڑکیوں کو عقل آگئی ہو گی۔ عفت سحر طاہر کا "الفت سی ہو گئی" بہترین تھا۔ عمیمہ کا کردار بہت زبردست تھا۔ عائشہ فیاض نے ایک بار پھر "بار ندامت" اپنے منفرد انداز میں لکھ کر تعریفیں اپنے نام کروا لیں۔ "شرارت" نبیلہ عزیز نے بہت اچھا ناول لکھا' بہرحال غلطی دونوں کی تھی۔ نعیمہ ناز نے جو "ابا جی" لکھا بہت اچھا تھا۔ اللہ سب کے سروں پر ماں' باپ کا سایہ سلامت رکھے۔ (آمین) آپی! "شاعری بیچ بولتی ہے" میں میرا انتخاب کب شائع ہو گا؟

ج: مسرت جی! آپ ہماری پرانی قارئین میں سے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بڑی باقاعدگی سے ہمیں ای میل بھی کرتی ہیں۔ آپ کا تبصرہ ملتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی اور تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آمنہ ریاض آئندہ دو اقساط میں جنت کا کردار واضح کردیں گی' اور یہ بھی کہ جنت کا ثمینہ اور ثروت کا جنت اور شبیہہ العباس سے کیا تعلق ہے۔

ایک قاری بہن کا خط ملا ہے' لیکن یہ اپنا نام لکھنا بھول گئی ہیں چونکہ ان کے خط کی کچھ باتوں کی وضاحت ضروری ہے' اس لیے خط شائع کیا جا رہا ہے۔

شعاع اپریل میں نبیلہ عزیز کی "شرارت" پڑھی۔ نبیلہ آپ کی تحریریں پہلے بھی پڑھی ہیں لیکن اندازہ نہیں تھا کہ آپ کا پوائنٹ آف ویو اس طرح کا ہے۔

بھئی آپ تو مجھے کچھ کچھ مشرف نظریات کی حامی لگ رہی ہیں۔ انہوں نے تو کئی مسجدیں مسمار کروائیں۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سانحۂ عظیم سے تو بچہ بچہ واقف ہے۔ اب آپ کے پاس اتنی پاور تو نہیں تھی لہٰذا آپ نے اپنی پاور (قلم) کا خوب استعمال کیا صوفی الیاس صاحب کے ذریعہ علمائے کرام کو غلط کہا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بتائیں صوفی صاحب کا طرز عمل غلط تھا کہ رقیہ اور ربیج کے کرداروں کے ذریعہ ان پر ان کے طرز زندگی پر کھلی اور بے جا تنقید کی گئی۔

نیز ربیج جیسی خدائی احکامات کی کھلے عام نافرمانی کرنے والی کو خوب نوازا گیا۔ نوازتا تو اللہ بھی ہے نافرمانوں اور فرمانبرداروں سب کو لیکن نافرمانوں کی اللہ عزوجل مدد نہیں فرماتے۔

اچھی بہن! دین اسلام کو نہ ربیج جیسے لوگ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی اصل روح نمازی روزہ داروں کو معلوم ہے۔ آپ پلیز عورتوں کے لیے اسلامی ضابطۂ حیات دیکھنا چاہتی ہیں تو دیکھیں سورۂ نور دیکھیں سورۂ احزاب اور دیکھیں سورۂ طلاق پھر ان کے ذیل دی گئی تفسیری احادیث اور آثار صحابہ دیکھیں۔ پھر فیصلہ کریں کہ صوفی الیاس اپنی بیٹیوں پر سختی بے جا کرتے ہیں یا بجا۔ لاعلمی میں لکھی گئی یہ کہانیاں کہیں اللہ کریم کے دربار میں کبھی بہت بڑی ناراضی کا سبب نہ بن جائیں۔ آپ کو ربیج کا سا طرز زندگی پسند ہے تو اس کا پرچار نہ کریں۔ شریعت کے مطالعے کے بعد آپ بتائیے گا ربیج کس کیٹیگری میں آتی ہے؟

اب آتے ہیں شمارے کی جان "دیوار شب" کی طرف۔ اس میں بیسٹ کیریکٹر معاذ کا ہے حقیقت سے قریب تر عکاسی کی ہے عالیہ بخاری نے ان حکمرانوں کی ویل ڈن۔

"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

"پنی ویلیو" رخسانہ جی نے اتنی جلدی اینڈ کردیا ایز آ مجھے بڑی خوشی ہوئی (بھئی خوشی وہ ہے تب سے) اچھا ہوا ہے اور اب کا سب سے اچھا پوائنٹ ہے تھا جب راحیل اور عمیر وغیرہ مایوسی سے دل چھوڑ بیٹھتے ہیں تو ثانیہ انہیں زندگی میں حرکی امید پر سفر جستجو پر ابھارتی ہے۔ آگے بڑھنے کی لگن اور نئی امید اور راحت آفزا باتوں سے سجا یہ ناول ہمت ہار دینے والوں کے لیے ایک تحفہ ایک امید تھا۔ زونیرہ جیسے لوگوں کے لیے باعث عبرت اور فنیسہ' وہاب جیسے لوگوں کے لیے باعث ندامت اور عمیر جیسوں کے لیے سبق آموز۔

آمنہ ریاض "ستارۂ شام" جانا پہچانا نام۔ اچھا کام لیکن مجھے ولید اور عبیر کے کردار اچھے لگے فی الحال۔ ہادی کھلنڈری سی ہے۔ شبیہہ العباس وہی روایتی اکڑفوں ہٹ دھرمی اور بے کار کی ضد' بہرحال کہانی کا پلاٹ اچھا ہے۔ تنزیلہ ریاض کا ناول تھا "وطن میرا حوالہ ہے" وہ مجھے جنون کی حد تک اچھا لگا تھا۔ انہوں نے جشن آزادی کے حوالے سے لکھا تھا۔ نیز "مرگ برگ" بھی اچھی تحریر تھی۔ وہ کب لکھیں گی اتنی طویل غیر حاضری اور بسنت سے اتنا پیار کہ ہمیں بھول ہی گئیں وطن کے حوالے سے پلیز ان سے کچھ لکھوائیں۔

سعدیٰ حمید چوہدری بھی پچھلے دو تین ماہ سے نظر نہیں آئیں' میں ہر ماہ لسٹ میں کام کا نام دیکھنا چاہتی ہوں آخر میں نبیلہ عزیز کے لیے ..... اپنی مٹی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو' سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے۔

ج: عزیز بہن! مسجدیں مسمار کرانا' بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا کوئی بھی مسلمان ایسے قبیح فعل کا حامی نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ایمان کی ذرا سی بھی رمق ہو' وہ اس نظریہ کی یا مشرف کے فعل کی حمایت نہیں کر سکتا۔ آپ نے نبیلہ عزیز کی تحریر سے صحیح مقصد اخذ نہیں کیا۔ انہوں نے ربیج کو کہیں بھی حق بجانب قرار نہیں دیا۔ اس کے والدین نے اس سے منہ موڑ لیا' ربیج خود اپنے مذاق پر شرمندہ تھی اور اسے اس وقت سکون ملا جب اس کے والدین نے معاف کردیا اور صوفی صاحب کی بیٹی کی شادی ہو گئی۔

نبیلہ نے صوفی صاحب کو کہیں بھی غلط نہیں کہا۔ ان کے کردار کو بیان کیا ہے صوفی صاحب کا طرز عمل اور نظریہ غلط نہیں تھا وہ بالکل درست اور اسلام کے عین مطابق تھا لیکن مزاج میں جو سختی تھی وہ غلط تھی اچھی بات نرمی سے بھی سمجھائی جا سکتی ہے اور پھر ربیج نے اگر غلطی کی تھی تو اس کی اس طرح رخصتی کسی صورت بھی منصفانہ فیصلہ نہیں تھا۔ اگر ربیج کسی اور کو چاہتی ہوتی تو سوچیں یہ کتنا بڑا ظلم ہوتا اس پر۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سعدیٰ حمید چوہدری تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

سونیا فرید نے ہمیں یہ ای میل بھیجی ہے' مگر اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں۔

افسانے یوں تو سب ہی اچھے تھے' لیکن نیر فہیم خان کا "اک حرف آگہی" سب سے اچھا لگا۔ کاش اس کا پیغام شادی شدہ بہنوں کی سمجھ میں آجائے۔ سعدیہ رئیس نے بھی اچھا لکھا' جبکہ سائرہ رضا کا "ون ڈے دی چیچی" کا تھیم سمجھ میں نہیں آیا۔ مکمل ناول میں نبیلہ عزیز بازی لے گئیں۔ بہت خوب صورت تحریر تھی۔ عفت سحر کا "یوں ہی الفت سی" کچھ پسند نہ آیا۔ بہت فلمی سی سچویشن لگی۔ عمیمہ کی اچانک واپسی سمجھ میں نہیں آئی۔ اور دیور کے شادی شدہ ہونے کے باوجود ساتھ گھومنے پھرنے

کی کیا ضرورت تھی؟ جبکہ کسی کو اندازہ بھی ہو کہ وہ آپ کے بارے میں کیا جذبات رکھتی تھی۔ جنی طاہر کی "خواب کا پنچھی" بہت اعلا تحریر تھی۔

ج: سونیا جی! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نئے سلسلہ کے لیے جو آپ نے تجویز دی ہے اس کے لیے معذرت' سلسلہ ایسا ہونا چاہیے جس میں تمام قارئین کے لیے دلچسپی ہو۔

سونیا ربانی نے قذفیاں محلّہ بالا سے لکھا ہے

رخسانہ نگار عدنان کا طویل ناولٹ "کوئی دیپک ہو" شروع سے لے کر آخر تک رخسانہ آپی نے شدت سے انتظار کرنے پہ مجبور کیا اور پہلی بار ایسا ہوا کہ سمجھ بھی نہیں آرہا تھا کہ آخر میں ہوگا کیا؟

مگر رخسانہ آپی تو آخر میں زونی کو لانا چاہیے تھا۔ وہ ثانیہ سے معافی مانگتی۔

خیام لگتا ہے بے چارہ پھر سے سڑک پہ آجائے گا اور دوسری طرف گیتی کی شادی ہو رہی ہے۔ اس بار عابیہ جی معاذ اور اس کے گھر کو بھول ہی گئیں۔ آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ جویا اور معاذ کو ملا ضرور دینا۔ ورنہ یہ ناول بہت زیادہ دکھی کرے گا مجھ کو۔

ج: سونیا جی! رخسانہ نگار عدنان اور عابیہ بخاری تک آپ کا تبصرہ پہنچایا جا رہا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ تک شعاع اس ماہ دیر سے پہنچا اور آپ تفصیلی تبصرہ نہ کر سکیں۔

میمونہ عمران نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے۔

شعاع میٹرک میں پڑھنا شروع کیا تھا اور آج جب میٹرک کیے ہوئے پندرہ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ ان بیتے پندرہ برسوں میں زندگی میں آنے والے ہر سرد و گرم میں شعاع نے ہمارے یا شاید ہم نے شعاع کے دامن کو تھامے رکھا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد جاب اور پھر شادی اور اب دو پیاری سی بیٹیوں کی کیوٹ سی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ شعاع سے رشتہ پہلے دن کی طرح استوار ہے۔

اپریل کا شمارہ پڑھا۔ تقریباً" ایک دن میں ختم کر لیا۔ بیٹیوں کو ملا کر یہ کارِ خیر انجام دیا جاتا ہے۔ "اک حرفِ آگہی" تیر نیم نوش کی معنی خیز حقیقتاً" اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ...تک والدین بھی یہ کارِ خیر انجام دیتے تھے مگر اب جب شادی کو چار سال ہونے والے ہیں اب بھی تیمہ تو سب کرتی ہوں مگر اپنی چھوٹی بہن سے۔ ماں کو پریشان نہیں کرتی۔

اور "دن ڈے دی جیجبی" سائرہ رضا جی نے تو میرا مستقبل دکھا دیا ہے کیونکہ عنقریب میری بیٹی بھی اسکول جانا شروع کر دے گی۔

"الفت سی ہو گئی تھی" عفت سحر طاہر۔

مکمل ناول نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ لفظوں میں وہ شدت وہ گہرائی محسوس نہیں ہوئی۔ بہت عام سے لفظوں کی عام سی کہانی تھی۔ "شرارت" نبیلہ عزیز کا ناول پڑھ کر مزہ آیا۔

اس سے ہمارے معاشرے میں پھیلی بے راہ روی کی بہت اچھی طرح عکاسی ہوتی ہے۔ ہر رشتے کی اپنی عزت اور اپنی طرز ہے مذاق میں بھی اپنی حدوں کو نہیں پھلانگنا چاہیے۔

"خواب کا پنچھی" لبنیٰ طاہر نے کرائی کا کچا افسانہ آ...

"دیوارِ شب" دھیرے دھیرے اپنے کرداروں کو نئے رنگوں سے روشناس کرا رہی ہے۔

ج: میمونہ جی! پندرہ سالہ تعلق میں صرف دو خط؟ مصروفیات اپنی جگہ لیکن دوستوں سے کبھی کبھی تو ملنا چاہیے۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھیے گا۔

عائشہ قدیر نے فیصل آباد سے لکھا ہے۔

ہر گزرتا دن ہمیں ایسے دکھ اور غم سے دوچار کر رہا ہے کہ اب ایسا لگتا ہے ہمیں کہیں سے بھی اجالا نصیب نہیں ہو گا۔ پاکستان کے موجودہ حالات دیکھتی ہوں تو دل لرز اٹھتا ہے۔

ہماری تمام رائٹرز زندگی کی بہار اور خزاں کو بیان کرنے کا فن بہت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی ہیں۔ نعیمہ ناز نے جو اپنے والد کی یاد میں مضمون تحریر کیا بے اختیار مجھے اپنے مرحوم والد کی یاد آ گئی۔

عفت سحر طاہر' نبیلہ عزیز' رخسانہ نگار عدنان' فرحت اشتیاق میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔

ج: عائشہ جی! سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے جو حالات ہیں ان کو دیکھ کر ہر حساس دل کرب اور دکھ کا شکار ہے لیکن ہم جیسے لوگ کڑھتے رہنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ جب تک ہم سب پاکستانی ایک قوم بن کر نہیں سوچیں گے۔ حالات نہیں بدلیں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ہیر' رانجھا کے شہر قبولہ سے منزہ شمائل نے لکھا ہے

ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ پہلی شعاع سے ہوتے ہوئے "کوئی دیپک ہو" تک گئے۔ کہانی کی ابتدا عمدہ طریقے سے کی گئی۔ اختتام اس سے بھی عمدہ' ویل ڈن رخسانہ جی! آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" شان دار طریقے سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے! دیوار شب اک لاجواب ناول ہے مدتوں یاد رہنے والا شاہکار۔

"صبح کا ستارہ' یونہی الفت سی" عمدہ تحریریں تھیں۔ عائشہ فیض کی "بارِ ندامت" بہر اچھا بار جھوٹ کی۔ "زلزلہ" ام مسفور شاندار تھا۔ ہمیں بھی اپنا "زلزلہ" کرنا چاہیے اس سے پہلے کہ قدرت ہم پر زلزلہ لے۔ باقی تمام افسانے بھی اچھے تھے۔ کچن اسپیشل بہت پیارے تھے۔ پزا' چکن فرائیڈ رائس' چاکلیٹ سوفلے کی تراکیب شائع کریں آپی! تمام مستقل سلسلے بھی پسند آئے۔ آپی! میں آپ کو تاریخ قبولہ شریف بھیجنا چاہتی ہوں۔ مگر طوالت کی وجہ سے خاموش تھی۔ تاریخ قبولہ کے ٹوٹل 9 ٹاپک ہیں۔ آپ کو لکھ کر روانہ کر دوں کیا؟ بتائیے گا ضرور۔

ج: منزہ جی! آپ قبولہ شریف کی تاریخ ضرور لکھ کر بھجوائیں۔ پاکستان کے تمام شہر' گاؤں ہمارے اپنے ہیں۔ ہم ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری جو قارئین اپنے شہروں' قصبوں اور گاؤں کے بارے میں لکھ کر بھیجتی ہیں ہم انہیں بڑی خوشی سے شائع کرتے ہیں۔

کچن کے سلسلے میں آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

آمنہ اور رابعہ لاہور سے اپنی ای میل کے ساتھ شریک محفل ہیں' لکھتی ہیں۔

اس ماہ کے شعاع میں سب سے پہلے بات کروں گی نبیلہ عزیز کے "شرارت" کی۔ نبیلہ جی اپنی رومانٹک سی تحریروں میں بھی لڑکیوں کو بہت گہری نصیحت کر دیتی ہیں۔ نبیلہ جی! ویل ڈن۔ عفت سحر طاہر کا ناول بس ٹھیک تھا۔ "کوئی دیپک ہو" میں رخسانہ جی نے جلدی میں اختتام کر دیا۔ آمنہ ریاض کے "ستارہ شام" میں شبیہہ کی شادی تنوی کے بجائے مادی سے ہو گی۔ ہو جائے تو مزہ آ جائے۔ دونوں ایک جیسے ہیں اور تنوی کی جے ڈی سے ہونی چاہیے۔ ویسے سوائے جنت کے تمام کرداروں کا تعلق حویلی سے ہے۔ سائرہ عارف کے ناولٹ "صبح کا ستارہ" میں ماہین پر بہت ترس آیا۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ افسانوں میں سب سے بہترین ام طیفور کا "زلزلہ" تھا۔ آپی! کیا میں "شعاع کے ساتھ ساتھ" میں بذریعہ ای میل شرکت کر سکتی ہوں؟

ج: آمنہ اور رابعہ! آپ کا اندازہ درست ہے' تمام کرداروں کا تعلق حویلی کے ساتھ ساتھ جنت سے بھی ہے کیونکہ حویلی کا مرکزی کردار جنت ہے۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" کے لیے اپنا تعارف آپ بذریعہ ڈاک بھجوائیں۔

قارئین سے

پچھلے چند سالوں میں ہر شے کی قیمت میں کئی سو گنا اضافہ ہو چکا ہے' کاغذ کی قیمتوں کے ساتھ ساتھ پرچے کے دیگر اخراجات میں بھی اسی حساب سے اضافہ ہوا ہے۔ دیگر پرچوں نے قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہم اپنے قارئین پر اضافی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکا' ادارہ خواتین ڈائجسٹ یہ بوجھ برداشت کرتا رہا اور قیمت میں اضافہ نہیں کیا۔ لیکن اب روز افزوں بڑھتی مہنگائی میں پرچا موجودہ قیمت میں شائع کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ اس لیے بحالت مجبوری اس ماہ سے پرچے کی قیمت میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس شمارے کی قیمت 50 روپے ہے۔

سرمد خان سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"اختر عباس خان سرمد۔ بحیثیت شاعر کے میں سرمد خان سے پہچانا چاہتا ہوں۔"

2 "پیار کا نام؟"
"بلی یہ مجھے بچپن میں کہا جاتا تھا۔ اب تو سرمد ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر / ستارہ۔"
"5مارچ 1976ء / کمالیہ / ARIES۔"

4 "قد / تعلیمی قابلیت۔"
"5فٹ 7انچ / بی فارمیسی 'ایم فل مائیکرو بیالوجی۔"

5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر۔"
"8بہن بھائی 4 بہنیں اور چار بھائی / میرا نمبر ساتواں ہے۔"

6 "شادی۔۔۔؟"
"بس کچھ دنوں میں انشاءاللہ ہو جائے گی۔"

7 "ایف ایم میں آمد؟"
"میں ریڈیو پاکستان سے نیوز پڑھتا تھا اور جب میں لاہور سے اپنی جاب کے سلسلے میں ٹرانسفر ہو کر آیا تو چونکہ میری زیادہ مصروفیات نہیں تھیں تو میں نے ایف ایم 100 کو جوائن کر لیا۔"

8 "کتنے سال سے ایف ایم میں ہیں۔"
"تقریباً 8سال۔"

9 "آپ کی جاب۔"
"منسٹری آف ہیلتھ میں بحیثیت گورنمنٹ آفیسر کے 18گریڈ کا آفیسر ہوں۔"

10 "وجہ شہرت۔"
"میری آواز۔"

11 "پہلی کمائی؟ کہاں خرچ کیے؟"
"1000روپے اور کتابیں خریدی تھیں۔"

12 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"دل تو چاہتا ہے کہ صبح اٹھوں نماز پڑھوں اور ایکسر سائز کروں مگر ایسا ہوتا نہیں دیر سے آنکھ کھلتی ہے پھر دل چاہتا ہے کہ جلدی سے تیار ہو کر آفس چلا جاؤں۔"

13 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"
"اپنے ہونٹ۔"

14 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"

15 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"بے صبرا ہو جاتا ہوں۔"

16 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"میری حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ کسی سے شیئر نہ کروں لیکن اگر کبھی کرتا بھی ہوں تو اپنے ایک دوست سے۔"

17 "کوئی گہری نیند سے بیدار کر دے تو؟"
"دل چاہتا ہے کہ اگر وہ چھوٹا ہے تو تھپڑ ماردوں اور کوئی بڑا ہو تو کہوں کہ آپ نے مجھے کیوں جگایا۔"

18 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"
"چہرے کی معصومیت یا کرختگی۔"

19 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"کہ اللہ نے مجھے بہت خوب صورت بنایا ہے۔"

20 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتے ہیں؟"
"جب میں اپنی تمام تر کوشش کر کے کوئی کام کروں اور [illegible]"

[illegible] واقعہ ہوتا ہے۔"

21 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"کتاب پڑھنے کے لیے یعنی مطالعے کے لیے۔"

22 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"دعوا تو بہت سے لوگ کرتے ہیں۔"

23 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتے؟"
"اللہ کا شکر ہے کہ میں نے تو جو دعا مانگی اللہ نے قبول کی۔"

24 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
"میرے دادا جان۔"

25 "جب آپ پہلی مرتبہ نیا قلم استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"
"دستخط [illegible]"

26 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر شرمندگی محسوس کرتے ہیں؟"
"غصے میں کسی کو [illegible] اور غصہ اترنے کے بعد ندامت محسوس کرتا ہوں۔"

27 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"ہاں جی چھوڑا اور پھر انتظار کیا کہ کوئی مجھے منائے اور کھانا کھلائے۔"

28 "کبھی سوچا کہ آپ چند سال بعد کہاں ہوں گے؟"
"جہاں اب ہوں اس سے کہیں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوں گا۔"

29 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"اپنی امی کے ہاتھ کا۔"

30 "آپ کا پسندیدہ ناشتہ؟"
"پراٹھا اور ساگ۔"

31 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی میری بات نہ مانے۔"

32 "ملک میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے۔"
"ایجوکیشن کا پھیلاؤ بہت ضروری ہے۔"

33 "پسندیدہ ٹی وی چینلز؟"
"[illegible]"

34 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ مرد یا خواتین۔"
"مرد بھروسے کے قابل زیادہ ہوتے ہیں۔"

35 "کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟"
"جی بالکل بدل سکتی ہے۔"

36 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں۔"
"میں اپنے غصے پہ قابو پانا چاہتا ہوں۔"

37 "قسمت پر کتنا یقین ہے؟"
"بہت زیادہ۔"

38 "ایک سوال جو خدا سے روزانہ کرتے ہیں۔"
"کہ یا اللہ مجھے دنیا اور آخرت میں عزت عطا کرنا۔ یہی دعا روزانہ مانگتا ہوں سوال نہیں کرتا۔"

39 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"
"جی بالکل ہوئی' مجھے اپنے معاملات کو سمجھنے کی اللہ نے بہت صلاحیت دی ہے۔ میں خطرات سے آسانی سے نکل

آتا ہوں۔"

40 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ کوئی مجھے پانی کا گلاس پلادے کوئی مجھے چائے کا پوچھ لے۔"

41 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"بالکل نہیں لگتا۔"

42 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں ہے؟"

"سیاسی تقریبات میں جانا پسند نہیں۔"

43 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"انٹرنیٹ۔"

44 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"کبھی خود کو بچانے کے لیے بھی دوسروں کو خوش کرنے کے لیے بھی۔"

45 "تہوار جو شوق سے مناتے ہیں۔"

"عیدین۔"

46 "آپ کی فیلڈ میں کوئی بڑی برائی کیا ہے؟"

"ایک ہی برائی ہے اور وہ یہ کہ لوگ ایک دوسرے سے جیلس بہت ہوتے ہیں۔"

47 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں۔"

"کمرے کی صفائی کرکے۔ کیونکہ میں۔ اپنے کمرے کی چیزوں کو چھیڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

48 "موبائل فون پر آپ کے تاثرات؟"

"موبائل فون کی وجہ سے میں نے اپنی زندگی کا بہت قیمتی وقت ضائع کردیا۔"

49 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"زندگی ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔"

50 "ایک سوال انٹرویو کا جو برا لگتا ہے؟"

"نہیں کبھی کوئی سوال برا نہیں لگا۔"

51 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"

"میں بہت خوش ہوں گا اور سوچوں گا کہ کب وہ مجھ سے کہے کہ آپ مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔"

52 "سارے دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"

"مجھے تہجد کا وقت بہت پسند ہے۔"

53 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"جب محنت کروں اور رزلٹ میری توقع کے مطابق آجائے تو خوشی سے چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے۔"

54 "غصے کی حالت میں کس پر چیختے ہیں؟"

"جو سامنے آجائے۔"

55 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"

"جب میں نے گورنمنٹ جاب جوائن کی۔"

56 "زندگی میں کس کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"مجھے اپنے دادا جان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

57 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"ہر نصیحت بری لگتی ہے۔"

58 "ایک رشتہ جس نے دکھ دیا؟"

"بہت سے رشتے ہیں اور لگتا ہے کہ اب رشتے سکھ دینے کا نام نہیں رہے۔"

59 "غصہ کن باتوں پر آتا ہے؟"

"جب مجھے کوئی کام نہ کرنے دیا جائے اور میرا دل چاہ رہا ہو اس کام کو کرنے کو۔"

60 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"

"پانچ روپے۔"

61 "اپنی کن باتوں پر کنٹرول نہیں۔"

"کوئی بات غلط ہو رہی ہو تو اس پر خاموش رہنا میرے کنٹرول میں نہیں۔"

62 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"نہیں محبت بہت بار ہو سکتی ہے۔"

63 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

64 "پسندیدہ صحافی؟"

"کامران خان، سہیل وڑائچ۔"

65 "ایک انوکھی خواہش؟"

"کہ میں [illegible] کروں۔"

66 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی ہوتی ہے؟"

"نادانی۔"

67 "گھر والوں کی کس بات پر موڈ آف ہو جاتا ہے؟"

"جب میں کچھ خریدنے لگوں اور مجھے کہہ دیا جائے۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

68 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتے ہیں؟"

"جن چیزوں پر دل آجائے۔"

69 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔"

"کوئی کسی بھی قسم کا سامان بیچنے والے کو دیکھ لوں تو سوچتا ہوں کہ کیا یہ دن میں اتنا کما لیتے ہوں گے کہ ان کا گزارا ہو سکے۔"

70 "کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

"گاڑی کے بغیر۔"

71 "کس شخصیت کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

"والدین کے بغیر۔"

72 "گھر میں کس سے خوفزدہ رہتے ہیں؟"

"[illegible]"

73 "اپنی وہ کوئی اور بری عادت بتائیں؟"

"[illegible] جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

74 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں۔"

"صبح الصبح۔"

75 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"

"پھر سو جاتا ہوں۔"

76 "پاکستان کو درپیش مسائل سے کس طرح نکالا جا سکتا ہے؟"

"جب تک ہمارے رہنما ہمارے جیسے نہیں ہو جاتے جب تک وہ خاص رہیں گے اور ہم عوام رہیں گے مسائل حل نہیں ہوں گے۔"

77 "ایک شام اپنی کس پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں؟"

"میری کبھی خواہش تھی کہ میں ممتاز مفتی کے ساتھ ایک شام گزاروں مگر وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

78 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"امریکہ اور جاپان۔"

79 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ کیا کہتے ہیں؟"

"اللہ۔"

80 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں لیتے ہیں؟"

"کبھی نیند میرے لیے قابل رشک ہوتی تھی مگر اب دیر سے آتی ہے۔"

81 "انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت؟"

"ماں کا روپ۔"

82 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل۔"

"چٹائی۔"

83 "آپ کا ذریعہ معاش؟"

"میری جاب۔"

84 "کون سے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"

"Exactly" اور "چلے چلو"

85 "خواتین کب بری لگتی ہیں؟"

"جب وہ غیر مہذب ہو جاتی ہیں۔"

86 "پیسے کس شکل میں جمع کرتے ہیں؟"

"پیسہ جمع نہیں کرتا، خرچ کر دیتا ہوں۔"

87 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟"

"کسی نہ کسی ایسے انسان کو ضرور قتل کرتا جس نے اسلام کو نقصان پہنچایا ہے۔"

88 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"

"کتابیں۔"

89 "ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"

"گھر والے میری ہر بات پہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔"

90 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی۔"

"اپنے لیے گاڑی (کار) خریدی۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"میرا خیال ہے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ مجھے مشہور ہونے کا شوق نہیں ہے۔"

☼

غزل ثوبان

بیان

سعدیہ امام ٹیلی ورژن کی میرا ہیں جنہیں بولتے ہوئے پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک مارننگ شو میں وہ کہتی نظر آئیں۔

"مجھے گھر والوں کی جانب سے صرف ٹی وی پر کام کی اجازت ملی ہے۔ اپنے والد کی میں حکم عدولی کیسے کر سکتی ہوں؟ اس لیے سلور اسکرین پر آنا میری قسمت میں نہیں لکھا۔ (قسمت اپنی جگہ آپ کی نیت اور ارادہ کیا ہے؟) جہاں تک سوال میری شادی کا ہے تو گھر والے اس سلسلے میں مصروف ہیں۔ جب اللہ کی مرضی ہوئی اور بہتر رشتہ ہوا تو شادی کر لوں گی۔ اب شادی کے بعد میری بہن عالیہ اور دونوں بھائی الگ الگ گھروں میں مقیم ہیں۔ میں اس صورت حال میں بہت خوش ہوں۔"

عزت افزائی

راحت فتح علی خان بھی خوب ہیں بھارت سے اپنی "عزت افزائی" کروا کر آئے اور پھر دیوانہ وار گانے کے لیے بھارت جاتے ہیں، سننے میں آیا ہے کہ انڈین پریمیئر لیگ کی ٹیم کولکتہ نائٹ رائڈرز کے آفیشل گیت کے لیے راحت کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ (راحت کے بغیر بھارت والوں کا گزارا جو نہیں ہوتا۔) اس گانے میں کولمبین گلوکارہ شکیرا بھی ان کی ہمنوا ہوں گی۔ وہ نا صرف راحت کے ساتھ آواز کا جادو جگائیں گی بلکہ گانے کی ویڈیو میں رقص کرتے ہوئے بھی نظر آئیں گی۔ اب شیو سینا والے کتنا بھی شور مچائیں، راحت فتح علی کی مقبولیت کے سامنے مجبور ہیں۔

حسد

پرنس چارلس نے تو کمیلا پار کر کے لیے بادشاہت چھوڑ دی اور قرعہ فال نکلا لیڈی ڈیانا کے فرزند پرنس ولیم کے نام جو ان دنوں زور و شور سے اپنے والد محترم کے ساتھ مل کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

یہ شادی 29 اپریل کو طے ہے۔ اس حوالے سے برطانیہ میں دلچسپ سروے کیا گیا۔ جس میں "تقریباً" 18 فیصد دوشیزاؤں نے یہ تسلیم کیا کہ پرنس ولیم کی ہونے والی دلہن کیٹ مڈلٹن سے حسد محسوس ہوتا ہے۔ 10 فیصد نے یہ کہا کہ اب بھی انہیں کیٹ مڈلٹن پر رشک آتا ہے۔ جبکہ 90 فیصد لڑکیوں کا کہنا تھا کہ کیٹ کی آئندہ زندگی بے حد مشکل ہوگی جس میں ان کی ذاتی زندگی کا سکون بری طرح متاثر ہوگا۔ "غالباً" سب لڑکیوں نے ڈیانا کی زندگی سے سبق سیکھ لیا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ سچ ہے پیسے اور اقتدار سے سب کچھ نہیں خریدا جا سکتا۔

کامیابی

آصف رضا میر منجھے ہوئے اداکار ہیں۔ ٹی وی اور فلم میں بام عروج دیکھا پھر اچانک منظر سے غائب ہو گئے۔ اب "تقریباً" ہر چینل پر نظر آنے کے ساتھ ذاتی پروڈکشن ہاؤس بھی چلا رہے ہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں۔ "میں کاروبار اور نجی مصروفیات کے سلسلے میں عرصہ بیس سال ملک سے باہر رہا۔ لیکن ہر وقت ایسا لگتا جیسے میری صلاحیتیں درست انداز میں استعمال نہیں ہو پا رہیں۔ بس میں نے "فوراً" ہی فیصلہ کیا کہ مجھے انہیں مزید ضائع کرنے کے بجائے واپس آ کر استعمال میں لانا چاہیے۔ میرے خیال میں آج بھی ہمارے ڈرامے پوری دنیا میں اسی طرح پسند کیے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں اچھے ٹیلنٹڈ فنکاروں کی کمی نہیں۔ آج بھی ماریہ واسطی، جویریہ عباسی، نعمان اعجاز، فیصل قریشی کچھ منفرد کر کے دکھا رہے ہیں۔ جہاں تک سوال میری ذاتی زندگی کا ہے تو میں نے جسے چاہا اسے ہی اپنا شریک سفر بنایا اور آج بھی میری تمام خوشیاں اپنے خاندان کے گرد ہی گھومتی ہیں۔" (اسے کہتے ہیں خوش بختی)

تقریب رونمائی

گزشتہ دنوں مورخہ 24 فروری کو مقبول مصنفہ سندس جبین کی کتاب "اس کار جنوں میں" کی تقریب رونمائی بڑے باوقار طریقے سے انجام پائی۔ تقریب کا انعقاد ان کے ادارے ملت سائنس کالج کی طرف سے کیا گیا۔ سندس جبین انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رہی ہیں اور سال اول کی طالبہ ہیں۔

ادارے کے چیئرمین عظمان رشید صاحب نے

سندس جبین کو محض بیس سال کی عمر میں صاحب کتاب ہونے پر خصوصی مبارک باد پیش کی اور اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

سندس جبین نے اپنی کتاب کے مرکزی خیال، محرک اور نوعیت پر بڑے خوب صورت اور پُراثر انداز میں بات کر کے حاضرین سے داد وصول کی۔ عظمان رشید کی طرف سے سندس جبین کو کیش پرائز پیش کیا گیا۔

یہ بیان کالمانہ

☆ ہمارے وزیراعظم 30 مارچ کو بھارتی پنجاب کے شہر موہالی تشریف لے گئے۔ وہ سارا دن بھارت کی سیاسی قیادت کے ساتھ رہے۔ ہمارے وفد کے لوگ اس دن بھارتی لیڈر شپ کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سونیا گاندھی نے اس دن معمولی سی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ سارا دن اسی لباس میں رہیں۔ من موہن سنگھ کا لباس بھی سادہ بلکہ غریبانہ تھا' ان کے وزرائے اعلا بھی دھوتی کرتے میں ملبوس جبکہ ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اس دن تین بار اپنے

امپورٹڈ سوٹ تبدیل کیے اور ان میں سے ہر سوٹ یقیناً "لاکھوں روپے" مالیت کا ہوگا۔

(زیرو پوائنٹ۔۔۔ جاوید چودھری)

☆ مقدمے کی ازسرِنو سماعت نے بھٹو صاحب کو شاید قبر میں بھی بے چین کر دیا ہوگا۔ مرحوم رہنما کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے گا کہ عدالت میں ان کا دفاع کرنے والا کوئی اور نہیں بابر اعوان ہے جس کی سیاست کا آغاز ہی بھٹو دشمنی سے مزین ہے۔ (ایاز امیر' جنگ)

☆ عدالتوں کو بے نظیر بھٹو کی جعلی وصیت کا بھی جائزہ لینا چاہیے جو وصیت اخبارات میں شائع ہوئی ہے اس میں انگریزی گرامر کی فاش غلطیاں ہیں۔ انگریزی کی ایسی غلطیاں بے نظیر سے منسوب نہیں کی جاسکتیں۔ وہ تو خواب بھی انگریزی میں دیکھتی تھیں۔ (سب جھوٹ۔ ام جلیل)

☆ چارلس ڈارون نے یہ نہیں کہا تھا کہ طاقتور یا ذہین ترین مخلوق اپنی بقا کو یقینی بنا سکتی ہے۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ زندگی کی دوڑ میں وہی نسلیں باقی رہتی ہیں جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنی روش تبدیل کرتی ہیں۔ (دی گلوبسٹ ڈاٹ کام)

☆ انسانی حقوق کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے تین ماہ میں کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے نتیجے میں 273 سیاسی کارکن اور 301 دیگر شہری ہلاک ہوئے۔ (عبداللہ طارق سہیل)

☆ چوہدری شجاعت لال مسجد میں آرمی ایکشن سے پہلے وزیراعظم شوکت عزیز سے ملنے گئے اور انہیں سمجھانا چاہا تو جواب ملا کہ "میں اپنی بیوی کے ساتھ قلفیاں کھانے جا رہا ہوں۔" انہیں جامعہ حفصہ کے خون سے کوئی دلچسپی نہیں تھی انہیں پتا تھا کہ جب لال مسجد کا خون پکارے گا تو وہ ملک سے باہر جا چکے ہوں گے اور لوٹی ہوئی دولت کے انباروں پر بیٹھ کر عیش کر رہے ہوں گے۔ (صبح بخیر۔۔۔ ڈاکٹر صفدر محمود)

کچھ یادیں کچھ باتیں

حسن سومرو

شاہین رشید

ابتدائی زندگی :-

میرا نام "حسن مراد" ہے' جو کہ میری والدہ محترمہ اور میری خالہ نے رکھا اور اس نام پر والد صاحب اور گھر کے دیگر افراد نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں 1972ء میں پیدا ہوا' میرے والد کا تعلق سندھ سے اور والدہ کا تعلق ہندوستان سے ہے یعنی اردو اسپیکنگ' اور گھر میں سندھی کم اور اردو زیادہ بولی جاتی تھی' جس کی وجہ سے میری زبان بھی بہت شستہ ہے۔ میرے والد فیڈرل گورنمنٹ میں منسٹری آف لیبر میں ڈائریکٹر تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم چار بھائی ہیں اور سب بھائی ماشاءاللہ سے اپنی اپنی فیلڈ میں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

میرا بچپن بہت اچھا گزرا۔ مجھے بچپن میں ممی' پاپا کے علاوہ پھوپھیوں کا بھی بہت پیار ملا۔ کہتے ہیں کہ بیٹیاں' باپ کے اور بیٹے' ماں کے قریب ہوتے ہیں' لیکن میں ماں سے زیادہ اپنے باپ کے قریب تھا' اور ان کے سائے میں میرا بچپن شرارتیں کرتے اور من مانیاں کرتے ہوئے بہت اچھی طرح گزرا۔ شرارتی بہت زیادہ تھا اور اکثر ایسی شرارتیں کر جاتا تھا کہ میری وجہ سے میرے بڑے بھائی کو ڈانٹ اور کبھی مار بھی پڑ جاتی تھی اور پھر بعد میں ان سے معذرت بھی کر لیتا تھا۔

مہمان گھر آتے تو ان کو بھی بہت پریشان کرتا تھا۔ اب بیچارے مہمان چونکہ ہمارے گھر آئے ہوئے ہوتے تھے۔ لہٰذا مجھے تو کچھ نہیں کہتے تھے' لیکن یقیناً" وہ پریشان ہوتے ہوں گے' کیونکہ بعد میں مجھے ڈانٹ پڑتی تھی کہ تم نے مہمانوں کو تنگ کیوں کیا۔ بس میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ بچپن ہی کیا کہ جس میں شرارتیں نہ کی جائیں۔ شرارتوں کے بغیر بچپن ادھورا لگتا ہے۔

میں پڑھائی میں بہت اچھا تھا۔ کہتے ہیں کہ جو زیادہ شرارتی ہوتا ہے وہ اتنا ہی ذہین بھی ہوتا ہے اور شاید میرے ساتھ بھی ایسا تھا۔ اللہ نے مجھے بہت اچھا ذہن

دیا تھا۔ میری تمام تر تعلیم کراچی میں ہوئی۔ میں نے میٹرک کا امتحان حبیب پبلک اسکول سے کیا۔ پھر ڈی جے سائنس کالج سے انٹر کیا۔ میری خواہش تھی کہ میں پائلٹ بنوں اور اسی وجہ سے میٹرک کے بعد میں ایئر فورس جوائن کرلی اور ٹیسٹ دیا تو اس میں بھی کامیابی حاصل ہوئی۔ 80 فیصد سے زیادہ نمبرز حاصل کیے۔ مگر میری بدقسمتی کہ جس عمر کے لڑکوں کی ضرورت تھی اس پہ میں پورا نہیں اترتا تھا۔ یعنی صرف دس دن چھوٹا تھا۔ بس اسی وجہ سے میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

چنانچہ پھر ڈی جے کالج میں داخلہ لیا' انٹر کیا اور پھر انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا۔ مگر تین مہینوں کے بعد ہی واپس آگیا کیونکہ میرا وہاں دل نہیں لگا۔

پاکستان آکر کامرس کالج میں داخلہ لیا۔ اور بی کام اچھے نمبروں سے پاس کیا اور اس کے بعد ایس ایم لاء کالج سے لاء کی ڈگری حاصل کی۔ چونکہ پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ اس لیے کچھ شارٹ کورسز کیے اور پھر ایم بی اے بھی کرلیا۔

اسکول سے زیادہ کالج کی لائف مزے دار ہوتی ہے۔ اور میری کالج کی لائف بہت اچھی گزری۔ ہمارے دوستوں کا ایک خاص گروپ تھا جو شرارتوں میں کافی مشہور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارا گروپ کلاس میں سب سے آخر لائن میں بیٹھا کرتا تھا جو دروازے کے قریب ہوتی تھی۔ اور جب سر کا لیکچر شروع ہوتا تھا تو دس' پندرہ منٹ کے بعد ہمارا پورا گروپ کلاس سے غائب ہوجاتا تھا' اور مزے کی بات کہ اکثر پکڑے بھی جاتے تھے۔ مگر چونکہ میں گیم اور پڑھائی دونوں میں اچھا تھا' اس لیے مجھے زیادہ ڈانٹ نہیں پڑتی تھی۔ مگر دیگر دوستوں کی شامت آجاتی تھی۔

گیم کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے ہاکی بھی کھیلی ہے "کالج لیول پہ اور اسکول کے زمانے میں' میں ایک بہت ایتھلیٹ تھا اور مجھے گولڈ میڈل بھی مل چکا ہے اور چونکہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گیمز میں بھی اچھا تھا تو اساتذہ مجھے بہت چاہتے تھے اور میری چھوٹی موٹی شرارتوں اور غلطیوں کو معاف کردیا کرتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا سب سے خوب صورت دور طالب علمی کا دور ہوتا ہے اور خاص طور پر کالج لائف تو بہت ہی خوب صورت ہوتی ہے۔ شاید جوشِ جوانی کا دور ہوتا ہے۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ ڈھیر ساری کامیابیاں سمیٹ لیں اور کوئی ایسا کام کریں کہ جو سب سے منفرد ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں کی گئی جدوجہد آگے بہت کام آتی ہے۔ کیونکہ نوجوانی کی طاقت انسان کو تھکنے نہیں دیتی' اور آج جو میں ماشاء اللہ اتنی اچھی اور خوش حال زندگی گزار رہا ہوں یہ اسی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ جو میں نے نوجوانی کے دور میں کی۔ میں آج کل کی نسل کو بھی یہ ہی کہوں گا کہ یہ ہی وقت ہے کہ آپ محنت کریں اور پھر پالیں۔ پھر ساری زندگی عیش میں گزاریں۔

پریکٹیکل لائف :۔

پریکٹیکل لائف میں آیا تو والد صاحب نے نصیحت کی ایمان داری اور محنت سے کماؤ اور جو کماؤ اسے دوسروں پر خرچ کرو مگر اپنے اوپر زیادہ خرچ کرو۔ اچھا پہنو' اچھا کھاؤ' پیو اور ہاں بچت ضرور کرو' کیونکہ کل کیا ہونے والا ہے تمہیں کچھ پتا نہیں۔ پھر یہ ہی بچت انسان کے کام آتی ہے۔

پریکٹیکل لائف میں آیا تو اس وقت ہاکی کا پلیئر تھا اور پروفیشنل ہاکی کھیلتا تھا اور اس کی بدولت پی آئی اے جوائن کی اور پھر ساری دنیا کی سیر کی۔ مگر پھر ہاکی میں سیاست آگئی تو میں نے ہاکی کو خیرباد کہہ دیا۔ حالانکہ پی آئی اے سے اچھی خاصی تنخواہ ملتی تھی۔ دنیا جہاں کی سیر بھی ہوجاتی تھی اور جہاں جاتے تھے وہاں کا تمام خرچ بھی مل جایا کرتا تھا۔ لیکن ہاکی والوں کے ساتھ جو سلوک شروع ہوگیا تھا' اس سے میں بہت بددل ہوگیا تھا۔ ورنہ جاب تو بہت اچھی تھی۔ پی آئی اے کو چھوڑا تو اپنے دوست کی ایک سیکیورٹی کمپنی میں جاب کرلی۔ بحیثیت سیکیورٹی مینجر کے۔ تقریباً" سال چھ مہینے کام کرنے کے بعد میں نے اپنی سیکیورٹی کمپنی کھول لی اور پھر جو اپنے کام کا مزہ آیا تو اس کا کچھ اور ہی مزہ تھا۔

اپنے کام کے ساتھ ساتھ میں ٹی وی ڈراموں میں بھی کام کرنے لگا' ماڈلنگ بھی' اداکاری' بہت کچھ کیا' لوگوں میں ایک پہچان' ایک شناخت بنی۔ پھر ایک ایسا موڑ آیا کہ میں نے شوبز کو چھوڑ دیا۔ اور وہ موڑ یہ تھا کہ میرے بہت ہی پیارے مجھے ہر دم چاہنے والے میرے والد ہم سب کو روتا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ میرے لیے ایک ایسا صدمہ تھا کہ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں نے اسے برداشت کیسے کیا۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ خاص طور شوبز میں تو بالکل بھی نہیں۔ پھر سب نے مجھے سمجھایا کہ ایسے کب تک چلے گا۔ زندگی ایسے نہیں گزرتی لوگوں کی بات دل کو لگی اور میں ہمت کرکے پھر سے شوبز میں آیا اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف کرلیا اور مصروف کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں بہت جلد ڈپریشن سے باہر نکل آیا اور کام میں میرا دل لگنے لگا۔

مزاج :۔

کم عمری میں بہت خوش مزاج تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ غصے میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر شاید ہر عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب پریکٹیکل لائف میں آیا تو مزاج میں تبدیلی آتی گئی اور غصہ میری زندگی سے تقریباً" ختم ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کامیاب انسان وہ ہی ہے جو اپنی غلطیوں کو محسوس کرکے انہیں دور کرنے اور ان سے سبق سیکھنے کی کوشش کرے اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔ میری زندگی میں بھی نشیب و فراز آئے۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری' بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یوں زندگی میں کامیاب ہوا۔

شادی :۔

میری شادی کے بارے میں تو آپ سب کو پتا ہے کہ معروف ٹی وی آرٹسٹ نازلی نصر میری بیوی ہے۔ ہماری پسند کی شادی ہے۔ جس کالج میں' میں پڑھتا تھا

وہ بھی اسی کالج میں تھی۔ ایک فیشن شو میں ہم دونوں نے حصہ لیا۔ دو' چار ملاقاتوں کے بعد ہی احساس ہوگیا کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ بس پھر شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ سسرال بھی بہت اچھا ملا۔ محبت کرنے والے' خیال کرنے والے' اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے بھی نوازا ہوا ہے۔ میں ہر لحاظ سے ایک خوش قسمت انسان ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ نوازا ہوا ہے۔

فارغ اوقات :۔

فرصت کے لمحات کم ہی ملتے ہیں۔ مل جائیں تو فیملی کے ساتھ گھومنے پھرنے میں مزہ آتا ہے۔ یا شاپنگ پہ چلے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر میں فضول خرچ ہوں۔ والد صاحب کے فلسفے پہ عمل کرتا ہوں کہ اچھا کماؤ تو پھر اچھا کھاؤ پیو بھی اور میں نے یہ بات بھی نوٹ کی ہے کہ خرچ کرو تو پھر اللہ تعالیٰ دیتا بھی ہے اور ویسے بھی انسان کماتا کس لیے ہے' کما کر خرچ کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

مذہب کے میں بہت قریب ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ کم سے کم نمازیں قضا ہوں۔ اور انسانیت کا مذہب اپناؤں اور اپنے رویے سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤں۔

خیزران......ذوالفقار ارشد گیلانی

تاریخ کے صفحات میں بادشاہوں کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ حکومتیں ان کے نام سے کانپتی تھیں لیکن حسین و جمیل خواتین کے سامنے یہ سب سرنگوں نظر آتے ہیں۔

مؤرخین اسلامی تاریخ کے سب سے طویل ترین سلسلہ بادشاہت یعنی خلافت بنو عباس کے تیسرے خلیفہ محمد المہدی عباسی (اکتوبر 774ء جولائی 785ء بہ مطابق کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کرتے ہیں جو ایک عظیم سلطنت کا مالک و مختار ہونے کے باوجود ایک حسین عورت کا غلام تھا۔

مہدی خلیفہ ضرور تھا لیکن اصل حکومت خیزران کی تھی۔ جو شوہر کے علاوہ اپنے دونوں خلیفہ بیٹوں کے فیصلوں پر بھی بری طرح اثر انداز ہوتی رہی۔

بعض مؤرخین خیزران کو ایک کینہ پرور، لالچی اور خود غرض ملکہ کا خطاب بھی دیتے ہیں کیونکہ اسے صرف اپنی دولت میں اضافے اور احکامات پر عمل درآمد کے علاوہ کسی اور شے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس نے شوہر سے ضد کرکے اپنے بڑے بیٹے کو ولی عہد کا منصب کسی اور سے چھین کر دلوایا تھا۔ اسے توقع تھی کہ بیٹا اس "احسان" کی لاج رکھے گا اور اس کا حکم بدستور خلافتِ بنو عباس پر چلتا رہے گا۔ لیکن خلیفہ بیٹے نے ایک مرحلے پر خیزران کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اس نے از خود اپنے "لاڈلے" بیٹے کی موت کی سازش تیار کی۔ جب بیٹے کے مرنے کی اطلاع اسے پہنچائی گئی تو اس نے باقاعدہ خوشی کا اظہار کیا۔ چنانچہ تاریخ نگاروں نے خیزران کو "ایک ظالم ماں" کا خطاب دیا ہے۔

اصلاً" اور نسلاً" ہاشمی ہونے کے دعوے دار 37 عباسی خلیفہ مسند اقتدار پر بیٹھے جن میں سے صرف تین خلیفہ اعلا حسب نسب کی حامل عورتوں کے بطن سے تھے۔ ان میں سے بھی صرف امین الرشید (ملکہ زبیدہ بنت جعفر کے بطن سے) نجیب الطرفین ہاشمی تھا جبکہ باقی تمام لونڈیوں، کنیزوں یا داشتاؤں کی اولادیں تھیں۔

خیزران بھی خلفہ کا دل بہلانے کے لیے لائی جانے والی بے شمار و بے حساب لونڈیوں میں سے ایک تھی۔

جب خیزران محمد بن منصور کی زندگی میں داخل ہوئی تو وہ ولی عہد تھیں تھا [illegible] مہدی کا خطاب اسے مل چکا تھا اور وہ شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی ربطہ پہلے عباسی خلیفہ ابو العباس السفاح کی بیٹی [illegible] اس کی چچا زاد تھی لیکن ربطہ سے اسے کوئی خاص شغف یا دلچسپی نہ تھی بلکہ مہدی نے اپنے محل میں درجنوں طرح دار اور خوب صورت لونڈیاں رکھ چھوڑی تھیں جن کے حسن و جمال میں وہ ہر وقت مگن رہتا۔

تاریخ نگاروں نے اس کی وجہ مہدی کی آوارگی کو نہیں ربطہ کی "مردانگی" کو قرار دیا ہے۔ جسے محض باپ کے حکم کی تعمیل سمجھ کر اس نے قبول کر لیا کیونکہ اس کا باپ منصور، ربطہ کو بے حد چاہتا اور پسند کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ربطہ مستقبل کی ملکہ بنے۔

لیکن چچا کی چاہت و شفقت کے باوجود ربطہ اپنے شوہر کی منظورِ نظر نہ بن سکی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ دلکشی اور رعنائی سے عاری اور بھاری بھرکم جسم کی مالک تھی۔ روایت ہے کہ اس کا بھائی محمد بن ابی العباس سخت کوش اور بے پناہ ورزش کا عادی تھا۔ ربطہ ورزش میں بھائی کے ساتھ شریک ہوتی۔ محمد بن ابی العباس لوہے کا ایک گرز اس کی طرف اچھالتا، وہ اسے اچک کر پکڑتی اور پھر اس کی طرف واپس پھینک دیتی۔

مہدی نے نہایت حسین و جمیل اور پری پیکر دوشیزائیں محل میں جمع کر رکھی تھیں تاکہ اپنی بھدی اور بے ڈھب بیوی سے دور رہ سکے.... اور خیزران ان سب میں اعلا وارفع تھی۔

مہدی نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں خیزران سے شادی نہیں کی جبکہ اس کے دونوں بیٹے یعنی موسیٰ اور ہارون اس کے خلیفہ بننے سے پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے۔

جب ان کی شادی ہوئی تو مہدی کو مسند خلافت پر بیٹھے دو سال ہو چکے تھے جبکہ شادی کے وقت خیزران کی عمر 37 سال تھی اور وہ اپنا بھرپور شباب بہ حیثیت لونڈی گزار چکی تھی۔

مہدی نے اسے وہی مرتبہ و مقام عطا کیا جو اس کی خاندانی [illegible] تھا۔ گو اس [illegible] ربطہ بھی ایک [illegible] (بعد میں علی بن ربطہ کے نام سے شہرت ملی) لیکن خیزران کے رعب، دبدبے اور دلعلیے میں بے حد اضافہ ہو گیا۔

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خیزران اور ربطہ روایتی سوکنوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے مقابل آگئیں۔ دونوں میں نہ ختم ہونے والی نفرت، حسد اور بیزاری پیدا ہو گئی۔ اس کی ایک [illegible] ربطہ کا خود کو برتر و عظیم سمجھنا بھی تھا۔ وہ نسلاً" ہاشمی تھی اور اسی رتبے کی متقاضی بھی۔ اس کا سماج، خاندان اور مرتبہ بہرطور خیزران سے بلند بلکہ اس کی ضد تھا۔ لیکن شوہر کا رجحان ایک کم نسل عورت کی طرف زیادہ اور خاندانی بیوی کی طرف کم تھا۔

اپنی حیثیت کے زعم میں ربطہ خصوصاً" ان عورتوں کو بالکل منہ نہ لگاتی تھی جو اس کے شوہر کی خلوت میں دخل رکھتی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس خیزران چونکہ حقیقتاً" فرش سے اٹھ کر عرش تک پہنچی تھی اس لیے وہ سب کی نہ صرف خاطر مدارات کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ربطہ محل میں غیر مقبول، غیر معروف اور تنہا ہو گئی جبکہ خیزران نے سب کی توجہ اور محبت حاصل کر لی۔

ربطہ نے چند دن تو یہ سب کچھ دیکھا لیکن پھر خود ہی محل کے اندرونی و بیرونی معاملات سے کنارہ کش ہو گئی۔ چنانچہ خیزران نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ شوہر پر حاوی ہوتی چلی گئی اور اسے اپنی خواہشات کا غلام بنا لیا۔

خیزران کو موسیٰ سے بے حد محبت تھی۔ اس نے بیٹے کی پرورش کے لیے دن رات ایک کر رکھا تھا۔ البتہ ایک پریشانی اسے لاحق تھی کہ وہ باندی تھی اور محلوں میں باندیوں کی عمریں ایک مخصوص حد سے زیادہ برداشت نہیں کی جاتی تھیں۔ چنانچہ اسے بھی خدشہ تھا کہ عمر ڈھلتے ہی مہدی کسی اور کو اس کا مقام بخش دے گا۔

لیکن قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی۔ موسیٰ نے ابھی پیروں چلنا شروع نہ کیا تھا کہ اسے اپنے پیٹ میں ایک نئی روح کی موجودگی کا احساس ہونے لگا اور (؟)7ء کے موسم سرما کی ایک شب اس نے ایک اور تندرست اور خوش شکل بیٹے کو جنم دیا، جس کا نام باپ نے ہارون رکھا۔

اب وہ بیٹوں کی ماں تھی جس میں کوئی ایک لازمی طور پر ولی عہد سلطنت ہوتا۔ چنانچہ اب ان خدشات کا خاتمہ ہو گیا جو اسے اپنے مستقبل کے حوالے سے لاحق تھے۔

اسی زمانے میں خلیفہ منصور کے بڑے بیٹے جعفر اکبر (ملکہ زبیدہ کا باپ) کا انتقال ہو گیا چنانچہ اس نے مہدی کو رے سے بغداد بلا بھیجا۔

بغداد میں رہ کر خیزران کی عادات میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ وہ بے انتہا زود حس اور انتہا پسند ہو گئی۔ محبت میں بھی اور نفرت میں بھی۔ محبت کرتی تو سراپا محبت بن جاتی اور بڑی سے بڑی تکلیف بھی بھول جاتی لیکن جب نفرت کرتی تو وحشت و بربریت کی آخری حدوں تک پہنچ جاتی۔ اس کی عادات اور مزاج بنانے میں اس کے شوہر کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اسے

غضب ناک دیکھ کر سہم جاتا اور اس کی ہر بات مان لیتا۔ اس کا کوئی مطالبہ ایسا نہ تھا جو پورا نہ ہو اور کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو ادھوری رہ جائے۔

واقدی کے حوالے سے ایک روایت ہے۔

"ایک روز میں مہدی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے میں نے بعض احادیث سنائیں۔ جنہیں اس نے لکھ لیا پھر اٹھا اور زنان خانے میں چلا گیا۔ ذرا دیر گزری تھی کہ غصے میں بھرا ہوا باہر نکلا۔

میں نے عرض کیا۔ "یا امیر المومنین! مزاج عالی برہم کیوں نظر آرہے ہیں؟"

مہدی نے جواب دیا۔ "میں خیزران کے پاس گیا تھا۔ وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ اس نے میرے کپڑے پکڑ کر کھینچے اور انہیں تار تار کر دیا اور کہنے لگی، جب سے تیرے یہاں آئی ہوں، میں نے اے خاکروب! تجھ سے کوئی بھلائی نہیں پائی!۔۔۔ حالانکہ خود میں نے اسے نخاس سے خریدا تھا۔ اللہ تجھے غارت کرے اے واقدی! بتا کیا میں خاکروب ہوں؟"

خیزران کی اس حرکت اور خلیفہ کے ردِ عمل سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کون کس پر حاوی تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مہدی، خیزران کو دیکھ کر یوں مؤدب ہو جایا کرتا تھا جیسے خیزران خلیفہ ہو اور وہ خود اس کا کوئی تیسرے درجے کا مصاحب!

خیزران کو مال و دولت جمع کرنے کی ہوس اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اپنے آخری زمانے میں وہ اپنے عہد کی سب سے مالدار عورت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت فیاض اور سخی بھی تھی۔

آخری اموی خلیفہ مروان کی بیوی مزنہ نہایت عسرت و تنگ دستی کے عالم میں، بھوک و پیاس سے نڈھال، ایک دن خیزران کے پاس حاضر ہوئی۔ جب اس کے پاس ہاشمی خاندان کی بعض اور عورتیں بھی موجود تھیں۔ انہوں نے مزنہ کو نہ صرف پہچان لیا بلکہ اسے ذلیل و رسوا کر کے محل سے نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن خیزران کا دل اس کی حالت دیکھ کر بھر آیا۔ وہ یہ دیکھ کر آزردہ خاطر ہو گئی کہ کل کی ملکہ آج ایک بھکارن کی صورت میں اس کے دروازے پر آئی ہے۔

اس نے ہاشمی خواتین کے طنز و تشنیع کی پروا کیے بغیر کنیزوں کو محل میں اس کے لیے آرام و آسائش سے بھرپور ایک کمرا تیار کرنے کا حکم دیا اور تسلی تشفی دے کر مزنہ کو وہاں بھیج دیا۔ کہتے ہیں کہ جب مہدی گھر آیا تو اس نے یہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ اسے سنایا تو مہدی کی آنکھیں بھی نم آلود ہو گئیں، کہنے لگا۔

"اگر تم نے مزنہ کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا ہوتا تو میں تم سے کبھی بات نہ کرتا۔"

یوں مروان کے قتل کے بعد چھن جانے والا عیش و آرام مزنہ کو دوبارہ مل گیا اور وہ اپنی موت تک شاہی محل میں خیزران کی مہمان خاص کی حیثیت سے مقیم رہی۔

خیزران چونکہ خلیفہ کے ہاتھ ولی عہد کے لیے فروخت ہوئی تھی اس لیے قدرتی طور پر وہ ان شعبوں میں دوسری کنیزوں سے زیادہ اہل رہی ہو گی۔ لیکن امورِ مملکت میں اس نے جو فیصلے کیے انہیں پرکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ غیر معمولی ذہانت، بصیرت اور تدبر کے مسلمہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔

عباسی خاندان کی سب سے بااختیار عورت بننے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یمن میں مقیم اپنے اہلِ خانہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بغداد بلایا جبکہ خلیفہ منصور کے انتقال سے قبل کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ عباسی دار الخلافہ کا رخ بھی کرتا۔

وہ نہایت عسرت زدہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں ان کی ماں، دو بہنیں سلسل اور اسما کے علاوہ انگور کے ایک باغ کی رکھوالی کرنے والا اس کا بھائی عطریف بن عطاء شامل تھے۔ خیزران نے ان کے لیے ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی۔

اب خیزران کا اگلا نشانہ اس کا سوتیلا بیٹا ولی عہد عیسیٰ بن موسیٰ تھا۔ اس نے مہدی کو اس پر بھی قائل کر لیا کہ وہ عیسیٰ کے بجائے اپنے بڑے بیٹے موسیٰ کو اپنا جانشین بنائے۔ مہدی تو خیزران کے سحر میں مبتلا تھا

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور موسیٰ کو ولی عہد بنا کر ہادی کا خطاب دیا۔ اب وہ امیر المومنین کی رفیقۂ حیات اور ولی عہد سلطنت کی ماں تھی۔

وہ دونوں بیٹوں سے محبت کرتی تھی لیکن موسیٰ کی خود سری اور نافرمانی کے باعث اس سے ناراض رہتی تھی۔ البتہ ہارون اس کا مطیع اور فرمانبردار تھا۔ چنانچہ وہ ہارون کو آگے بڑھانے کا کوئی ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ چنانچہ اس نے ہارون کو ولی عہد بنانے کی ضد شروع کر دی لیکن منصور اس پر راضی نہ ہوا۔

باپ کے انتقال کے اٹھارویں دن موسیٰ الہادی خلیفہ کی حیثیت سے بغداد پہنچا اور حالات و واقعات کے تجزیے کے بعد "بھول جاؤ" کی پالیسی اختیار کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف ہونے والی سازش میں خاندان برمکہ کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کا ہاتھ بھی ہے، لیکن اس کی کوشش تھی کہ ماں سے صلح کر لے اور ماضی کے واقعات کو فراموش کر دے۔

لیکن اس نے حسب سابق حکومت معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی۔

ایک روز خیزران، ہادی کے پاس ایک کام کرانے کے لیے آئی۔ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوا لیکن خیزران کا اصرار جاری رہا۔ "یہ کام تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں نہیں کر سکتا۔" ہادی نے جواب دیا۔

خیزران نے کہا۔ "میں، عبداللہ بن مالک (خلیفہ کے محافظ جماعت کا سردار) کی یہ ضرورت پوری کرنے کا وعدہ کر چکی ہوں۔"

ہادی کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ "اللہ اس شخص کو سمجھے، خدا کی قسم، میں آپ کے کہنے سے یہ کام نہیں کروں گا۔"

خیزران نے پر عتاب لہجے میں کہا "خدا کی قسم! اب تجھ سے میں کسی کام کو نہیں کہوں گی۔"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" ہادی نے جواب دیا تو خیزران مارے غضب کے کانپ اٹھی۔ لیکن ہادی نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی۔

"میری بات غور سے سنیے۔" اس نے دوبارہ ماں کو مخاطب کیا۔ "اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری فوج کا کوئی سردار، حاکم یا دربار کا مصاحب آپ کے دروازے پر پہنچا ہے تو اس کا سر قلم کر دوں گا اور سارا مال و متاع ضبط کر لوں گا۔ آخر ہر روز صبح و شام آپ کے دروازے پر لوگ اتنی بڑی تعداد میں کیوں جمع رہتے ہیں۔ آپ کے پاس قرآن نہیں کہ اس کی تلاوت کریں، نہ کوئی گوشۂ عافیت ہے کہ چپ چاپ وہاں وقت گزاریں، خبردار۔۔۔ خبردار۔۔۔ آپ کا دروازہ اب میرے کسی آدمی کے لیے کبھی نہ کھلے۔"

خیزران، ہادی کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہر سکی اور چلی گئی۔ حالت یہ تھی کہ پاؤں رکھ کہیں رہی تھی، پڑ کہیں رہا تھا۔

اس کے بعد ہادی نے اپنے سردارانِ فوج، حکام و عمائدینِ سلطنت اور مصاحبینِ دربار کو طلب کیا اور ان سے پوچھا؟

"کیا تم میں سے کوئی گوارا کر سکتا ہے کہ لوگ اس کی ماں کے بارے میں چرچا کریں۔ کوئی کہے فلاں شخص کی ماں نے یہ کہا اور فلاں آدمی کی ماں نے یہ کہا؟"

"سب لوگوں نے عرض کیا۔ "نہیں امیر المومنین! کوئی شخص بھی اسے گوارا نہیں کر سکتا۔"

ہادی بولا۔ "پھر کیا بات ہے کہ لوگ میری ماں کے دروازے پر پہنچتے ہیں اور پھر اس کی باتوں اور کاموں کے متعلق چرچا کرنے لگتے ہیں؟"

لوگ خاموش ہو گئے اور سمجھ گئے، خلیفہ کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے خیزران کے ہاں جانے سے توبہ کر لی۔

خیزران کو یہ معلوم ہوا تو اسے بے حد صدمہ ہوا۔ اس نے بیٹے سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی اور قسم کھائی کہ اب اس سے زندگی بھر بات نہیں کرے گی۔

آل برمک کی خواتین رے میں قیام کے دوران خیزران کے بے حد قریب رہی تھیں۔ انہوں نے ماں بیٹے کی اس لڑائی میں خیزران کا بھرپور ساتھ دیا۔

یحییٰ برمکی نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ

اٹھایا اور خیزران کو باور کرا دیا کہ ہادی نے نہ صرف اپنے باپ کو زہر دے کر ہلاک کروایا ہے بلکہ اب وہ خیزران اور خود اس کے علاوہ ہارون کی جان کے درپے بھی ہے۔

ہادی نے پلاؤ پکوا کر خیزران کو بھیجا اور قاصد کے ہاتھ کہلوایا کہ "خلیفہ کو یہ بے حد پسند آیا ہے ان کی خواہش ہے کہ آپ بھی اسے نوش فرمائیں۔"

خیزران نے تحفہ لے لیا لیکن اس سے پہلے کہ اسے کھاتی' خالصہ نامی ایک لونڈی نے اسے روک دیا۔

"ٹھہریے! سیدہ! ابھی نہ کھائیے' ذرا دیکھیے تو سہی' ایسا نہ ہو کہ اس میں آپ کو نقصان پہنچانے والی کوئی شے ہو۔"

بات خیزران کے دل کو لگی۔ چنانچہ اس کے حکم سے ایک کتا لایا گیا اور چاول اس کے سامنے ڈال دیے گئے۔ کہتے ہیں کہ کتے نے جیسے ہی چاولوں میں منہ ڈالا اس کی کھال گل کر گر پڑی اور وہ وہیں مر گیا۔

کئی مؤرخین اس واقعے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے بقول مسلمانوں کے سب سے بڑے اور عالی جاہ خلیفہ کی جانب سے اپنی ماں کے لیے چاولوں کا تحفہ بھیجا جانا قرین قیاس نہیں کیونکہ اس طرح کے پکوان فقیروں اور حاجت مندوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔

یہ کسی تیسرے فریق کی چال تھی تاکہ ماں بیٹا ایک دوسرے سے مزید دور ہو جائیں۔ خادمہ کی جانب سے اچانک اندیشے کا اظہار اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا۔ ورنہ ہادی کے لیے بطور خلیفہ یہ مشکل نہ تھا کہ وہ خاموشی سے خیزران کو راستے سے ہٹا دیتا۔

اچانک ہادی بیمار ہو گیا اس کی خبر سن کر خیزران نے جیل میں یحییٰ کو پیغام بھیجا کہ۔

"وہ شخص اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ وہ قطعاً ہلاک ہو جائے گا۔ تم ضروری اقدامات کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

علالت کے تین دن بعد ہادی اچانک وفات پا گیا۔

خیزران نے اس کی اطلاع یحییٰ کو بھجوائی جس نے پیغام دینے کے علاوہ خود دروازہ کھول کر یحییٰ کو رہا کیا۔ یحییٰ جیل سے سیدھا قصر ابیض پہنچا تاکہ خبر کی تصدیق ہو سکے۔ مؤرخین کے مطابق ہادی کی علالت سے لے کر وفات تک وہ پہلا شخص تھا جس نے قصر میں قدم رکھا۔

مورخین اس پر متفق ہیں کہ ہادی کی موت دم گھٹ کر ہوئی اور خیزران کے اشارے سے ہوئی۔

خیزران بعض ہاشمی عورتوں سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی تو اس کی کنیز خالصہ حاضر ہوئی اور کہنے لگی "یا سیدہ! موسیٰ (ہادی) کا انتقال ہو گیا۔"

خیزران نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"تو کیا ہوا؟ ہارون تو زندہ ہے!"

پھر اس نے ستو خود بھی پیا اور وہاں موجود خواتین کو بھی پلوایا۔ خزانے سے ایک بڑی رقم نکلوائی اور ان عورتوں کو تقسیم کر دی۔ گویا یہ ایک خوش خبری تھی جس کا انعام بانٹا جا رہا تھا۔

بہر طور ہارون الرشید کے خلیفہ بننے 786ء کے بعد خیزران کی پرانی حیثیت اور کھوئے ہوئے اختیارات پھر سے بحال ہو گئے۔ معاملات عوام اور امورِ مملکت میں اس کی دخل اندازی اسی طرح شروع ہو گئی جیسے کبھی شوہر کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔

یحییٰ اچھی طرح جانتا تھا کہ خیزران کو دولت جمع کرنے کی عادت ہے۔ اس لیے بغیر حساب کتاب وہ اس کی ہر خواہش پوری کرتا رہتا تھا۔ اس نے اس کے لیے بہت سے گاؤں' باغات اور جاگیریں خرید کر نذر کر دی تھیں اور یہ چیزیں پا کر وہ بے حد خوش ہوتی تھی۔ اس کی جائیداد بہت زیادہ تھی' بعض مؤرخین نے اس کی قیمت کا اندازہ مملکت کی سالانہ آمدنی کا پانچ گنا لگایا ہے لیکن اس بار خیزران کی "حکمرانی" کا دور کچھ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ ہارون کی خلافت کے صرف تین سال بعد وہ انتقال کر گئی' وفات کے وقت خیزران کی عمر لگ بھگ 50 سال تھی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کیری قیمہ

ضروری اجزاء:

گائے / بکری کا قیمہ (بغیر چربی ہاتھ کا کٹا ہوا)	آدھا کلو
کیری (آملیٹ کی پیاز کی طرح کٹی ہوئی)	تین عدد
پیاز (آملیٹ کی طرح کٹی ہوئی)	تین عدد
لال مرچ	کھانے کا آدھا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
کلونجی	چائے کا آدھا چمچہ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی (باریک کٹا ہوا)
تیل	آدھی پیالی
ہری مرچ	چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
ہلدی	چائے کا ایک چمچہ
ادرک لہسن پسا ہوا	کھانے کا ایک چمچہ
ادرک (باریک کٹی ہوئی)	کھانے کا ایک چمچہ
پودینہ	ایک گٹھی (باریک کٹا ہوا)
کڑھی پتہ	چند پتے

ترکیب:

ایک پتیلی میں قیمہ' ادرک' لہسن' نمک اور مرچ ڈال کر بغیر پانی کے ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ جب قیمے کا پانی سوکھ جائے تو تیل' کیری' پیاز' کڑھی پتہ اور کلونجی ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ جب قیمہ بھن جائے تو ادرک' ہری مرچ پودینہ' ہرا دھنیا ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ گرم گرم پراٹھے' نان یا سادے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

کیری کا شربت

ضروری اجزا:

کیری	ایک کلو
لیموں	چار عدد
پانی	سات سے آٹھ گلاس

چینی	ایک کلو
کالا نمک	چٹکی بھر
پودینے کے چند پتے	

ترکیب :

کیریاں چھیل کر ایک اسٹیل کی یا طعام چینی کی پتیلی میں پانی کے ساتھ اچھی طرح ابال لیں۔ جب کیریاں گل جائیں تو اتار کر ٹھنڈا کریں۔ اسی پانی میں کیریوں کا گودا بنالیں۔ اندر کی گٹھلی نکال دیں۔ پھر بلینڈر میں ڈال کر پیس لیں۔ یہ بلینڈ کیا ہوا شربت پھر سے پتیلی میں ڈالیں۔ ساتھ میں چینی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب چینی گھل جائے تو شربت تیار ہے۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو لیموں کا رس ڈال دیں۔ کالا نمک چھڑک دیں، بالکل ٹھنڈا ہو جائے تو بوتل میں ڈال کر فریج میں رکھ لیں۔ جب پیش کرنا ہو تو گلاس میں کھانے کے دو چمچے شربت ڈال کر پانی ڈالیں۔ تھوڑا سا برف اور چند پتے پودینے کے سجا کر پیش کریں۔

کیری دوپیازہ

ضروری اجزا :

بکری کا گوشت	آدھا کلو
(مرغی میں بھی پکایا جاسکتا ہے)	
کیری	دو عدد
(چھیل کر لمبائی میں باریک کاٹ لیں)	
پیاز	آدھا کلو
ہلدی پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
ہری مرچ ثابت	چار عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی باریک کٹا ہوا
تیل	ایک پیالی
لال مرچ پاؤڈر	کھانے کا ایک چمچہ
ادرک لہسن پسا ہوا	کھانے کا ایک چمچہ
کڑھی پتہ	چند پتے
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب :

اوپر دیے گئے سارے اجزاء ایک پتیلی میں بغیر پانی کے ہلکی آنچ میں پکنے رکھ دیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو بھون کر اتار لیں۔ پیاز کے پانی میں گوشت گل جائے گا۔ ہرا دھنیا اوپر سے ڈال دیں۔ گرم گرم سادے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

کیری کی میٹھی چٹنی

ضروری اجزا :

کیری	آدھا کلو
(چھیل کر بالکل باریک کاٹ لیں یا کدوکش کرلیں)	
گڑ/چینی	ڈیڑھ پیالی
کشمش	پندرہ عدد
(گرم پانی میں بھگو دیں)	
ادرک	کھانے کا ڈیڑھ چمچہ
(لمبی باریک کٹی ہوئی)	
نمک	حسبِ ذائقہ
سفید سرکہ	آدھی پیالی
کلونجی	چائے کا ایک چمچہ
لال مرچ ثابت	دس عدد
لیموں	دو عدد

ترکیب :

ایک اسٹیل کی پتیلی میں سوائے لیموں کے باقی تمام مسالاجات ایک ساتھ ڈال کر لکڑی کے چمچے کے ساتھ ہلکی آنچ میں پکالیں۔ جب چینی یا گڑ کا شیرا بن جائے تو اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ جب یہ ٹھنڈا ہو جائے تو لیموں کا رس ڈال دیں۔ مرتبان میں رکھ لیں۔ لیموں سے چٹنی محفوظ ہو جاتی ہے۔

*

سرورق کی شخصیت

ماڈل ——— جیا
میک اپ ——— روز بیوٹی پارلر
فوٹو ——— موسیٰ رضا

تربوز کے خواص اور فائدے

اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انسان کے لیے خوراک بھی موسموں کی مناسبت سے پیدا کی ہے، تاکہ انسان موسموں کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

تربوز کا شمار بھی ایسے ہی پھلوں میں ہوتا ہے جو کہ نہ صرف انسان کو اندرونی گرمی کی شدت و حدت سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ اور بھی بیش بہا فوائد اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ اگر اسے خدا کی جانب سے انسانوں کے لیے موسم گرما کا تحفہ کہا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ اس کا مزاج سرد و تر ہوتا ہے۔ اسے اگر شکر کے ہمراہ ملا کر کھایا جائے تو زیادہ مفید ہے۔ یہ پھل صفراء کے مرض کو دور کرتا ہے اور سدوں کو کھولنے والا، زیادہ پیشاب آور اور سکون و فرحت بخشنے والا پھل ہے۔ اس کے کھانے سے پیاس کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ تربوز گردے اور مثانے کی پتھری کو کاٹ کر ریزہ ریزہ کر دیتا ہے اور غیر محسوس انداز میں جسم سے خارج کرتا ہے۔ کھانا کھا کر ہضم ہونے سے قبل کھانے سے ہاضمہ میں فساد پیدا کرتا ہے اور نہار کھانا بھی مضر ہے۔ اس کا پانی گرم مزاج والوں کو فرحت دیتا ہے۔ مگر نفاخ اور دیر ہضم ہے۔ جس روز تربوز کھائیں چاول ہرگز نہ کھائیں۔ گرم دوائیں کھانے اور گرم چیزوں کے استعمال سے نقصان پہنچے تو تربوز کھانے سے اصلاح ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے اور جدید زمانے کے طبیب اس بات پر متفق ہیں کہ اسے کھانے کے فوری بعد نہ استعمال کیا جائے۔ اس صورت میں یہ فائدہ کے بجائے نقصان دیتا ہے "خصوصاً" اس کا استعمال سے ہیضہ کی شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسے کھانے سے دو گھنٹے قبل یا پھر بعد میں کھانا مفید [illegible]ت کا حامل ہوتا ہے۔

اس پھل کے کھانے سے اسی فیصد لوگوں کے دل پر موجود بوجھ کم ہوا ہے، یہ بدن کو فربہ کرتا ہے۔ جبکہ تربوز میں موجود، یک خاص قسم کا جز گلٹ اوتھین ہوتا ہے۔ جو کہ سرطان کے جراثیموں کو بے بس کر دیتا ہے اور شفا بخشتا ہے۔

تربوز کے کثرت سے استعمال سے جوڑوں کے درد اور بلغم کے ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے متوازن مقدار میں ہی کھانا چاہیے۔ تربوز کھانے کے بعد پانی، سکنجبین یا کوئی اور شربت یا چائے نہیں استعمال کرنا چاہیے۔

مشہور صوفی شاعر اور بزرگ امیر خسرو نے اس

پھل کے متعلق ایک پہیلی کہی ہے۔

ایک زمرد کا ہے گھر
نیو زمین میں آپ لو ہر
خون کی ایک ندی اس میں جاری
گورے کالوں کی فوج بھاری

تربوز کو زمرودانہ بھی کہتے ہیں' دلی میں رواج تھا گاؤں والیاں میٹھے شہد جیسے تربوز لاتی تھیں' وہ پردہ دار گھروں میں دیتی اور کہتیں۔ گودا آپ کھالیں اور بیج سنبھال کر رکھ دیں۔ یہ امانت ہے' ہم تین' چار روز بعد آئیں گے اور یہ امانت آپ سے لے جائیں گے۔ گھر والی خواتین ان بیجوں کو "امانتا" رکھتیں اور جب وہ آتیں تو ان کے حوالے کردیتیں' وہ ان سے دوبارہ یہ پھل کاشت کیا کرتی تھیں۔

سر درد کے لیے

گرمی کی شدت سے اگر سر درد شروع ہوجائے تو ایک بڑا گلاس تربوز لیں' اس میں حسب ذائقہ مصری ملالیے' روزانہ صبح کے وقت مریض کو پلادیا کریں' چھ' سات دن میں سر درد کے محرکات ختم ہوجائیں گے۔ اسی طرح تازہ تربوز کے بیج نکال کر انہیں باریک پیس کر ان کا لیپ پیشانی پر لگالیجیے' اس سے بھی سر درد دور ہوجاتا ہے۔

وہم کے لیے

کچھ لوگ طرح طرح کے وہم میں مبتلا رہتے ہیں' انہیں اٹھتے بیٹھتے وسوسے آتے رہتے ہیں' اکثر ان کی نیند اڑ جاتی ہے۔ جنون کی سی کیفیت بھی طاری رہتی ہے۔ ایسے میں ایک گلاس تربوز کے تازہ گودے کا پانی لیجیے' اس میں دو چمچے مصری شامل کریں۔ اس پانی کو کسی بوتل میں بھر کر کھلے آسمان کے نیچے رکھ دیں۔ یہ عمل شروع چاند میں کیجیے۔ اس بوتل میں سے روزانہ ایک گلاس صبح نہار منہ پی لیں اور نیا پانی اس میں اور شامل کردیں۔ یہ عمل کم از کم اکیس دن تک جاری رہنا چاہیے' اس سے مریض کے ذہن کو طاقت ملے گی اور اس کے سوچنے کا انداز خود بخود مثبت ہوتا چلا جائے گا۔ سو ہم کا مرض دور ہوجائے گا۔

دل کی بے قابو دھڑکن کے لیے

اس مرض کو عرف عام میں ضعف قلب کہا جاتا ہے' اس میں دل بری طرح گھبراتا ہے' دھڑکن تیز ہوجاتی ہے' چکر آتے ہیں اور سر میں درد رہتا ہے' اکثر خواتین کو متلی کی شکایت ہوجاتی ہے۔ ایسے میں تربوز کا استعمال بے حد مفید ہوتا ہے۔ تربوز کا رس نکال کر اس میں ایک لیموں نچوڑ کر بطور سکنجبین پینا بھی اس مرض کو افاقہ بخشتا ہے۔

طبیعت کی بے چینی کے لیے

بے چینی اور شدت پیشاب کی صورت میں ایک یا دو گلاس تربوز کا پانی پی لینا مفید ہوتا ہے' اگر اس میں تھوڑی سی شکر کی بھی آمیزش کردی جائے تو اس کے اثرات بڑھ جاتے ہیں اور ذائقہ بھی عمدہ لگتا ہے۔

ہونٹوں کے پھٹنے کے لیے

کچھ خواتین کی جلد بے حد نازک ہوتی ہے' موسم کی تمازت سے ان کے ہونٹ پھٹ جاتے ہیں اور اکثر خون بھی نکلنے لگتا ہے۔ یہ مرحلہ بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر تربوز کے بیجوں کو کوٹ کر انہیں تھوڑے سے پانی میں ملاکر ہونٹوں پر لیپ کیا جائے تو جلد آرام ہوتا ہے' یہ دوا رات کو سوتے وقت لگانا چاہیے۔ اسی طرح گرمی کے بخار میں تربوز کا رس پینے سے سکون ملتا ہے' دن میں بطور دوا دو' تین بار تربوز کھانا چاہیے۔

ہاضمہ کے لیے

غذا کے ہضم ہونے میں خرابی پیدا ہوجائے تو اس نسخہ کو آزمایے۔ سیاہ مرچ' سفید زیرہ اور نمک ہم وزن لے کر باہم پیس کر ملالیں' تازہ تربوز کاٹیں اور اس پر یہ مسالا چھڑک کر کھایے' اس سے آپ کا ہاضمہ درست ہوگا اور غذا وقت مقررہ پر ہضم ہوگی۔ اگر اس کے بعد تھوڑا سا نمک بھی چاٹ لیا جائے تو یہ اکسیر ثابت ہوگا۔